صحرا کی آگ



اسلم راہی ایم۔اے

انتساب

صحرائے اعظم کے نام

جس کا ذرّہ ذرّہ

آج بھی

مصوّرِ فطرت کی طرح مسلمانوں کی غیر مغلوب شجاعت

اور غیر مفتوح جذبوں کا

امین اور محافظ

ہے

اسلم راہی ایم اے

★



وسطِ سرما کی وہ ایک کہر آلود اور ملگجی شام تھی۔ دھوپ کوہستانوں کی چوٹیوں سے غائب ہونے لگی تھی۔ سورج دُور مغرب کے دُھندلکوں میں غروب ہو رہا تھا اور اندھیروں نے زمین پر اپنا آنچل پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ چاروں طرف خاموشی اور ہُو کا عالم تھا۔ ایسے میں کوہستان سینا[1] کی سیاہ چٹانوں کے اندر خاموشی کا شیشہ توڑتی ہوئی ایک آواز اُبھری۔ کوئی عرب گا رہا تھا اور اس کی رسیلی آواز نے کوہستانوں کے اندر ایک افسونی کیفیت اور طلسماتی تاثر پیدا کر دیا تھا۔

---

[1] یہ وہی پہاڑ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر تجلّی الٰہی کی وجہ سے مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں میں یکساں معروف ہے۔ خلیج سویز اور خلیج عقبہ کے درمیان یہ ایک طویل سلسلۂ کوہ ہے۔ مغرب کی طرف یہ خلیج سویز کے ذریعے مصر اور مشرق میں خلیج عقبہ کے ذریعے بلادِ عرب سے الگ ہوتا ہے۔ شمالی حصّہ کم بلند اور ریگستانی

پہاڑوں کے درمیان کسی عرب کی اُبھرنے والی وہ آواز جو دل آویز اور بلیغ بھی تھی، صدائے سحر، لحنِ داؤدی، جادوئے بابل اور سحرِ سامری کی طرح کائنات کی سانسوں میں ڈھل رہی تھی۔

پھر نشیب کی طرف سے چٹانوں پر چڑھتا ہوا ایک تیرہ چودہ برس کا لڑکا نمودار ہُوا۔ اس کی پیٹھ پر تیروں سے بھرا ہُوا ترکش اور اس کے کندھے پر کمان لٹک رہی تھی۔ اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھتا ہُوا وہ بھاگ کر ایک چٹان پر چڑھنے لگا تھا۔ اور گانا اس نے بند کر دیا تھا۔

تھوڑا سا اُوپر جا کر اُس نے پھر گانا شروع کیا۔ اب اس کا گیت صاف سنائی دے رہا تھا۔ وہ دھیمی دھیمی حدی کی آواز اور بے خواب راتوں میں سنہری گھنٹیوں جیسی آواز میں گا رہا تھا۔

مَا اَجمَلُ الضِّیَا

روشنی کیسی خوب صورت ہے

مَا اَحسَنُ الحَیَا

حیا کیسی نفیس ہے

وہ لڑکا ایک جگہ کھڑا ہو کر یوں گاتا رہا جیسے طائرِ خوش الحان حق حق پکارتے ہیں جیسے ـــــ جیسے سفیرِ حق نرغہ باطل میں درسِ آدمیت دیتے ہیں۔ لڑکا آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک خاموش ہو گیا اور دوبارہ بڑی تیزی سے پہاڑ کے اُوپر چڑھنے لگا۔ اتنے میں نشیب کی طرف سے درمیانی عمر کا ایک عرب نمودار ہوا۔ اس نے اپنے دائیں بائیں ہاتھوں سے دو لڑکوں کی کلائیاں پکڑ رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک بارہ اور دوسرا دس برس کا ہو گا۔ پھر اس عرب نے پہاڑ پر چڑھنے والے اور ویرانوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۹) ہے۔ جنوبی حصّہ خوب بلند اور سرسبز ہے اور بعض چوٹیاں نو ہزار فٹ بلند ہیں۔ یہ پہاڑ جبلِ موسیٰ بھی کہلاتا ہے۔

میں اپنی کھنکتی آواز کا جادو بکھیرنے والے لڑکے کو زور زور سے پکارتے ہوئے کہا۔

"احمد! احمد! نیچے آجاؤ میرے بیٹے! سورج غروب ہو گیا ہے۔ اندھیرا پھیلنے لگا ہے اس وقت کوئی شکار نہ ملے گا۔"

لڑکے نے زور سے چلّاتے ہوئے کہا۔ "آسمان کی طرف دیکھو بابا! ہمارا شکار آگیا ہے۔" اس عرب نے جب نگاہیں اٹھائیں تو اس نے دیکھا ان گنت راج ہنس بحیرہ قلزم کے ساحل پر وادیٔ طوٰی[1] میں اُترنے کے لیے شمال کی طرف سے نیچی پرواز کرتے آ رہے تھے ـــــ

جب وہ راج ہنس پہاڑ پر کھڑے اس لڑکے کے سر سے گزرنے لگے جس کا نام احمد پکارا گیا تھا تو وہ بجلی کے کوندے کی طرح حرکت میں آیا اور لگاتار آگے پیچھے تین تیر چلا دیئے تھے۔ اس کا ایک تیر بھی خطا نہ گیا اور تین بڑے بڑے راج ہنس فضا کے اندر پلٹیاں کھاتے ہوئے پہاڑ کے اُوپر گر گئے تھے۔ لڑکا فوراً اپنا خنجر نکال کر انہیں ذبح کرنے لگا تھا۔

نیچے کھڑے دونوں لڑکوں نے اپنے باپ سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور بھاگ کر پہاڑ کے اُوپر چڑھنے لگے جہاں اُن دونوں کا بڑا بھائی اپنے خنجر سے راج ہنس ذبح کر رہا تھا۔ ان کا باپ بھی ان کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہُوا اُوپر جا رہا تھا۔

ان تینوں کے اوپر جانے تک احمد نے تینوں راج ہنس ذبح کر دیئے تھے۔

جب وہ اپنا خنجر خشک گھاس سے صاف کرنے کے بعد نیام میں کر رہا تھا تو اس کا باپ حشم بن بکر اور دونوں بھائی جن میں سے بڑے کا نام شیبان اور چھوٹے کا نام خصیب تھا کوہستان کے اُوپر آ گئے تھے۔ حشم بن بکر آگے بڑھا اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر اس نے احمد کو اپنی چھاتی سے لگاتے ہوئے کہا۔ "اے میرے فرزند! تو کیسا خوش بخت ہے۔

[1] جبلِ موسیٰ کے پاس یہ وہی وادی ہے جہاں فرعون کے پاس بھیجنے سے قبل اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہُوا تھا۔ اس وادی میں جہاں ریت کے ٹیلے ہیں وہاں کھجور کے بڑے بڑے نخلستان بھی ہیں۔

جبلِ موسیٰ کے اس دشت اور دیولاخ میں جہاں شکار کی کوئی اُمید نہ تھی تم نے تین راج ہنس شکار کر ڈالے ہیں۔ تیرا نشانہ یقیناً بے خطا ہے۔ اے فرزندِ دلبند! میرا دل کہتا ہے۔ میری زندگی ہیں وہ وقت ضرور آئے گا جب میں تجھے کسی لشکر کا سالار یا اپنے قبیلے بنو کندہ کا سردار بنتے دیکھوں گا۔ خدا تجھے آسمان کے ستاروں کی مانند روشن و تابناک، سحر کی گود جیسا پُرسکون اور مضبوط و تناور درختوں جیسا کڑا اور سخت جان بنائے۔"

پھر اس نے احمد کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ "آؤ اب لوٹ چلیں"۔ دو راج ہنس حشم نے خود پکڑ لیے تیسرا احمد نے اُٹھا لیا۔ چھوٹے دونوں بھائی اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ اس طرح وہ جبلِ موسیٰ سے اُتر کر وادیٔ شعیب کی طرف جا رہے تھے۔

جہاں جبلِ موسیٰ اور وادیٔ شعیب آپس میں ملتے ہیں وہاں ان چاروں نے ایک چشمے پر بیٹھ کر وضو کیا اور وہیں اُنہوں نے مغرب کی نماز پڑھ لی۔ امامت کے فرائض حشم بن بکر نے ادا کیے تھے۔ زمین پر اب رات برسنے لگی تھی۔ فضاؤں میں سیاہی گھل گئی تھی۔ جبلِ سینا کے طویل سلسلے کی سیاہ چٹانیں تاریکی میں اور زیادہ بھیانک ہو گئی تھیں۔ ہوا تیز ہو گئی تھی اور سردی کا زور بڑھ گیا تھا۔

نماز سے فارغ ہو کر وہ چاروں وادی شعیب میں آگے بڑھنے لگے وہ تھوڑا سا ہی آگے بڑھے تھے کہ وادی کے اندر چاروں طرف آگ کے روشن الاؤ دکھائی دینے لگے اور دُور دُور تک خیمے نصب تھے جن کے اندر اور باہر اَن گنت لوگوں کا شور اُٹھ رہا تھا اصل میں یہ عربوں کے قبیلہ بنو کندہ کا ایک قافلہ تھا جو مصر میں دریائے نیل کے کنارے منف شہر کے پاس آباد ہونے کے لیے یمن کی طرف سے ہجرت کر کے آ رہا تھا۔ بنو کندہ کا ایک حصّہ پہلے ہی منف شہر کے پاس جا کر آباد ہو چکا تھا اور اب یہ دوسرا حصّہ تھا جو اپنے پہلے حصّے سے ملنے کے لیے دریائے نیل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ چاروں باپ بیٹے بھی خیموں کے اس شہر میں داخل ہوئے۔ لوگ جگہ جگہ آگ کے الاؤ جلا کر بیٹھے تھے اور اپنے آپ کو گرم رکھنے کے علاوہ ان کی عورتیں اسی آگ پر اپنے اپنے خاندان کا کھانا بھی تیار کر رہی تھیں۔ وہ چاروں بھی چند خیموں سے باہر ایک الاؤ کے

پاس رُک گئے۔ اس الاؤ کے گرد ایک مرد ایک عورت اور ایک بچّی بیٹھی تھی اور تینوں مِل کر لوہے کے ایک بھدّے سے توے پر جَو کی روٹیاں پکا رہے تھے۔

عورت اِن تینوں لڑکوں کی ماں اور حشم بن بکر کی بیوی امیصا تھی، مرد امیصا کا بھائی اور ان تینوں لڑکوں کا ماموں ہرثم بن لیث تھا۔ بچّی جس کا نام طروب تھا وہ ہرثم کی بیٹی اور احمد کی منصوبہ تھی۔

ہرثم بن لیث قبیلے کا سردار تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ اولاد میں صرف ایک بیٹی تھی جس کے ساتھ وہ اپنی بہن کے پاس ہی رہتا تھا۔ اپنے بیٹوں کو دیکھتے ہی امیصا نے بڑی شفقت اور پیار سے کہا۔ "سردی زیادہ ہو گئی ہے میرے بچو! اِدھر میرے قریب آگ کے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔"

شیبان اور خصیب بھاگ کر اپنی ماں کے دائیں بائیں بیٹھ گئے تھے۔ احمد نے ہاتھ میں پکڑا ہوا راج ہنس آگ کے پاس رکھ دیا اور اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اے میرے باپ! آؤ ان پرندوں کو صاف کر کے انہیں بھون لیں"۔

امیصا نے ڈانٹ دینے کے انداز میں احمد سے کہا۔ "احمد! احمد! تُم نے سُنا نہیں مَیں نے کیا کہا ہے۔ سردی بڑھ گئی ہے۔ تم آگ کے پاس آرام سے بیٹھ جاؤ۔ مَیں پرندے صاف کر لیتی ہوں"۔

احمد نے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے آداب اور ارادتمندی کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اے میری شفیق ماں! مَیں اب بچہ نہیں ہوں۔ تیرا مضبوط اور قابلِ اعتماد سہارا ہوں، کیا یہ امر میرے لیے باعثِ شرم و عیب نہیں کہ مَیں آگ کے پاس آرام سے بیٹھوں اور میری ماں کام کرتی رہے"۔

امیصا نہایت پیار اور احسانمندی سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے خاموش رہی اتنے میں اس کے شوہر حشم بن بکر نے اسے اور اس کے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں بہن بھائی نے یہ تو پوچھا ہی نہیں یہ پرندے کس نے شکار کیے ہیں"۔ امیصا نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "کس نے شکار کیے ہیں"۔ حشم بن بکر نے آگے بڑھ کر احمد کے سر پر پیار

سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے بیٹے احمد نے اور یہ انکشاف تمہارے لیے حیرت افزا ہو گا کہ میرے بیٹے نے اِن تین پرندوں کو اپنے صرف تین تیروں سے شکار کیا۔ اس کا ایک نشانہ بھی خطا نہ گیا۔ میرا دِل کہتا ہے ایک روز میرا یہ بیٹا کسی لشکر کا سالار یا کم از کم بنو کنانہ کا سردار ضرور بنے گا۔"

احمد کے ماموں ہرثم بن لیث نے بلند آواز میں کہا۔ "انشاء اللہ! میرا بیٹا کسی لشکر کا سالار ضرور بنے گا۔" امیصا کو ان باتوں سے اس قدر خوشی ہوئی کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور والہانہ انداز میں اس نے احمد کا چہرہ، آنکھیں اور پیشانی چومتے ہوئے اسے پکڑ کر اپنے ساتھ آگ کے پاس بٹھا لیا۔ حشم اور ہرثم دونوں مِل کر تینوں پرندوں کو صاف کر کے بھوننے لگے تھے۔



جب وہ کھانا کھا چکے تو کارواں میں عشاء کی اذان سُنائی دی۔ احمد اٹھا اور بھاگ کر پانی کا کوزہ بھر لایا اور اپنے باپ حشم بن بکر کا وضو کرانے لگا۔ جب حشم پاؤں دھونے لگا تو احمد جلدی جلدی ایک ہاتھ میں کوزہ پکڑ کر پانی ڈالنے لگا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے باپ کے پاؤں دھونے کے علاوہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں اس کے پاؤں کی انگلیوں میں پھیر کر انہیں صاف کرنے لگا تھا۔ حشم نے اُسے منع نہ کیا تھا۔ شاید یہ احمد کا روزمرہ کا کام تھا۔ اپنے باپ کے بعد اس نے اسی طرح اپنی ماں اور ماموں کا وضو بھی کرایا پھر وہ خود بھی وضو کرنے لگا تھا۔ احمد اپنے باپ اور ماموں کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لیے اس میدان کی طرف چلا گیا جہاں عشاء کی اذان ہوئی تھی۔ شیبان، خصیب اور طروب امیصا کے پاس آگ کے الاؤ کے قریب ہی بیٹھے رہے۔

جب بنو کندہ کے مُسلمان کھُلے میدان میں عشاء کی نماز ادا کر رہے تھے تو صحرا کی تاریکی کے اندر سے اَن گنت سوار نمودار ہوئے وہ سب اپنے چمکتے ہتھیاروں سے مسلح تھے قریب آ کر وہ اپنے اونٹوں سے اُترے آدھے باجماعت نماز ادا کرنے والے بنو کندہ کے مردوں پر حملہ آور ہوئے اور دوسرے آدھے خیموں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اُنہوں نے آن

کی آن میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا تھا۔ وہ طوفانی انداز میں حملہ آور ہوئے، بے شمار لوگوں کو زخمی کرنے کے علاوہ قتل کیا، سب خیموں کو انہوں نے لُوٹ لیا اور قبیلے کے سارے بچّوں کو اُٹھا کر وہ تاریکی میں جس طرف سے آئے تھے اسی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

حشم اور ہرثم ان قزاقوں سے لڑتے ہوئے بُری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ جب وہ قزاق وہاں سے چلے گئے تو وہ دونوں احمد کے متعلق فکرمند ہوئے کیوں کہ احمد جوان کے ساتھ ہی نماز ادا کر رہا تھا غائب تھا۔ دونوں زخمی ہونے کے باوجود دیوانہ وار اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے احمد کو تلاش کر رہے تھے۔ حشم بن بکر زور زور سے پکار رہا تھا۔ "احمد! احمد! کہاں ہو میرے بیٹے!" لیکن اسے کوئی جواب نہ مِلا اور اس کی آواز صحرا کی کراہتی ہواؤں میں رچی سکیوں میں تحلیل ہو کر رہ جاتی تھی۔

نماز پڑھنے والوں میں سے جو بچ گئے تھے وہ اپنے قبیلے کے مرنے والے اور زخمیوں کو سنبھالنے لگے تھے کسی کو اس امر کا ہوش نہ تھا کہ ان قزاقوں کا تعاقب کریں جو ان کے بچے اُٹھا کر اور انہیں لُوٹ کر چلے گئے تھے۔ جن بچوں کو وہ اُٹھا کر لے گئے تھے۔ ان میں احمد بھی شامل تھا۔

حشم بن بکر احمد کو پکارتا ہوا خیموں کی طرف بھاگا۔ ہرثم اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ جب وہ اپنے خیموں کے پاس آئے تو اُنہوں نے دیکھا ان کا الاؤ اسی طرح روشن تھا اور ان کے دونوں خیمے خالی پڑے تھے۔ حشم بن بکر نے روتے لہجے میں پھر پکارتے ہوئے کہا۔ "احمد! احمد! میرے بچّے تم کہاں ہو؟" جب اُسے کوئی جواب نہ مِلا تو حشم اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور سرد ویران رات میں اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ "آہ! میرے فرزند! تو کہاں ہے؟ تیرے بغیر میں کیسے زندہ رہ سکوں گا۔"

ہرثم نے فکرمند آواز میں حشم سے کہا۔ "حشم! حشم! امیصا اور دوسرے بچّے کہاں ہیں؟ ان کی بھی تو فکر کرو۔" حشم چونک کر کھڑا ہو گیا اور خیمے میں داخل ہوتے ہوئے وہ بلند آواز میں پکارنے لگا۔ "امیصا! امیصا! تم کہاں ہو؟" خیمے کے ایک کونے میں توشک لحاف اور بستروں کا جو ڈھیر پڑا تھا اس میں اچانک حرکت ہوئی پھر حشم اور ہرثم کے دیکھتے

ہی دیکھتے امیصا، شیبان، خصیب اور طروب کے ساتھ باہر نکل آئی۔

حشم نے کسی قدر پُرسکون ہو کر کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔" امیصا نے شیبان، خصیب اور طروب کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔ "کچھ لوگ اچانک ہمارے خیموں پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ مَیں نے دیکھا وہ بچّوں کو اُٹھا کر بھی لے جا رہے تھے۔ لہٰذا مَیں تینوں بچّوں کے ساتھ بستروں کے نیچے چُھپ گئی تھی۔" پھر امیصا قریب ہوئی اور چونکتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں تو زخمی ہو۔ اِدھر بیٹھو مَیں تم دونوں کی مرہم پٹی کرتی ہوں" پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کسی قدر حیرانی اور پریشانی میں پوچھا۔ "احمد کہاں ہے؟"

حشم نے مجروح اور زخمی سی آواز میں کہا۔ "ہم نماز پڑھ رہے تھے کہ حملہ آور ہم پر ٹوٹ پڑے، اس موقع پر ایک افراتفری مچ گئی تھی اور احمد ہم سے بچھڑ گیا۔ ہم دونوں نے زخمی ہونے کے باوجود اسے بہت تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملا۔" امیصا کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی اور ٹوٹتی بکھرتی آواز میں اس نے کہا۔ "آہ! میرا بیٹا! میرا بچّہ! مَیں اپنے اس چاند کو کہاں تلاش کروں گی۔" اس کے ساتھ ہی امیصا چکرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

ہرثم نے گھبرا کر کہا۔ "حشم! حشم! تم امیصا کو سنبھالو! مَیں قبیلے کے خیموں میں چکّر لگا کر آتا ہوں۔ مَیں کسی کو بھیجتا ہوں جو تمہارے زخموں کی مرہم پٹی کر دے۔ مَیں قبیلے کا سردار ہوں اور اس حیثیت میں لوگوں کو میری توجہ اور نگرانی کی ضرورت ہے۔"

ہرثم لنگڑاتا ہُوا پیچھے ہٹ گیا۔ امیصا کے بے ہوش ہونے پر شیبان، خصیب اور طروب رونے لگے تھے۔ حشم ان سب کو سنبھالنے لگا تھا۔



وہ رات بنو کنانہ کے قافلے والوں نے انتہائی کرب کی حالت میں گزاری تھی۔ رات بھر وہ اپنے مرنے والوں کو دفن کرنے کے علاوہ زخمیوں کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ امیصا کی حالت انتہائی تشویشناک تھی ہوش میں آنے کے بعد وہ برابر بیٹھی روتی رہی۔ اسے یہ تک ہوش نہ تھا کہ شیبان، خصیب اور طروب اس کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں اور ان تینوں کو اس کی تسلّی اور

ڈھارس کی ضرورت ہے۔ اصل میں وہ احمد کو دیوانگی کی حد تک پیار کرتی تھی۔ ایک تو بڑا بیٹا تھا، پھر انتہائی باادب، ارادتمند، شجاع اور باحوصلہ تھا۔ وہ ایسا بیٹا تھا جو اپنی موجودگی میں اپنے ماں باپ اور ماموں کو کوئی کام نہ کرنے دیتا تھا۔ ہرثم اور حشم کے سمجھانے اور تسلّی دینے پر امیصا کچھ سنبھلی اور صبح کا کھانا تیار کرنے لگی تھی۔

حشم اور ہرثم نے آپس میں کوئی صلاح مشورہ کیا اور کھانے کے بعد وہ دونوں اپنے گھوڑوں پر زینیں کسنے لگے تھے۔ امیصا نے ان دونوں کی طرف تشویش سے دیکھتے ہوئے پوچھا "اب اس وقت تم دونوں کہاں جا رہے ہو؟" حشم نے اپنے گھوڑے کو اس کے قریب لاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے قبیلے کے جس قدر بچّے اُٹھائے گئے ہیں اگر ان میں سے کوئی ان بردہ فروشوں کے چُنگل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ ضرور اسی وادی میں واپس آئے گا کیوں کہ بچّوں میں سے کوئی بھی مصر کے اس شہر سے واقف نہیں جس کی طرف ہم کُوچ کر رہے ہیں۔ وہ دیکھو سامنے پہاڑ کے اُوپر کیتھرین کی خانقاہ ہے ہم دونوں اس خانقاہ کی طرف جا رہے ہیں اور وہاں رہنے والے راہبوں سے کہیں گے کہ اگر اس وادی میں ہمارے قبیلے کا کوئی بچّہ داخل ہو تو اُسے ہماری طرف بھیج دیں۔ اس طرح ہم دوسرے بچّوں کا سُراغ لگانے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔"

امیصا خاموش رہی، حشم اور ہرثم اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر وادیِ شعیب[1] میں سرپٹ دوڑا رہے تھے۔

---

[1] یہ وہی وادی ہے جس میں حضرت شعیب علیہ السلام اہلِ مدین کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے۔ اسی وادی میں فرعونِ مصر کے خوف سے بھاگ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے اور حضرت شعیبؑ کی بیٹی صفورا سے آپؑ کی شادی ہوئی۔ دوبارہ مصر جانے کے لیے جب حضرت موسیٰؑ وادیِ شعیب سے وادیِ طویٰ میں آئے تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ سے ہم کلام ہوتے ہوئے [illegible] کے پاس جانے کا حکم دیا۔ جیسا کہ قرآن [illegible] کے رب نے [illegible]

اپنے گھوڑوں کو ایڑ پر ایڑ لگاتے ہوئے حشم اور ہرثم جبلِ موسیٰ پر چڑھے اور کیتھرینؑ کی خانقاہ کے سامنے وہ گھوڑوں سے اتر گئے۔ کوہستانِ سینا کے اوپر وہ ایک کھلا میدان تھا جس کے اوپر یہ خانقاہ تھی اور خانقاہ کے چاروں طرف انواع و اقسام کی فصلوں کے علاوہ پھل دار درخت اور پودے تھے۔ اس لیے کہ وہاں پانی کا ایک چشمہ تھا جس سے زمین سیراب ہوتی تھی۔ ان دونوں نے اپنے گھوڑوں کو ایک درخت سے باندھ دیا اور خانقاہ کی طرف بڑھے۔ جب وہ قریب گئے تو انہوں نے دیکھا خانقاہ سے باہر کھجور کے پتوں کی ایک بڑی چٹائی پر چند راہب اور راہبائیں بیٹھے صبح کا کھانا کھا رہے تھے۔ ان دونوں نے آگے بڑھ کر سلام کیا جس کا ان راہب راہباؤں نے پرتپاک جواب دیا پھر ایک بزرگ اور بوڑھے راہب نے ان دونوں کو کھانے کی پیش کش کی حشم نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم لوگوں کے پاس ایک التماس اور التجا لے کر آیا ہوں"۔ ایک بزرگ صورت اور ادھیڑ عمر راہب نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اے اجنبی! ہم تارک الدنیا ہیں ہمارے پاس تم کیسی التجا لے کر آئے ہو"۔

حشم نے نیچے وادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں وادی شعیب میں ہمارا ایک قافلہ خیمہ زن ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا تعلق عربوں کے قبیلہ بنو کنانہ سے ہے۔ ہم مصر میں دریائے نیل کے کنارے منف شہر کے پاس آباد ہونے کو جا رہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷) طویٰ سے پکارا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ اس نے بڑی شرارت اختیار کر رکھی ہے۔

۱؎ یہ خانقاہ ۵۴۸ء سے ۵۶۲ء کے درمیان قسطنطنیہ کے بادشاہ جسٹینین اوّل کے حکم پر اس جگہ تعمیر ہوئی جہاں جبلِ موسیٰؑ پر ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں پر ظہور کیا تھا۔ اس خانقاہ کے راہبوں کے پاس ایک خط ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں

ہیں۔ ہمارے قبیلے کا ایک حصہ پہلے ہی وہاں جا کر آباد ہو چکا ہے۔ پچھلی شب یہاں وادی شعیب میں قزاقوں اور بردہ فروشوں کے ایک گروہ نے اس وقت ہم پر شب خون مارا جس وقت ہم عشاء کی نماز ادا کر رہے تھے۔ وہ ہمارا مال و اسباب لوٹ لے جانے کے علاوہ ہمارے ان گنت بچوں کو بھی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ جن بچوں کو وہ لے گئے ہیں انہیں اس شہر کے محلِ وقوع کا علم نہیں جہاں ہم آباد ہونے جا رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی بچہ ان قزاقوں سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ اسی وادی میں آئے گا۔ آپ سے التماس یہ ہے کہ ایسا لڑکا اگر کوئی اس وادی میں داخل ہو تو منف شہر کی طرف اس کی راہنمائی کر دیں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو ایسے بچوں کو آپ اپنے پاس روک رکھیں۔ میں یا میرا کوئی ساتھی وقفے وقفے سے آپ کے پاس آتے رہیں گے۔ اگر کوئی بچہ لوٹ کر آیا تو ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور ایسے بچوں کو یہاں اس خانقاہ میں رکھنے کا ہم آپ کو معقول معاوضہ بھی ادا کریں گے۔ اغوا ہونے والے ان بچوں میں میرا اپنا لختِ جگر بھی ہے۔ اس کا نام احمد ہے۔ میرا اپنا نام حشم بن بکر ہے۔ اور یہ میرا ساتھی میری بیوی کا بھائی اور ہمارے قبیلے کا سردار ہرثم بن لیث ہے۔

اس بوڑھے راہب نے بڑی فراخدلی سے کہا۔ "ہمیں تمہارے قبیلے کے لٹ جانے کا افسوس ہے۔ اگر تمہارے قبیلے کا کوئی بچہ اس وادی میں داخل ہوا تو اسے ضرور اس خانقاہ میں روک لیا جائے گا۔ رہی بات معاوضے کی تو تم بھی ہماری طرح اہلِ کتاب ہو پھر مسلمانوں کے ہم پر اس قدر احسانات ہیں جن کا اظہار تک ہمارے لیے مشکل ہے۔

یہ مسلمانوں کی رواداری اور خیر خواہی ہے کہ ہم اپنی اس خانقاہ میں محفوظ اور پرامن ہیں اور کبھی بھی ہم سے مذہب یا خانقاہ کے متعلق باز پرس نہ کی گئی۔ ہم تم سے کوئی معاوضہ نہ لیں گے۔ تمہارے بچوں کی خدمت ہم اپنا فرض جان کر کریں گے۔ میرا نام تما ہے مجھ پر اعتبار و اعتماد رکھو۔ میری خداوند یسوع مسیح سے دعا ہے کہ وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) عطا فرمایا تھا جس میں خانقاہ کے لوگوں کو امان دی گئی تھی۔

تمہارے بچوں کو حفظ و امان میں رکھے اور جلد انہیں اپنے خویش سے ملائے"۔

حشم نے بوڑھے راہب تما کا شکریہ ادا کیا اور ہر ثم کے ساتھ واپس مڑ گیا۔ دونوں اپنے گھوڑے کھول کر سوار ہوئے اور کوہستان سے اتر کر وہ وادیِ شعیب میں اپنے گھوڑوں کو اپنے خیموں کی طرف سرپٹ دوڑا رہے تھے۔



وہ قزاق اور بردہ فروش جنہوں نے رات کی تاریکی میں نو کنانہ پہ شب خون مار کر انہیں لوٹا اور ان کے بچوں کو اٹھا لیا تھا ان گنت اونٹوں پر سوار تھے اور اپنے اونٹوں کو بری طرح ہانکتے ہوئے وہ بڑی برق رفتاری سے شمال مشرق کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے اونٹوں پر عربوں کے سینکڑوں بچے بٹھا رکھے تھے اور انہیں رسیوں سے باندھ دیا تھا۔

خلیج عقبہ اور کوہستانِ موسےٰ کے بیچوں وبیچ آگے بڑھتے ہوئے انہوں نے ایک چکر کاٹا پھر وہ کوہستان موسےٰ کے شمال مغربی جانب صحرائے سینا میں داخل ہو گئے تھے۔

رات کا کچھ حصہ گزرنے کے بعد چاند طلوع ہو گیا تھا اور دھواں دھول چاندنی صحرائے سینا میں ہر سو بکھر گئی تھی۔ سرمائی تیز و تند ہوائیں خزاں کے طوفان کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ تیز آندھیوں کی اس یورش میں صحرائے سینا میں ریت کے ٹیلے سنورتے نکھرتے اور بکھرتے رہے۔ صحرا میں بھوکے بھیڑیے اور گیدڑ چیختے چلاتے رہے اور اونٹوں پہ بندھے ہوئے عربوں کے خوفزدہ بچوں کا کوئی ہمراز کوئی غمساز نہ تھا۔

راتوں رات یہ قزاق خمسہ شہر کے جنوب سے گزرتے ہوئے مغرب کی طرف بڑھے اور فسطاط شہر کے نیچے کی جانب جہاں دریائے نیل بحیرہ روم میں گرنے سے پہلے کئی حصوں میں بٹ جاتا ہے وہ اپنے اونٹوں سمیت دریا کو پار کر گئے۔ ایک تو سردیوں کے باعث دریا میں پانی پہلے ہی کم تھا۔ دوسرے دریا کے مختلف حصوں میں بٹ جانے

کے باعث انہیں نیل عبور کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ اب انہوں نے اس شاہراہ کو چھوڑ دیا تھا جو فسطاط سے ہوتی ہوئی افریقہ کے مطران، سلوم اور طبرق شہروں کی طرف جاتی تھی۔ وہ بائیں ہاتھ مڑ کر لق و دق صحرا میں داخل ہو گئے تھے۔

احمد تمین اور بچوں کے ساتھ ایک اونٹ پر سوار تھا۔ دوسرے بچوں کی طرح اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے تھے اور سرخ رنگ کے کپڑے کی ایک پٹی اس کے منہ پر باندھ دی گئی تھی۔ اسی طرح ہر اونٹ پر کئی کئی بچے سوار تھے اور ہر اونٹ پر ایک ایک قزاق ان کی نگرانی کر رہا تھا۔

وہ بردہ فروش صحرا میں لگاتار سفر کرتے رہے۔ انہوں نے بچوں کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دیا حتیٰ کہ دوسرے روز دوپہر کے وقت انہوں نے صحرا کے اندر ایک نخلستان کے قریب اپنے اونٹوں کو روک لیا۔ اس نخلستان میں پہلے ہی ان گنت خیمے نصب تھے۔ قزاقوں نے کھجوروں تلے اپنے اونٹوں کو بٹھا دیا اور بچوں کے بندھے ہاتھ منہ کھول کر وہ انہیں خیموں میں منتقل کرنے لگے تھے۔ ایسا لگتا تھا وہ قزاق نخلستان میں پہلے سے پڑاؤ کرنے والوں ہی کا ایک حصہ تھے کیونکہ جو لوگ اس نخلستان میں پڑاؤ کیے ہوئے تھے ان کے پاس بھی کافی بچے تھے جو زیادہ تر مصری اور حبشی تھے۔

ایک آدمی نے جب احمد کے ہاتھ کھولے تو وہ اچانک اس پر ٹوٹ پڑا اور اسے ٹانگوں سے پکڑ کر نیچے گراتے ہوئے وہ اس کی چھاتی پر بیٹھ گیا اور لگاتار کئی گھونسے اس کے منہ پر مارتے ہوئے اس نے چلا کر غصیلی آواز میں کہا "تم لوگوں نے کیوں ہمارے قبیلے پر شب خون مار کر ہمیں اغوا کیا ہے۔ تم لوگوں نے نماز کے وقت ہم پر حملہ کیا اگر تم کسی اور وقت شب خون مارتے تو میرا قبیلہ وادیِ شعیب میں تم سب کی لاشیں بکھیر دیتا"۔

اتنے میں قریب ہی کھڑا ایک بردہ فروش بھاگ کر آگے بڑھا۔ بالوں سے پکڑ کر اس نے احمد کو اوپر اٹھایا اور پھر اس قدر سخت مکے اس کے منہ پر مارے کہ احمد کے منہ سے خون کی ایک دھار بہہ نکلی۔ یہ لڑائی جھگڑا دیکھ کر بہت سے بردہ فروش وہاں جمع ہو گئے جن میں ان کا سربراہ بھی شامل تھا جو ایک خوب سخت جسم کا بھوری داڑھی والا جوان

تھا۔ اس نے اپنی سخت اور کریہہ آواز میں پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

مار کھانے والے بردہ فروش نے جب پوری داستان سنائی تو ان کے سرخیل نے احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سخت اور غصیلی آواز میں کہا۔ "اس کا چہرہ داغ دو۔ میں اسے ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کروں گا جو اس پر ایسی سختی کرے گا کہ یہ اپنا سارا ماضی فراموش کر دے گا۔"

احمد اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہاں جمع ہونے والے سب بردہ فروشوں کو قہر بھرے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ بردہ فروشوں کا سرخیل احمد کے متعلق احکامات دے کر چلا گیا۔ پھر دو بردہ فروش آگے بڑھے۔ انہوں نے احمد کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے گھسیٹتے ہوئے ایک خیمے کے پاس لے گئے۔ وہاں آگ کا ایک الاؤ روشن تھا جس کے اندر انہوں نے لوہے کی بھاری، گول اور خوب موٹی سی لکڑی کے ایک دستے والی مہر سی رکھ دی تھی۔ جب وہ مہر آگ میں تپ کر خوب سرخ ہو گئی تو ایک بردہ فروش نے احمد کے ہاتھ پاؤں خوب کس کر باندھ دیے پھر ان دونوں نے وہ گرم سرخ لکڑی کے دستے والی مہر خوب زور سے دبا کر احمد کے بائیں گال پر لگا دی تھی۔ احمد کا گال جل کر دھواں اٹھ کھڑا ہوا تھا، اور وہ ایک کربناک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا تھا۔



حشم اور ہرثم جب کبھرین کی خانقاہ سے واپس اپنے خیموں کے پاس آئے تو وہاں امیصا بچوں کے ساتھ دھوپ میں کسی سہمی ہوئی فاختہ کی طرح بیٹھی تھی۔ اس کی بجھی بجھی زرد آنکھوں میں ابھی تک آنسوؤں کی نمی تھی اور اس کے غم آلود آتشیں چہرے پر شام کی پرچھائیوں جیسی افسردگی تھی۔ ہرثم وہاں چند لمحوں تک رک کر اپنی بہن کی اس کربناک حالت کو دیکھتا رہا پھر اس نے حشم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "حشم! حشم! تم بچوں کو ساتھ لگا کر خیمے اکھیڑ لو۔ میں قبیلے والوں سے کہوں کہ کوچ کی تیاری کریں۔ میں بھی بہت جلد لوٹ کر خیمے تہہ کرنے میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔"

ہرثم اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر خیموں کے اندر چلا گیا۔ حشم اپنے گھوڑے سے اتر کر آہستہ آہستہ امیصا کی طرف بڑھا اور تسلی دیتے ہوئے اسے کہا۔ "امیصا! امیصا! لوحِ تقدیر پر قسمت کے ہاتھوں نے یہی تحریر کر رکھا تھا کہ ہمارا فرزند ہم سے بے بسی کی حالت میں بچھڑ جائے۔ اب ہمارے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

امیصا کی حالت پیاس کی ماری اندھی ہرنی جیسی ہو گئی تھی۔ چند لمحوں تک وہ یوں اپنے شوہر کو دیکھتی رہی جیسے بجھی بجھی سی بے کیف رات آہستہ آہستہ گزرتی ہے۔ پھر اس کی ایسی آواز سنائی دی جیسے ویرانے میں کسی چرواہے کا ماتمی گیت۔ اس نے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آہ! احمد! میری جان کی ملاحت اور میری روح کی حلاوت ہے۔ اگر وہ مجھے نہ ملا تو میں کسی ٹوٹتے ہوئے ستارے کی مانند اندھیروں اور غموں میں کھو جاؤں گی۔"

حشم بیچارہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ کچھ دیر وہ غمگین غمگین سا کھڑا امیصا کو دیکھتا رہا پھر وہ کوچ کی تیاری کرنے لگا تھا۔ امیصا بھی شیبان، خصیب اور طروب کے ساتھ اس کی مدد کرنے لگی تھی۔ جلدی ہی ہرثم بھی لوٹ آیا اور سب مل کر اپنا سامان اونٹوں پر لادنے لگے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اونٹوں کی ایک لمبی قطار کی صورت میں بنو کندہ کا وہ قافلہ اپنی منزل کی طرف کوچ کر رہا تھا۔

تیسرے روز شام کے قریب بنو کندہ کا یہ قافلہ یوسف علیہ السلام کی کھدوائی ہوئی نہر منتہیٰ[1] اور فرعون کے تباہ شدہ شہر منف[2] کے درمیان رک گیا۔ یہاں بنو کندہ

---

[1] یہ نہر حضرت یوسف علیہ السلام نے کھدوائی تھی جو فیوم شہر کے قریب ہے۔

[2] قدیم دور میں یہ شہر فرعونوں کا دارالحکومت تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام بھی اسی شہر میں رہتے تھے۔ اس شہر کے کھنڈرات قاہرہ سے نو میل کے فاصلے پر تھے۔ اس شہر کی فصیل لوہے کی تھی اور اس کے ستر دروازے تھے۔ یہ شہر بارہ میل لمبائی میں تھا۔ شہر میں چار نہریں تھیں جو فرعون کے تخت کے

کے پہلے آنے والے لوگوں نے کئی بستیاں آباد کر رکھی تھیں۔ عرب یہاں کھیتی باڑی کرتے تھے نہر کے کنارے اُنہوں نے کئی کنویں کھود رکھے تھے۔ وہ اپنے اونٹوں کو ان کنوؤں میں جوت کر زمین سیراب کرتے اور خوب غلّہ اُگاتے تھے۔ کاشت کاری بھی وہ اونٹ ہی سے کرتے تھے۔ پہلے سے آباد ان عربوں نے بستیوں سے باہر نکل کر اپنے نئے آنے والے عرب بھائیوں کا استقبال کیا اور بڑے احترام و عزت کے ساتھ وہ انہیں اپنی بستیوں کی طرف لے جا رہے تھے۔



احمد جب ہوش میں آیا تو اس نے دیکھا بردہ فروشوں کا وہ کارواں بڑی تیزی سے مغرب کی طرف کُوچ کر رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کافی دیر تک بے ہوش پڑا رہا ہے۔ کیونکہ جس وقت وہ ہوش میں آیا۔ اس وقت رات خوب گہری ہو چکی تھی۔ چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور ستاروں کے کارواں نیلے آسمان پر اپنی منزلوں کی طرف گامزن تھے۔

چاندنی رات میں اُونٹوں کی لمبی قطار صحرا کو تیزی سے ناپتی جا رہی تھی۔ احمد نے اپنے آپ کا جائزہ لیا۔ اس کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور وہ قافلے کے سب سے اگلے اُونٹ پر تھا۔ اس کے ساتھ اس اونٹ پر ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا، جو بڑی شفیق نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ احمد کو ہوش میں آتے دیکھ کر اس بوڑھے نے جو اس کے ساتھ اُونٹ پر سوار تھا نہایت ہمدردی سے پوچھا "تم کیسے ہو بیٹے!"

احمد نے چونک کر پوچھا "کیا میں کسی اور کارواں میں آ گیا ہوں؟"

اس بوڑھے نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "کارواں تو وہی ہے صرف اُونٹ بدلی ہوا ہے۔" احمد نے پریشان حالی میں پوچھا "اس کارواں میں میرے ساتھ پہلے تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) نیچے سے جاری تھیں۔ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے جب مصر پر حملہ کیا تو اس نے فرعونوں کے اس شہر کو ویران اور مسمار کر دیا۔

ایسا نرم سلوک کسی نہ کیا تھا۔ پھر تم اس قدر شفیق لہجے میں کیونکر مجھے بیٹا پکار رہے ہو۔ تمہارا نام کیا ہے اور اس کارواں میں تمہاری کیا حیثیت ہے۔

اس بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا نام اخناتون ہے۔ میں یونانی ستارہ شناس ہوں اور صحراؤں میں سفر کے دوران ستاروں کی مدد سے اس قافلے کی صحیح سمت راہنمائی کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ ان میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے"۔ احمد نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس قدر شفیق ہو کر ان بردہ فروشوں کی خدمت کیوں کرتے ہو، تم منجم اور ستارہ شناس ہو تم کسی اور ذرائع سے بھی اپنا رزق حاصل کر سکتے ہو؟"

بوڑھے اخناتون نے دُکھ اور کرب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ خدمت مجھ سے زبردستی لی جاتی ہے، اگر میں انکار کر دوں تو یہ وحشی بھیڑیے مجھے قتل کر دیں گے۔ میری اپنی حیثیت ان قزاقوں کے اندر ایک غلام کی سی ہے اور مجھے ان کے اشاروں پر ان کی خدمت کرنا پڑتی ہے ورنہ ان کے ساتھ میں زندگی بسر کرتے ہوئے خوش نہیں ہوں۔ یہ سب وحشی ہیں۔ اگر میں بھاگنے کی کوشش کروں گا تو بھی یہ مجھے قتل کر دیں گے۔ تم مسلمان ہو اور کسی بہادر اور نیک باپ کی اولاد ہو۔ سنو! میں تمہیں ایک نصیحت کرتا ہوں اگر اس پر عمل کرو گے تو نہ صرف بے وقت موت سے محفوظ رہو گے بلکہ فلاح پاؤ گے"۔

احمد نے چونک کر پوچھا۔ "تم مجھے کیسی نصیحت کرنا چاہتے ہو"۔ اخناتون نے سوچا پھر کہا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟" ——— "میرا نام احمد ہے"۔ اخناتون نے اور نرم ہو کر کہا، "سنو! مجھے غور سے سنو! یہ بردہ فروش سب بربر[1] ہیں۔ تم نے چونکہ ان کے

---

[1] بربر اصل میں فلسطینی ہیں۔ ان کا آبائی وطن بھی فلسطین ہے۔ جالوت بادشاہ انہی میں سے تھا۔ جب اردن کی زیریں وادی میں غور کے مقام پر بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت نے بنی فلسطین کے سالار جالوت کو شکست دی۔ جونہی فلسطینی بھاگ کر افریقہ چلے گئے۔ یہ واقعہ ایک ہزار سال قبل مسیح پیش آیا۔ بعد میں جب عربوں نے اپنے بادشاہ افریقش بن ابرہہ کی سرکردگی میں افریقہ پر حملہ کیا تو نہ صرف

ایک ساتھی سے جھگڑا کیا ہے۔ لہٰذا ان کا سردار تمہیں ایک نہایت بُری جگہ فروخت کرنے کا ارادہ کر چکا ہے۔ جہاں تمہیں فروخت کیا جائے گا وہاں کسی سے یہ نہ کہنا کہ تم مسلمان ہو۔ ورنہ وہ لوگ تمہیں قتل کر کے فخر محسوس کریں گے۔

یہ بربر صرف مسلمان، یہودی اور حبشی بچّوں کو اغوا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو یہ اپنا دوست اور رفیق سمجھتے ہیں لہٰذا ان کے بچّوں کو اغوا نہیں کرتے۔ تم اپنے آپ کو یہودی ظاہر کرنا۔ اس طرح تم قتل ہونے سے تو بچ جاؤ گے تاہم تم سے مشقت مزدور سخت نوعیت کی لی جائے گی۔ میری ایک اور نصیحت بھی غور سے سنو! تمہارا نام احمد ہے اور یہی نام تمہارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بھی ہے۔ لہٰذا اس سے ظاہر ہو جائے گا تم مسلمان ہو بہتر ہے تم اپنا نام بھی بدل کر بتاؤ۔"

احمد نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "مجھے اپنا نام کیا بتانا چاہیئے"۔ اخناتون نے پھر چند لمحوں کے تفکّر کے بعد کہا "تم اپنا نام سمرون بتانا"۔

احمد نے دُکھ سے کہا "آہ! میرا یہ نیا نام میری ماں کے رکھے نام سے کیسا مختلف ہے"۔ اخناتون نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تمہاری ماں کا نام کیا ہے؟" ——— "اس کا نام ایمصا ہے اور میرے اغوا ہونے پر وہ رو رو کر ہلکان ہو گئی ہو گی اس لیے کہ میں اس کا بڑا بیٹا ہوں اور میں اس کی نگاہوں میں بڑا عزیز، دل پسند اور کمیاب تھا۔ میرا باپ، ماموں اور میرے دونوں چھوٹے بھائی بھی دیوانگی کی حد تک مجھے چاہتے تھے۔ ہائے حیف! میرے بعد ان سب پر کیا بیتی ہو گی"۔

احمد کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ سسک سسک کر رونے لگا تھا۔ بوڑھا

بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۵) اسی بادشاہ کے نام سے اس سرزمین کا نام افریقہ ہوا۔ جب کہ ان فلسطینیوں کو بھی بربر کہا جانے لگا۔ بربر عربی لغت میں بے معنی آوازوں کے مل جانے کو کہتے ہیں۔ افریقش چونکہ عرب تھا لہٰذا وہ فلسطینیوں کی زبان سمجھ نہ سکا اور بے ساختہ کہا۔ ما اکثر بربرتھم (یہ کس قدر بے معنی باتیں کرتے ہیں) تب سے ان کا نام بربر مشہور ہو گیا۔

اخناتون اسے اپنے ساتھ لپٹا کر تسلی دینے لگا تھا۔

وحشی رات اپنی سلگتی صورت میں آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ تخریب کی تند آندھی میں صحرا کے خدوخال بنتے بگڑتے رہے۔ قزاقوں کا کاروان بڑی تیزی سے مغرب کی طرف سفر کرتا رہا۔ حتیٰ کہ چاند بجھ گیا، ستارے لُٹ گئے اور صحرا کے پُرہول سناٹے میں سحر کی گوری گود میں سورج طلوع ہوا تھا۔ بوڑھے اخناتون نے احمد کی طرف دیکھا۔ اونٹ کے کجاوے پر وہ گہری نیند سویا ہوا تھا اور آنسوؤں کی لکیریں اس کے گالوں پر خشک ہو گئی تھیں۔

سورج طلوع ہونے میں اخناتون کی راہنمائی میں کاروان نے اپنا رُخ شمال مغرب کی طرف موڑ لیا تھا یہاں تک کہ وہ سلوم شہر میں داخل ہوئے اور کچھ لڑکوں کو فروخت کر کے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔

اس کے بعد کئی روز کے لگاتار سفر کے بعد طبرق، احدابیہ، سیدار اور مروا شہروں میں اغوا کیے ہوئے لڑکوں کو فروخت کرنے کے بعد انہوں نے اپنا رُخ جنوب کی طرف موڑ لیا۔ یہاں تک کہ بردج شہر میں لڑکیوں کو فروخت کرنے کے بعد انہوں نے آرام کی خاطر وہیں پڑاؤ کر لیا تھا۔ اب ان کے پاس بہت کم لڑکے بچ گئے۔ ایک رات وہاں پڑاؤ کر کے انہوں نے آرام کیا پھر دوبارہ وہ آگے بڑھنے لگے تھے۔

بردج شہر سے انہوں نے اپنا رُخ بھی بدل کر جنوب مغرب کی طرف کر لیا تھا۔

غاروبہ شہر میں انہوں نے احمد کے سوا سب لڑکوں کو فروخت کر دیا پھر وہ دریائے لاغوت کو عبور کرنے کے بعد مغرب کی طرف کوہستان اطلس کی طرف بڑھنے لگے تھے۔

ایک روز سہ پہر کے قریب بردہ فروشوں کا وہ کاروان اردیہ شہر سے باہر خیمہ زن ہوا۔ یہ شہر گو چھوٹا ہی تھا لیکن اپنی عظیم فوجی قوت اور بڑے بڑے وسیع فوجی مستقر کی بنا پر شمال مغربی افریقہ میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اسی شہر میں بربر دل کا عظیم بادشاہ کسیلہ رہتا تھا اور کوہستان اطلس کے دامن میں اس کا بڑے بڑے سیاہ پتھروں سے بنا ہوا وسیع محل تھا۔

جب کاروان خیمہ زن ہو کر اپنے کھانے کا انتظام کرنے لگا تو کاروان کے سردار نے

احمد کو ایک بوڑھے بردہ فروش کے حوالے کیا جو اسے بیچنے کے لیے شہر کی طرف لے گیا تھا۔

وہ بوڑھا بردہ فروش احمد کو کسیلہ بادشاہ کے محل میں لایا اور وہاں پہرہ دینے والے محافظوں سے اس نے کہا۔ ”میں ایک سرکش اور خونخوار بچے کو لایا ہوں اس کا تعلق وادی سینا سے ہے اور میں اسے تمہارے بادشاہ کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہوں“۔

ان پہرے داروں کا سالار چند ثانیوں بڑے غور اور انہماک سے احمد کو دیکھتا رہا۔ پھر بوڑھے بردہ فروش کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ”تم یہاں ہمیشہ سرکش اور جوان ہمت غلام فروخت کرتے رہے ہو۔ ذرا رکو میں بادشاہ کو اس کی خبر کرتا ہوں۔ اسے اگر یہ لڑکا پسند آیا تو ضرور خرید لے گا“۔ وہ سالار لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سنگین پتھروں کے اس بلند کوہستانی اور صحرائی محل کے اندر چلا گیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد محل کے اندر سے بربروں کا بادشاہ کسیلہ نکلا۔ اس کا قد خوب لمبا اور جسم بھرا ہوا تھا۔ عمر کے لحاظ سے وہ چالیس برس کے قریب ہوگا۔ اس کے باہر نکلتے ہی محل کے سارے خدام بھی باہر نکل آئے تھے اور وہاں اچھا بھلا جمگھٹا سا لگ گیا تھا۔ قریب آکر کسیلہ غور سے احمد کو دیکھنے لگا پھر اپنی بھاری، بارعب آواز میں پوچھا۔ ”تم کون ہو“۔

احمد نے بڑی جرأت مندی کے ساتھ کسیلہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم دیکھ تو رہے ہو۔ میں بھی تم جیسا ایک انسان ہوں“۔ کسیلہ کا رنگ غصے میں سرخ ہوگیا اور احمد کے منہ پر زوردار طمانچہ مارتے ہوئے اس نے کہا۔ ”غلام ہوکر ایسی بدتمیزی اور بے باکی سے گفتگو کرتے ہو؟“

احمد نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا۔ ”وقت اور قدرت نے کبھی تمہاری زندگی کی طنابیں مجھے تھما دیں تو میں تمہارے ساتھ اس سے بھی بدترین سلوک کروں گا۔ کیا تم یہ نہیں سوچتے میں اجنبی ہوں اور زبردستی غلام بنا لیا گیا ہوں۔ ورنہ میں بھی تمہاری طرح آزاد اور خود مختار تھا۔

کسیلہ کچھ دیر غور سے احمد کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنے محافظوں کے سالار سے کہا۔

”ذرا اپنے داروغہ یہودتھ کے بیٹے فرلیس کو بلاؤ“۔

ہجوم کو چیرتا ہوا ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکا خود ہی باہر نکل آیا اور کسیلہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے کہا۔ ”میں حاضر ہوں آقا!“ کسیلہ نے احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ذرا اس کے ساتھ لڑ کر دکھاؤ۔ تمہاری اور اس کی عمر میں پانچ چھ سال کا فرق ہوگا اگر یہ تھوڑی دیر بھی تمہارے سامنے جم گیا تو بس اسے خرید لوں گا۔ یہ غلام ہے اور اس کے آقا کا کہنا ہے کہ یہ خوب سرکش اور خونخوار ہے۔ اسے لڑتا دیکھ کر مجھے اس قیمت لگانے میں بھی آسانی رہے گی“۔

کسیلہ جب خاموش ہوا تو فرلیس اپنی آستینیں چڑھاتا ہوا آگے بڑھا۔ احمد نے بھی اپنا جبہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور وہ بھی اپنی آستینیں چڑھانے لگا تھا۔

قریب آتے ہی فرلیس نے لگاتار تین مکے احمد کے پیٹ، شانے اور پسلیوں پر دے مارے۔ احمد بھی بپھر گیا اور جواب میں اس نے بھی کئی مکے فرلیس کے منہ پر دے مارے تھے اپنے سے کم عمر لڑکے سے مکے کھا کر فرلیس کو بھی طیش آگیا تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے احمد کی گردن اپنے دائیں بازو میں دبوچ لی اور اسے خوب مروڑ کر زمین پر گرا لیا اور اس کی چھاتی پر بیٹھ کر وہ اسے مارنے لگا تھا نیچے بے بس ہونے کے باوجود احمد اپنے ہاتھ پاؤں چلا کر فرلیس کو مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کسیلہ آگے بڑھا اور فرلیس کو پکڑ کر احمد کی چھاتی سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”اسے چھوڑ دو، میں اسے خریدنے کا فیصلہ کر چکا ہوں“۔ فرلیس احمد کی چھاتی سے اتر گیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ احمد بھی کھڑا ہوگیا اور اپنے گرد آلود کپڑے جھاڑ کر اس نے اپنا جبہ اٹھا لیا تھا۔

کسیلہ نے پھر اس سے قریب ہوکر پوچھا۔ ”تمہارا نام اور مذہب کیا ہے؟“

احمد نے بلا تامل کہہ دیا ”میرا نام سمرون ہے اور میں یہودی ہوں“۔ کسیلہ نے اپنے محل کے داروغہ اور فرلیس کے باپ یہودتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اسے ان دو غلام لڑکوں کے ساتھ لگا دو جو ہمارے گلوں کی نگہبانی کرتے ہیں۔ اس کے چہرے کا ایک حصہ پہلے ہی اس کے مالکوں

نے اس کی سرکشی کے باعث داغ رکھا ہے۔ اس کے چہرے کا دوسرا حصّہ بھی داغ دو تاکہ اُس کی پہچان ہو سکے کہ یہ غلام ہے"۔

کسیلہ رکا پھر نقدی کی ایک تھیلی اپنی کمر سے کھول کر بوڑھے بردہ فروش کی طرف پھینکتے ہوئے کہا "یہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس کی تم مجھ سے توقع رکھتے تھے" بردہ فروش مڑا اور لوٹ گیا کسیلہ بھی اپنے محل کے اندر چلا گیا تھا۔ یہودتھ کے کہنے پر محافظوں نے غلام داغنے کی آہنی مہر کو آگ میں خوب گرم کیا اور پھر احمد کو جکڑ کر انہوں نے اس کے چہرے کا دوسرا حصّہ بھی داغ دیا گیا۔ احمد بے ہوش ہو گیا تھا اور محافظوں نے اسے اُٹھا کر اس حصّے میں ڈال دیا تھا جو کسیلہ کے ذاتی ریوڑ کے باڑے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

احمد جب ہوش میں آیا تو اس نے دیکھا وہ ایک تنگ کوٹھڑی کے ننگے فرش پر پڑا تھا۔ اس کے قریب دو ہم شکل لڑکے بیٹھے تھے اور اُنہوں نے کمرے میں السی کے تیل سے جلنے والا ایک چراغ روشن کر رکھا تھا۔ احمد اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا ان دونوں لڑکوں کے گال بھی داغے ہوئے تھے۔ اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم دونوں کون ہو اور تمہارے گال کیوں داغے گئے ہیں"۔

ان میں سے ایک نے بڑی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ہم دونوں سگے بھائی ہیں اور ہم بربروں کے بادشاہ کسیلہ کے ریوڑ کی گلہ بانی کرتے ہیں۔ ہم دونوں بھائی غلام ہیں اور یہاں غلاموں کے چہرے داغنے کا رواج ہے"۔

احمد نے پھر پوچھا "تم دونوں کے نام کیا ہیں اور تمہارا وطن کون سا ہے"؟ اس لڑکے نے پھر کہا "میرا نام کرِدام اور یہ میرا چھوٹا بھائی انولو ہے۔ ہم قبطی ہیں اور انتہائی جنوبی مصر کے رہنے والے ہیں۔ آج سے دو برس قبل ہمیں اس وقت بردہ فروشوں نے اغوا کر لیا جب ہم اپنے ماں باپ کے ساتھ دریائے نیل کے کنارے شمال کی طرف سفر کر رہے تھے ان ظالموں نے ہمارے ماں باپ کو قتل کر دیا اور ہمیں غلام بنا کر بیچ ڈالا"۔

کمرے میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر کرِدام نے نہایت شفقت میں احمد

کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اب تم ہمارے ساتھ کسیلہ کا ریوڑ چرایا کرو گے لیکن تم اپنا نام اور وطن تو کہو"؟

احمد نے خستہ اور مجروح آواز میں کہا "اے میرے گلہ بان ساتھیو! میرا نام سمرون ہے میں یہودی ہوں اور میرا تعلق وادیِ سینا سے ہے۔ تمہاری طرح مجھے بھی غلام بنا کر بیچ دیا گیا ہے۔ فرق صِرف اتنا ہے کہ تم دونوں کا صِرف ایک گال داغا گیا ہے جب کہ میرے دونوں گال داغے گئے ہیں۔ میرا جلا ہوا ایک گال ظاہر کرتا ہے کہ میں سرکش اور خونخوار ہوں جب کہ دوسرے گال کی مُہر میرے غلام ہونے کی نشاندہی کرتی ہے"۔

احمد کے خاموش ہونے پر انولو نے کہا "ہماری طرح تم بھی بے بس اور مجبور ہو۔ آج سے تم بھی ہمارے بھائی ہو۔ میری ایک بات غور سے سنو! یہاں آٹھ پہر میں کھانا صرف ایک بار ملتا ہے اور وہ بھی صبح کے وقت۔ ہم دونوں بھائی ریوڑ چرانے کے دوران جنگلی بیریوں کے بیر اور پتے کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ یہ ساتھ والا کمرہ ہمارا ہے۔ اس میں ہم نے کچھ بیر جمع کر رکھے ہیں جنہیں کھا کر تم آسانی سے رات بسر کر سکو گے، آؤ ہمارے ساتھ"۔

احمد اُٹھ کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ جب وہ کمرے سے نکلے تو احمد نے دیکھا کسیلہ کے محل کی پُشت پر وہ ایک بہت بڑا احاطہ تھا جس کے اندر بے شمار بکریاں، گھوڑے، اونٹ اور خچریں تھیں۔ ایک طرح سے وہ ایک وسیع باڑا تھا۔ جس میں کسیلہ کے ریوڑ بند تھے۔ اس باڑے کے ایک طرف غلاموں کے لیے کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے احمد، کرِدام اور انولو کے ساتھ ایک سے نکل کر دوسری کی طرف ہو لیا تھا۔

تینوں ساتھ والی کوٹھڑی میں داخل ہوئے وہاں فرش پر ایک بستر لگا ہوا تھا اور کوٹھڑی کے دائیں جانب مٹی کے چند چھوٹے چھوٹے برتنوں کے علاوہ چند مٹکے بھی پڑے تھے۔ کرِدام احمد کو پکڑ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ انولو نے ایک مٹکا اُٹھا کر ان دونوں کے سامنے

رکھ دیا - احمد نے دیکھا وہ مٹکا بیروں سے آدھا بھرا ہوا تھا اور اس میں سے آگ کے اندر بھنے ہوئے پھل جیسی خوشبو اُٹھ رہی تھی - کردام نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم تو رات کو یہی کھا کر گزارہ کر لیتے ہیں - اس کے علاوہ ہم ساگ پات اور سبزیاں بھی خشک کر لیتے ہیں اور رات کو انہیں اُبال کر گزارہ کر لیتے ہیں -

احمد نے سامنے دیوار کے ساتھ لٹکتی ہوئی کمان اور اس کے ساتھ ہی بندھے ہوئے ترکش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں میں سے یہ کمان اور ترکش کس کا ہے"۔

کردام نے کہا۔ "میرے پاس کچھ نقدی تھی جس سے میں نے یہ کمان اور ترکش خریدے تھے لیکن ان سے میں کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکا۔"

احمد نے چونک کر پوچھا "کیسا فائدہ؟" کردام نے تاسف کے اظہار میں کہا۔ کوہستانِ اطلس میں جنگلی بکریاں بہت ہوتی ہیں - وہیں ہم بھی ریوڑ چراتے ہیں - میں نے کمان اس غرض سے خریدی تھی کہ ان بکریوں کا شکار کر کے اپنا اور اپنے بھائی کا پیٹ بھروں گا لیکن مجھے مایوسی ہوئی - ہم دونوں میں سے کسی کا نشانہ اچھا نہیں ہے اور وہ بکریاں بہت تیز ہیں اس لیے ہم اُن کا شکار نہ کر سکے"۔

احمد نے چھاتی تانتے ہوئے کہا۔ "تم کل کمان اور تیروں سے بھرا ہوا ترکش ساتھ لے کر چلنا پھر دیکھنا وہ جنگلی بکریاں کیسے نشانہ نہیں بنتیں - سنو! میرے ساتھیو! میرا نشانہ بے خطا ہے - اگر کوہستانِ اطلس میں جنگلی بکریاں ہیں تو میں اِن بیروں اور خشک سبزیوں سے تم دونوں کی جان چھڑا دوں گا"۔

اس بار انولو نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم داروغہ یہود تھ کے بیٹے فریس سے بچ کر رہنا - وہ بات بات پر مارنے لگ جاتا ہے - بہت ظالم ہے وہ - ایک بار ہم دونوں بھائیوں کو سخت بھوک لگی تھی اور ہم ریوڑ کا ایک میمنہ کاٹ کر کھا گئے تھے لیکن فریس کو کسی طرح خبر ہو گئی - اس نے ہم دونوں بھائیوں کو اس قدر مارا کہ ہم بے ہوش ہو گئے تھے - اب آؤ مل کر بیر کھائیں ہم نے بھی صبح کا کچھ نہیں کھایا' بھوک لگی ہے"۔

جونہی وہ بیر کھانے لگے باہر زور کا کھٹکا ہوا - یوں لگا جیسے احمد کی کوٹھڑی کے

دروازے پر کسی نے زور سے پتھر مارا ہو - کردام کھڑا ہو گیا اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "سمرون! سمرون! یوں لگا ہے جیسے تمہاری کوٹھڑی کے چوبی دروازے پر کسی نے پتھر مارا ہو۔ یہ ضرور فریس ہو گا اور ہمیں بلا رہا ہو گا - پتھر مار کر اس نے غصے کا اظہار کیا ہو گا - آؤ دیکھتے ہیں وہ ہمیں کیا کہتا ہے -

تینوں اُٹھ کر کوٹھڑی سے باہر آئے - رات اب گہری ہو گئی تھی - آسمان کے وسط میں کرنوں کا سوداگر چاند مسکرا مسکرا کر زمین کے ساتھ تاریکیوں کی ستیزہ کاری دیکھ رہا تھا - باہر باڑے میں کوئی بھی نہ تھا - خچروں اور گھوڑوں کے علاوہ سب جانور بیٹھے آرام کر رہے تھے - کبھی کبھی کسی بھیڑ بکری کی ممیاہٹ' خچر گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور اونٹوں کے بلبلانے کی آوازیں سُنائی دے جاتی تھیں - تینوں جب اس کوٹھڑی کے دروازے پر آئے جہاں سے تھوڑی دیر قبل وہ اُٹھ کر گئے تھے تو وہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ کوٹھڑی کے اندر ایک گٹھڑی پڑی تھی -

کردام نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ "یہ کہاں سے آئی؟" احمد نے لاپرواہی سے کہا۔ "میں کیا جانوں - آؤ دیکھتے ہیں اس میں کیا ہے"۔

تینوں کمرے میں داخل ہوئے احمد نے گٹھڑی کھولی - اس میں دو چادریں' ایک توشک اور ایک لحاف تھا اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی گٹھڑی بھی تھی - انولو نے بے تابی سے اس چھوٹی گٹھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے بھی کھولو، دیکھیں اس میں کیا ہے"۔ احمد نے جب وہ گٹھڑی کھولی تو اس میں کھانے کے علاوہ نقدی کی ایک چھوٹی سی اور خوب صورت چرمی تھیلی بھی تھی -

احمد نے وہ تھیلی کھول کر دیکھی اس میں کافی سنہری سکے تھے پھر احمد نے کھانے کی چیزوں میں شامل پنیر کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا۔ "اے میرے گلہ بان ساتھیو! یہ کھانا تو ہم تینوں کے لیے کافی ہے' آؤ مل کر کھائیں - اسے دیکھ کر میری بھوک زیادہ چمک گئی ہے"۔

کردام نے کہا "پہلے یہ تو سوچو یہ چیزیں کہاں سے آئی ہیں - تمہارے لیے بستر بھی ہے - نقدی اور کھانا بھی - لگتا ہے اس محل میں تمہارا کوئی مہربان ہے پر کون ہو سکتا

ہے۔ اس محل کے لوگ تو صرف ظلم کرنا جانتے ہیں پھر یہ چیزیں کہاں سے آگئیں۔ کہیں ایسا تو نہیں تم پر یہ من و سلویٰ اُترا ہو، ایسے ہی جس طرح تمہارے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے دَور میں تمہاری قوم پر من و سلویٰ اترا تھا اور پھر یہ بستر دیکھو کیسا خوب صورت ہے۔ دُھلی ہوئی چادریں ہیں اور خوب موٹے اور اُون روئی سے پھُولے ہوئے ریشمی لحاف اور توشک ہیں سمرون! تم خوش قسمت ہو، ورنہ ہم اس باڑے میں جب آئے تھے تو کسی نے پانی تک نہ پوچھا تھا۔"

احمد نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تفکرات میں ڈوبا ہُوا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ کس نے اس کے لیے کھانا، نقدی اور بستر مہیا کیا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا، جلد ہی وہ کرہ دام اور انولو کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔



دوسرے روز احمد، کرہ دام اور انولو کسیلہ کے ریوڑ لے کر نکلے۔ سارویہ شہر سے نکل کر وہ شمال مغرب کی طرف ریوڑوں کو کوہستانِ اطلس کی طرف لے گئے تھے۔ دریائے لاغوت کے کنارے پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک ہری بھری وادی میں انہوں نے ریوڑ چرنے کو چھوڑ دیئے اور خود ایک پہاڑ کے اُوپر چڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد کرہ دام اور انولو کھڑے ہو گئے اور احمد سے کہا۔" سمرون! سمرون! تم یہاں بیٹھو ہم یہ ساتھ والی جھاڑیوں سے بیر توڑتے ہیں"۔ احمد کھڑا ہوتا ہُوا بولا۔" میں بھی تمہارے ساتھ بیر توڑوں گا۔ کل رات تو کسی نے کھانا دے دیا تھا۔ روز روز ایسا احسان کون کرے گا"۔

کرہ دام نے اس کے کندھوں پہ بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔" تمہارا آج پہلا دن ہے۔ آج تم مہمان ہو۔ کل سے ہم تمہیں اپنے ساتھ کام پر لگائیں گے۔ ہم تھوڑی دیر ہی بیر توڑیں گے پھر تمہارے ساتھ جنگلی بکریوں کا شکار کرنے چلیں گے پھر دیکھیں گے تمہارا نشانہ کیسا ہے"۔ کرہ دام اور انولو بھاگتے ہوئے قریبی جھاڑیوں کے اندر جا کر بیر توڑنے لگے تھے۔

احمد کھڑا ہو کر اداس نگاہوں سے ماحول کو دیکھنے لگا تھا۔ اس کے چاروں طرف کوہستان اطلس کا سنگین سلسلہ پھیلا ہُوا تھا اور مشرق اور جنوب میں صحرائے اعظم کا بیکراں سلسلہ تھا اور اس کے اندر دریائے طاغوت کوہستانِ اطلس سے نکل کر ایک سفید لکیر کی صورت میں مشرق کی طرف صحرا کے وسطی شہر عین صالح کی طرف جاتا ہُوا راستے ہی میں خشک ہو گیا تھا۔

مغرب میں کوہستان اطلس کا بلند سلسلہ دُور دُور تک پھیلا ہُوا تھا۔ دور شمال میں کوہستان اوراس کی بلند اور نیلی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ نہ جانے کیا سوچتے ہوئے احمد اُداس ہو گیا اور ان نیلی چوٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے زخمی اور غمزدہ آواز میں کہا۔" اے میرے رب! میں کب تک اپنے ماں باپ، بھائیوں اور عزیزوں سے دُور پردیس کی ان بے ضمیر گزرگاہوں میں دھکے کھاتا رہوں گا۔ آہ! میرے سنہرے وطن تیری جدائی کے زخم میرے دل کا خون نچوڑتے رہیں گے۔ اے میرے وطن! اس سمت میں ہوں اور اس پار تُو اور بیچ میں سمندر اور صحراؤں کی دیواریں"۔

احمد چند لمحوں تک گردن جھکائے سوچتا رہا پھر وہ بلند آواز میں گانے لگا تھا۔

مَظْلُوْمٌ اَنَا مَظْلُوْمٌ
مظلوم ہوں میں مظلوم ہوں
مَظْلُوْمٌ یَا رَبِّ مَظْلُوْمٌ
اے میرے رب میں مظلوم ہوں

احمد گاتا رہا، لگتا تھا کوہستانِ اطلس میں پگھلا ہُوا نیلم بکھر گیا ہو۔ اس کی زمزمہ خوان آواز ویرانوں میں کسی ماہر مغنی کی نوا کی طرح نبضِ فطرت پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ قریب ہی جھاڑیوں کے اندر بیر توڑتے ہوئے کرہ دام نے اپنے چھوٹے بھائی انولو کی طرف دیکھتے ہوئے غمگین لہجے میں کہا۔" انولو! انولو! سنو! غور سے سنو! سمرون کی آواز میں کیسا رس اور درد ہے۔ کاش ہم اس کی کوئی مدد کر سکتے"۔ پھر کرہ دام کھڑا ہو گیا اور کہا۔" آؤ اس کے پاس چلتے ہیں اور اسے تسلی دیتے ہیں"۔ دونوں بھائی اُٹھ کر احمد کی طرف چل دیئے۔

کردام اور انولو جب احمد سے قریب گئے تو بے بسی میں گاتا ہوا احمد خاموش ہو گیا کردام نے قریب جا کر دیکھا وہ یوں اداس تھا جیسے کوئی ستارہ ٹوٹ کر سمندر میں اُتر گیا ہو۔ وہ افسردہ تھا بھٹکے ہوئے کسی بادل کی طرح۔ غمگین تھا صحرائے وحشت میں آندھیوں کی یورش کے سامنے کھڑے کھجور کے کسی تنہا درخت کی طرح۔ کردام نے دُکھ سے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ "سمرون! سمرون! میرے دوست! کاش ہم تیری کوئی مدد کر سکتے۔ ہمیں تمہارے دُکھ اور غم کا افسوس ہے۔ پر ہائے حیف! ان صحراؤں میں ہم بھی تمہاری طرح غریب الوطن ہیں"۔ احمد نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "آہ! غم وہ آندھی ہے جو صحراؤں کو بھی اُڑا لے جائے۔ نہ جانے میری ماں پر کیا بیتی ہو گی۔ میرا محترم باپ کس حال میں ہو گا۔ میرے بھائی اور میرا ماموں کہاں ہوں گے"۔

انولو نے دُکھتے لہجے میں کہا۔ "کاش دُنیا میں کوئی ایسی ہستی ہوتی جو ہم جیسے بے بس اور مظلوم لوگوں کی مدد کرتی"۔ احمد نے فوراً سنبھلتے ہوئے کہا۔ "ایسی ہستی ہے اور وہ میرا اللہ ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے ہر عمل دیکھتا ہے"۔

انولو نے کہا۔ "پھر تم اس سے مدد کی درخواست کیوں نہیں کرتے؟" احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "یقین رکھو، ایک روز وہ ہمیں اس جہنم سے ضرور نکالے گا"۔

احمد ذرا رکا پھر اس نے کہا۔ "میرے گلہ بان ساتھیو! اگر تم کسی اور سے نہ کہو، تو میں تم سے ایک راز کہوں؟" کردام نے چھاتی تانتے ہوئے کہا۔ "تم ہم پر ہر قسم کا اعتماد کر سکتے ہو ہم تمہیں دھوکہ نہ دیں گے۔ تمہارا راز اب ہمارا راز ہے اور ہم دونوں بھائی موت تک تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں"۔

احمد نے کہا۔ "میں نے ایک مصلحت کے تحت اپنے آپ کو یہودی کہا تھا۔ ورنہ میں یہودی نہیں مسلمان ہوں لیکن تم یہاں عام لوگوں میں مجھے یہودی ہی خیال کرنا۔ تم دونوں نے یہ نہیں بتایا کہ تمہارا مذہب کیا ہے"۔

کردام نے ایک بار اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا پھر تکلیف دہ احساس میں

اس نے کہا۔ "ہم بُت پرست ہیں اور قدیم یونانی بُتوں کی پُوجا کرتے ہیں۔ جنوبی مصر کے اکثر لوگ بُت پرست ہیں۔ جہاں اس صحرا کے اندر بھی لوگ دو مذہبوں پر عمل پیرا۔ کچھ بُت پرست ہیں اور کچھ آتش پرست۔ بہر حال تم اپنے مذہب کے اصولوں سے ہمیں آگاہ کرنا۔ اگر وہ دل پسند ہوئے تو ہم انہیں قبول کر کے مُسلمان ہو جائیں گے"۔

انولو نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آؤ کوہستان اطلس کی پہاڑی بکریوں کا شکار کریں۔ ان میں سے ایک کو مار کر اس کا گوشت بھُون لیں۔ کچھ یہاں بیٹھ کر کھا لیں گے اور کچھ شام کے لیے ساتھ لے چلیں گے"۔

کردام نے قریب ہی پڑے ہوئے ترکش اور کمان اُٹھائے اور احمد کو لے کر مغرب کی طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں انولو نے پوچھا "کیا تم تلوار چلانا بھی جانتے ہو؟" احمد نے کہا۔ "ہاں، میں تلوار چلانا خوب جانتا ہوں"۔ ——— "تو پھر ہمیں بھی تلوار چلانا سکھا دو"۔ احمد نے کہا "پچھلی رات جو کوئی گمنام ہستی ہمیں نقدی کی تھیلی دے گئی ہے اس میں سے ہم آج شام ہی شہر کے بازار سے تین تلواریں خریدیں گے اور یہاں بکریاں چراتے ہوئے میں تم دونوں کو تلوار بازی سکھایا کروں گا۔ اس طرح میری اپنی بھی مشق ہو جایا کرے گی"۔

تینوں باتیں کرتے ہوئے کوہستانِ اطلس کی ایک بلند چوٹی پر آئے اور کردام نے چلّا کر احمد سے کہا۔ "سمرون! سمرون! اِدھر نیچے ڈھلان میں دیکھو"۔ احمد نے جب دیکھا تو وہاں جنگلی بکریاں چر رہی تھیں۔ احمد نے کردام سے کمان اور ترکش لے لیے اور ان دونوں سے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ"۔ جب وہ اس ڈھلان میں گئے تو جنگلی بکریاں بدک کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔

احمد نے تیر چلا پر چڑھا کر نشانہ باندھا پھر تاک کر مارا۔ تیر ایک بکری کی اگلی ٹانگ میں پیوست ہو گیا اور وہ لنگڑا کر چلنے لگی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے احمد نے دو اور تیر چلا دیے اور بکری لڑکھڑا کر ڈھلان میں گر گئی۔ کردام اور انولو حیرت و استعجاب سے احمد کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

کُردام نے توصیفی انداز میں احمد سے کہا۔ "تمہارا نشانہ کیسا بے خطا ہے۔ کاش میں بھی تمہاری طرح اس فن کا ماہر ہوتا۔" پھر کُردام اور انولو بھاگ کر ڈھلوان میں گئے اور دونوں مل کر اس شکار کی ہوئی بکری کو لے آئے تھے۔

دوبارہ وہ تینوں بکری کو لے کر اپنے ریوڑ کے پاس آئے۔ وہاں احمد نے انولو کے خنجر سے بکری کو ذبح کیا۔ احمد اور کردام کھال اتارنے لگے جب کہ انولو آگ روشن کرنے لگا تھا جب کھال اتر گئی اور آگ روشن ہو گئی تو وہ گوشت بھوننے لگے۔ ساتھ ساتھ احمد ان دونوں بھائیوں کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات بھی سناتا جا رہا تھا۔ جنہیں سن کر کردام اور انولو متاثر دکھائی دے رہے تھے۔

جنگلی بکری کا گوشت بھون کر کچھ انہوں نے کھایا اور باقی ماندہ شام کے لیے رکھ لیا تھا۔ وہاں سے اٹھتے ہوئے احمد کی نظر اچانک ایک بڑی اور بلند عمارت پر پڑی جو سیاہ پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ وہ عمارت کوئی معبد لگتی تھی اور اردیہ شہر سے قریب ہی گھنے درختوں کے جھنڈ میں ابھری ہوئی تھی۔

اس عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احمد نے کردام سے پوچھا۔ "کردام! کردام! یہ عمارت کیسی ہے؟ یہ کسی کا محل ہے یا معبد، ایسا لگتا ہے گویا یہ عمارت ویران پڑی ہو۔" کردام اور انولو دونوں خوفزدہ نگاہوں سے اس عمارت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر کردام نے پریشانی سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے سہمی سہمی آواز میں کہا۔

"سمرون! یہ کسی کا محل نہیں ایک پرانا اور قدیم معبد ہے۔ بربروں کے بادشاہ کسیلہ کے اجداد میں سے ایک شخص ایکارز تھا اس نے یہ معبد تعمیر کرایا تھا اور اسی کے نام سے اس معبد کو ایکارز کا معبد کہتے ہیں۔"

ذرا رک کر کردام نے پھر کہا۔ "یہ معبد برسوں سے ویران پڑا ہے۔ یہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ برسوں پہلے ایک روز رومنوں کا جنگی دیوتا مارس دریائے لاغوت سے نکل کر اس معبد میں داخل ہوا تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ غضب کی حالت میں تھا اور کسی بات پر خفا تھا۔ جب سے وہ اس معبد میں داخل ہوا، لوگوں کا کہنا ہے کہ جو بھی اس

معبد کی طرف جاتا ہے، مارا جاتا ہے۔ کئی لوگ اس معبد کی طرف مارس دیوتا کو دیکھنے گئے لیکن ان سب کی لاشیں معبد کے ارد گرد درختوں پر لٹکتی نظر آئی تھیں۔"

احمد نے حیرت سے کردام کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ بربر بھی رومن دیوتاؤں کو مانتے ہیں؟" کردام نے ہمدردی سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں ان میں سے اکثر رومن دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں۔ ان پر رومنوں کا بہت اثر ہے کبھی ان سارے علاقوں پر رومنوں کی حکومت تھی۔ اب بھی شمال مغربی افریقہ کے وسیع علاقوں پر رومنوں کی حکومت ہے یہاں کسیلہ کے شہر اردیہ میں بھی کافی رومن ہیں۔ اس شہر سے باہر جنوب اور مغرب میں دو بڑی بڑی چھاؤنیوں میں کسیلہ کے لشکر رہتے ہیں اور رومن انہیں جنگی تربیت دیتے ہیں۔"

احمد کھڑا چند لمحوں تک سوچتا رہا پھر دوبارہ اس نے پوچھا۔ "ان کے کتنے دیوتا ہیں؟" کردام نے ایکارز کے قدیم معبد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ان کے کئی دیوتا ہیں، جن میں سے کچھ کے نام مجھے آتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا دیوتا جیوپیٹر ہے۔ یہ دیوتاؤں کا دیوتا ہے اور اس کی حیثیت یونانیوں کے دیوتا زیوس جیسی سمجھی جاتی ہے۔ ان کا جنگی دیوتا مارس روشنی کا دیوتا متھراس، مکانوں کا دیوتا لار ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی کچھ دیویاں بھی ہیں جیسے اوما دیوی، یہ بڑی غضبناک دیوی ہے دوسری ڈائنا ہے۔ یہ چاند، فطرت اور شکار کی دیوی ہے اور اس کی حیثیت یونانی دیوی آرتمیس جیسی ہے ان کی سب سے حسین، خوب صورت اور دل پسند دیوی وکٹوریہ ہے۔ یہ فتح اور خوش حالی کی دیوی ہے اور یہاں کے لوگوں میں بہت محبوب اور مقبول ہے۔"

کردام نے چونکتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں میں بھول گیا، ان کا ایک دیوتا مرکری بھی ہے اور یونانی دیوتا ہرمس کی طرح یہ تجارت اور پیغام رسانی کا دیوتا ہے۔" کردام کے خاموش ہونے پر احمد کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا پھر وہ ان دونوں بھائیوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے لگا تھا۔ شاید وہ ان دونوں کو اسلام کی حقیقت سے روشناس کرانے کا تہیہ کر چکا تھا۔

اس روز شام ہونے پر جب وہ ریوڑ کو ہانکتے ہوئے باڑے میں لائے تو داروغہ

یہود تھ کا بیٹا فریس بھاگتا ہوا باڑے میں داخل ہوا اور انولو کو مخاطب کر کے پوچھا۔ "یہ تم نے کپڑے میں لپیٹ کر کیا چیز اُٹھا رکھی ہے؟"

انولو نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔ "یہ بھنا ہوا گوشت ہے"۔ فریس نے اپنے پورے جلادی پن میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے آج پھر تم نے ایک بکری نقصان کر دی"۔ کرمام نے فوراً اپنے بھائی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے ریوڑ کی بکری کا نقصان نہیں کیا تم گن سکتے ہو۔ یہ ہم نے کوہستان اطلس کی ایک جنگلی بکری شکار کی تھی۔ اس کا گوشت بھون کر آدھا ہم نے کھایا اور آدھا بچا لیا تھا"۔

فریس نے ہنس کر کہا۔ "تم میں سے کوئی شکار کرنا اور تیر ہدف پر مارنا نہیں جانتا۔ پھر یہ بکری تم نے کیسے اور کیونکر شکار کر لی؟" باڑے میں اب کئی دوسرے لوگ بھی آ جمع ہوئے تھے۔ ان میں فریس کا باپ یہود تھ، کسیلہ کے محل کا یہودی خازن آموص، کچھ پہریدار اور بچے بھی شامل تھے۔

احمد نے اپنے گلے میں لٹکتی کمان اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "میں ہدف پر تیر مارنا جانتا ہوں۔ تم کسی چیز کی طرف اشارہ کرو اگر میرا چلایا ہوا تیر سنسناتا ہوا اسے چھید نہ ڈالے تو جو چور کی سزا وہی میری سزا"۔

فریس نے آگے بڑھ کر احمد کے منہ پر طمانچہ مارتے ہوئے کہا۔ "تم کل آئے ہو اور آج اس قدر باتیں بنانے لگے ہو"۔ جواب میں احمد نے کمان دوبارہ کندھے سے لٹکا کر فریس کے منہ پر طمانچہ دے مارا تھا۔

فریس آگے بڑھا اور احمد کو کمر سے پکڑ کر زمین پر پٹخ دینا چاہا لیکن احمد نے اپنے بازو پھیلا کر فریس کی گرفت کو ڈھیلا کر کے اپنا آپ بچا لیا تھا۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے گتھ کر لڑنے لگے تھے۔ اچانک فریس نے ایک پتھر اُٹھا کر احمد کے کندھے پر دے مارا جس سے لڑکھڑا گیا۔ فریس نے فوراً آگے بڑھ کر اسے گرا لیا اور اس کی چھاتی پر سوار ہو بیٹھا۔ یہود تھ نے آگے بڑھ کر فریس کو بازو سے پکڑ کر علیحدہ کیا۔ احمد بھی کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے اس نے غصیلی آواز میں فریس کو مخاطب کر کے کہا۔

"خود پر قابو رکھو اور اپنے آپ میں رہو۔ لڑائی کا یہ کھیل میرے ساتھ کھیلو گے تو ہار جیت بھی ہو گی۔ تیری اور میری عمر کا فرق ابھی تمہیں مجھ پر مسلط کیے ہوئے ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ فرق ختم ہو جائے گا اور تو میری گرفت میں ہو گا"۔

یہود تھ بازو سے پکڑ کر فریس کو اپنے گھر لے گیا۔ اندر سے اس کی ماں بھی نکل آئی تھی۔ یہود تھ نے اپنی بیوی اور فریس کی ماں کو مخاطب کر کے کہا۔ "اسے سمجھاؤ کہ اس نئے آنے والے عرب لڑکے سے لڑائی جھگڑا نہ کیا کرے۔ یہ بالغ ہے جب کہ وہ ابھی نابالغ آج وہ اس کے ہاتھوں پٹ جاتا ہے لیکن مجھے خدشہ ہے کہ کل کو وہ بڑا ہو کر اس کی کھال ادھیڑ دے گا"۔

فریس نے غصیلی آواز میں کہا۔ "اے باپ! اسے کیونکر جرأت ہو سکتی ہے کہ مجھے مارے۔ میں اس سے طاقتور ہوں"۔ یہود تھ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں آنے والے وقت سے ڈرتا ہوں بیٹے! جب وہ بڑا ہو کر ضبط کا غلاف اور اپنی ذات کا لبادہ اُتار پھینکے گا۔ اس روز وہ برسوں کا جمود توڑ دے گا اور اپنی زندگی کی پوری تمازت سے وہ تیرے لیے حالات کا جبر، سوچوں کا طوفان اور زندگی کا عذاب بن جائے گا"۔

فریس نے ہنس کر کہا۔ "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں اس کی ہڈیاں توڑ کر اسے اپاہج و مفلوج کر دوں گا وہ جوان ہو کر بھی مجھ سے طاقتور اور زوردار نہیں ہو سکتا"۔

یہود تھ نے پھر سنجیدگی سے کہا۔ "سب کچھ ہو سکتا ہے بیٹے! لڑائی کے دوران میں نے اس کے چہرے پر اپنی جوانی کی طرف بھاگتے ہوئے ایک جلاد اور قاتل کی سی سنگینی دیکھی تھی۔ وہ ایک ایسی راکھ ہے جس کے نیچے چنگاریاں ہیں جو کبھی بھی سلگ کر شعلے کی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔ یاد رکھو وہ عرب ہے اور میں عرب کی فطرت کو خوب جانتا ہوں اگر تم اس سے پیار کرو گے تو وہ کتے کی طرح تمہارا وفادار رہے گا اور اگر تم عرب سے دشمنی رکھو گے تو وہ اونٹ کی طرح کینہ پرور بن کر اپنا انتقام لے گا۔ میں اپنی جوانی کے دور میں چند عرب تاجروں میں رہا ہوں۔ وہ بات بات پر تلوار کھینچ کر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اپنے اس تجربے کی بنا پر میں تمہیں سمر وان کے ساتھ صلح کا برتاؤ کرنے

کی تلقین کرتا ہوں۔ کل کو تم اس محل کے داروغہ بنو گے۔ اس طرح وہ تمہارا مطیع اور فرمانبردار بن کر رہے گا۔"

فریس نے کہا۔ "میں آپ کے تجربے کو غلط ثابت کر دوں گا۔ میں طاقت اور جبر سے اسے اپنا مطیع بنا کر رکھوں گا۔ اگر اس عرب نے میرے سامنے سرکشی کی تو میں اسے مست اُونٹ کی طرح نکیل ڈال کر اپنے ضبط اور نظم میں رکھوں گا۔" فریس اپنی ماں کا بازو پکڑ کر کمرے میں چلا گیا اور آموص سوچوں میں کھو گیا تھا۔

احمد فریس سے لڑائی کے بعد کردام اور انولو کے ساتھ اپنی کوٹھڑی کی طرف جانے لگا تو کسیلہ کے یہودی خازن آموص نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔ "سمرون! سمرون! رکو میری بات سنو!" احمد رُک گیا۔

آموص قریب آیا اور بڑی شفقت سے اپنا ہاتھ احمد کے کندھے پر رکھتے ہوئے اس نے انتہائی مہربانی سے کہا۔ "اے اجنبی فرزند! میرا نام آموص ہے اور میں کسیلہ کا خازن ہوں۔ تمہاری طرح میں بھی عرب ہوں اور یہودی مذہب کا پیروکار ہوں۔"

احمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ "آپ کب سے یہاں ہیں؟" آموص نے پیار سے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ "میں عرب کے شہر یثرب کا رہنے والا ہوں۔ جب مسلمانوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا تو میرا باپ وہاں سے بھاگ کر یہاں کسیلہ کے باپ کے پاس چلا آیا۔ کسیلہ کا باپ میرے باپ کا جاننے والا تھا کیونکہ تجارت کی خاطر وہ اکثر ادھر آیا کرتا تھا۔ کسیلہ کے باپ نے اسے اپنا خازن مقرر کر دیا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے بیٹے کسیلہ نے بھی میرے باپ کو اپنا خازن بنائے رکھا۔ دس برس گزرے میرا باپ مر گیا۔ اب میں کسیلہ کا خازن ہوں۔"

آموص نے ذرا چُپ رہ کر اور زیادہ ہمدردی سے کہا۔ "بیٹے! میں جانتا ہوں ان غم آلود فضاؤں میں اُٹھتی لہر کی طرح تم پر مظالم ہوتے رہیں گے لیکن تم انہیں صبر اور پُرخلوص کرب کے ساتھ برداشت کرتے رہنا۔ ایسا کرو گے تو سانچوں میں ڈھل کر کندن ہو جاؤ گے۔ اس روز دھندلی فضاؤں کے آسیب مٹ جائیں گے اور وقت

اپنے تمام دل پسند مناظر کے ساتھ تمہاری گرفت میں ہو گا۔"

احمد نے چھاتی تانتے ہوئے کہا۔ "اس بدیسی سرزمین کے اندر میں ہمت نہیں ہاروں گا۔ یہاں کے حالات مجھے میری حیات کو مرتعش کر کے مجھے شکست سے دوچار نہ کر سکیں گے۔ ایک روز میں جبر کرنے والوں کے لیے عذاب بن کر برسوں!" اور وہ میرے سامنے کھوکھلے تنکے کی طرح کھڑے ہوں گے۔"

آموص اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مسکراتا ہوا چلا گیا۔ احمد کردام اور انولو کے ساتھ جب اپنی کوٹھڑی میں آیا تو اس نے دیکھا وہاں کھانے کے علاوہ اس کے لیے ایک نیا لباس بھی رکھا پڑا تھا۔ احمد سوچوں میں کھو گیا۔ پھر کردام اور انولو کے ساتھ اس نے کھانا کھا کر نیا لباس پہن لیا اور بازار جا کر وہ اپنے لیے تلواریں، ڈھالیں، کمان اور تیر لے آئے تھے۔

اب وہ ہر وقت رات کو باڑے میں جنگی قواعد کی مشق کرتے اور دن کو کوہستان اطلس کی وادیوں میں گھڑسواری میں مہارت حاصل کرتے۔ اس طرح وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ کوئی ہر روز صبح و شام احمد اور اس کے ساتھیوں کے لیے کھانا رکھ جاتا تھا۔ اس نے اس راز کو جاننے کی کئی بار کوشش کی لیکن وہ یہ جاننے میں ناکام رہا کہ کھانا اس کے لیے کون چوری چھپے رکھ جاتا ہے۔ بہر حال احمد سمرون کے نام سے پردیس کا دکھ اور فریس کی مار سہتا رہا اور وقت پر لگا کر اُڑتا رہا۔





بنو کندہ کے عرب مصر میں آ کر فرعونوں کے شہر منف کے قریب خوب آباد ہو گئے تھے۔ خیموں کی زندگی ترک کر کے انہوں نے اپنے لیے گارے اور پتھر کے پختہ مکان بنا لیے تھے۔ منف کے کھنڈرات کے اِرد گِرد انھوں نے بنجر پڑی ہوئی زمین کو بھی آباد کر لیا تھا۔ احمد کے باپ حشم اور ماموں ہرثم نے بھی وہاں آ کر کھیتی باڑی شروع کر دی تھی۔ انہوں نے دو اونٹ خرید لیے تھے جن سے وہ زمین کو جوتتے تھے۔

ایک روز حشم اور ہرثم کھیتوں میں ہل چلانے کے بعد جب گھر واپس آئے تو انہوں نے دیکھا احمد کی ماں امیصا اپنے گھر کے صحن میں بیٹھی بَین کرتی ہوئی رو رہی تھی وہ بار بار اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھاتی اور غم کی تاریک چادر میں لپٹی اپنی آواز میں کہتی۔

"اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو مجھے کیوں بھول گیا۔ میری دعا سن! تو صدف کو موتی اور پتھر کو گوہر دیتا ہے، میرا بیٹا مجھ سے مِلا۔ میرا احمد مجھے واپس لوٹا!"

امیصا کے اِرد گِرد احمد کے بھائی شیبان اور خصیب اور اس کی منسوبہ طروب کھڑے

تھے وہ تینوں خود بھی رو رہے تھے اور امیصا کو سنبھالنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔

اپنے اونٹوں سے جوے اور پلان اتارنے کے بعد حشم بن بکر اور ہرثم بن لیث بھی وہاں آ کھڑے ہوئے۔ چند لمحوں تک ویران کھڑے وہ یہ منظر دیکھتے رہے پھر حشم نے آگے بڑھ کر امیصا کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "کب تک احمد کو پکارتی رہو گی اور کب تک یوں اپنا آپ چھوڑ کر روتی رہو گی؟"

امیصا نے ایک نظر اپنے شوہر پھر بھائی پر ڈالی اور چٹیل میدانوں کی طرح ویران آواز میں کہا "تم دونوں نے اپنے آپ کو اپنی ذات کے حصار میں بند کر کے اپنے ہونٹوں پہ مہر لگا کر دِل کو پتھر کر لیا ہے۔ تم دونوں اسے بھولتے جا رہے ہو لیکن میں سورج کے اُجالے اور رات کے سناٹے میں اس کی سلامتی اور واپسی کی دعائیں مانگتی رہوں گی۔ ایک نہ ایک دن فاصلے اور دوریاں کٹ جائیں گی، یادوں کی آوازیں لوٹ کر آئیں گی اور احساس کی تشنگی ختم ہو جائے گی۔"

امیصا کی باتوں پر حشم بن ابی بکر کسی بوڑھے پیپل کی طرح اُداس ہو گیا اور تڑپ کر اس نے کہا۔ "امیصا! امیصا! یہ تمہاری بھول ہے۔ احمد میری خوشبو، میری نمی اور میری روشنی ہے اس کے بغیر میں بے باس پھول، خشک کنواں اور ایسا چراغ ہوں جس میں تیل ختم ہو گیا ہو۔ خدا کی قسم! اس کے بغیر میں اپنی زندگی کے ایام بڑے کرب اور انتہائی دکھ سے گزار رہا ہوں۔ میں کل ہی اس خانقاہ کی طرف جاؤں گا جہاں ہمارے کارواں پر ڈاکوؤں نے شب خون مارا تھا، ہو سکتا ہے احمد دوسرے بچّوں کے ساتھ اس خانقاہ میں لوٹ آیا ہو۔ اس کے علاوہ اس خانقاہ کے راہبوں کو میں کہہ کر آیا تھا کہ میں ان کے پاس آتا جاتا رہوں گا۔"

حشم جب خاموش ہوا تو ہرثم نے آگے بڑھ کر امیصا کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے میری بہن! احمد تو مجھے تم دونوں میاں بیوی سے زیادہ عزیز ہے اس لیے کہ وہ میرا بھانجا ہی نہیں میری اکلوتی بیٹی کا منسوب بھی ہے۔ اس کی یہاں موجودگی میں اپنے آپ کو میں اس چوراہے پر کھڑا دیکھتا تھا جہاں سے کئی راستے بلندیوں اور رفعتوں کو جاتے تھے

لیکن آہ ! اب اس کے بغیر میری حالت مفلس کے اس جھونپڑے جیسی ہے جس کی چھت اور دیواریں تیز طوفانوں کا شکار ہو گئی ہوں۔"

امیصا نے حشم اور ہرثم کی حالت دیکھ کر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور ان دونوں کے لیے کھانا نکالنے لگی تھی۔



دوسرے روز حشم بن ابی بکر صبح سویرے کھجور کے پتوں سے بنے ہوئے چھپر تلے اپنے گھوڑے پر زین ڈال رہا تھا۔ ہرثم، امیصا، شیبان، خصیب اور طروف اس کے اِردگرد کھڑے تھے۔ گھوڑے کا تنگ کسنے کے بعد اس نے اپنی کمر سیدھی کی اور ہرثم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہرثم ! ہرثم ! میں جلدی لوٹنے کی کوشش کروں گا۔ میری غیر موجودگی میں شیبان اور خصیب کو ساتھ لے کر جو زمین رہ گئی ہے اس میں بیج ڈال دینا۔ سب مل کر دُعا بھی کرنا کہ میرا بچہ مجھے مِل جائے۔ کاش ہم نے وادی طوٰی میں پڑاؤ نہ کیا ہوتا تو میرا بیٹا مجھ سے چھن نہ جاتا۔"

نیچے جُھک کر حشم بن ابی بکر نے شیبان، خصیب اور طروب کو پیار کیا پھر اس نے ہرثم سے مصافحہ کیا آخر میں ہمدردی اور درد مندی کی ایک نگاہ اس نے اپنی بیوی امیصا پر ڈالی اور گھوڑے پر سوار ہو کر وہ گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ بستی کے اندر وہ گھوڑے کو درمیانہ روی سے چلاتا رہا لیکن باہر نکل کر اس نے گھوڑے کی رفتار تیز کر لی تھی۔

فرعون[1] کے باہر اپنے شہر منف کے کھنڈرات میں سے گزرتے ہوئے حشم نے اپنے گھوڑے کی رفتار بالکل سست کر لی تھی۔ فرعون کے ان کھنڈرات کو وہ بڑی عبرت اور سبق آموزی کے ساتھ دیکھنے لگا تھا۔ ذرا آگے بڑھ کر حشم بن ابی بکر نے اپنے گھوڑے کو روک لیا اور نیچے اُتر کر وہ ایک محل نما عمارت کے کھنڈرات کو بڑے غور سے دیکھنے لگا تھا یہ کھنڈرات دلوکا[2] کے طلسمی مکان کے تھے۔ حشم تھوڑی دیر تک ان کھنڈرات میں گھوم

[1] فرعونِ موسیٰ کی موت کے بعد مصر میں ایک عورت حکمران ہوئی۔ اس نے

پھر کر متاثر ہوتا رہا۔ دوبارہ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے ایڑ لگا کر شمال مشرق کے رُخ پر سرپٹ دوڑانے لگا تھا۔

ایک روز صبح ہی صبح حشم وادی طوٰی میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا جبلِ سینا کے دامن اور وادی طوٰی میں دُور دور تک خیمے نصب تھے۔ ایسا لگتا تھا وہاں کسی لشکر نے پڑاؤ کر رکھا ہو۔ ان خیموں کے اندر سے جگہ جگہ دھواں اُٹھ رہا تھا۔ شاید وہ لوگ اپنا صبح کا کھانا تیار کر رہے تھے۔

حشم نے اس لشکر سے دُور رہ کر اور ایک لمبا چکّر کاٹ کر جبل سینا کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا وہ کوہستانِ سینا پر چڑھا۔ کیتھرین کی خانقاہ کے سامنے وہ اپنے گھوڑے کو روک کر نیچے اُتر گیا۔ گھوڑا اس نے ہری ہری گھاس چرنے کو کھلا چھوڑ دیا اور خود وہ خانقاہ میں داخل ہوا۔ خانقاہ کے راہب اور راہبائیں اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ حشم خانقاہ کے رئیس اسی بوڑھے راہب کی طرف بڑھا جس سے ہرثم کے ساتھ ایک بار پہلے بھی وہ مِل چکا تھا۔

قریب جا کر حشم نے احترام ملحوظ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "اے مقرب راہب ! کیا آپ نے مجھے پہچانا ؟" راہب چند لمحوں تک غور سے حشم کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے بوڑھے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یقیناً میں نے تمہیں پہچان لیا۔ تم اپنے بیٹے کی تلاش میں ایک بار پہلے بھی مجھ سے مل چکے ہو۔ مجھے افسوس ہے عربوں کے اغوا ہونے والے بچّوں میں سے کوئی بھی لوٹ کر اِدھر نہیں آیا۔"

حشم کی گردن جُھک گئی اور وہ کسی بوڑھے پیپل کی طرح اُداس اور غمزدہ دکھائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۴۶) دلوکا نام کی ایک ساحرہ کی مدد سے ایک طلسمی محل تعمیر کرایا جس میں وہ اپنے دشمنوں کی تصویریں رکھتی تھی۔ دلوکا اپنے سحر کے زور سے ان تصاویر پر جو اثرات کرتی تھی وہی اثرات اس کے دشمنوں پر بھی ہوتے تھے۔ اس محل کا نام دلوکا کا محل تھا۔

دینے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر فاصلے اور دوریوں کی گرد اور آنکھوں میں بےبسی اور مایوسی کی دھول اُڑنے لگی تھی۔ دوبارہ راہب کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے خستہ اور نیم جان حالت میں کہا۔ "میں اندھیرے میں اُمید کی ایک کرن لے کر آیا تھا۔ آہ مجھے مایوسی ہوئی۔"

راہب نے اسے تسلی دینے کی خاطر کہا۔ "ہمت کرو، وقت کے ساتھ جدائی کے یہ زخم بھی بھر جائیں گے۔"

حشم کی حالت اس مسافر کی کہانی جیسی ہو گئی تھی جس کا دامن تار تار ہو چکا ہو۔ پھر اس کی سسکتی آواز بند کمرے میں لرزتی صدا کی طرح سنائی دی "میری حالت اس آوارہ بدلی جیسی ہے جسے پانی کی تلاش ہو۔ کاش میں اپنے بیٹے کی حفاظت کر سکتا۔ جدائی کے زخم ضرور بھر جائیں گے پر داغ تو باقی رہیں گے۔"

راہب نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ "حوصلہ رکھو! کبھی نہ کبھی تمہارا بیٹا ضرور تمہیں ملے گا۔ تم ایک طویل سفر کر کے آ رہے ہو۔ آؤ یہاں لیٹ کر آرام کرو۔ میں تمہارے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

حشم راہب کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "نیچے وادی شعیب میں کوئی بہت بڑا لشکر خیمہ زن ہے۔ کیا تم لوگوں کو خبر ہے کہ وہ لشکر کس کا ہے؟" راہب نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "وہ لشکر مسلمانوں کا ہے۔ دمشق کی طرف سے آیا ہے اور افریقہ کی طرف جائے گا۔ اس کا سپہ سالار عقبہ بن نافع ہے اور یہ لشکر افریقہ فتح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

راہب کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "تم بیٹھو میں تمہارے لیے کھانا لاتا ہوں۔" راہب خانقاہ کے اندر چلا گیا۔ حشم اُٹھ کر خانقاہ کے چشمے پر ہاتھ منہ دھونے لگا تھا جب کہ قریب ہی اس کا گھوڑا گھاس چر رہا تھا۔

ایک روز سہ پہر کے قریب حشم بن ابی بکر مایوس و نامراد گھر لوٹا تھا۔ اس وقت ہرثم، امیصا دونوں بہن بھائی شیبان، خصیب اور طروب کے ساتھ صحن کی کھجوروں تلے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شیبان نے بھاگ کر اپنے باپ کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی تھی حشم نے اسے گھوڑے کی باگ دے کر ٹوٹی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "شیبان! شیبان! اس

کی زین مت اُتارنا بیٹے!"

شیبان گھوڑا لے کر وہیں کھڑا ہو گیا۔ اتنی دیر تک امیصا بھی اُٹھ کر قریب آ گئی تھی اور مجروح سی آواز میں اس نے پوچھا۔ "کیا احمد کے متعلق کچھ خبر ملی؟" حشم کی گردن جھک گئی اور لرزتی بکھرتی آواز میں اس نے کہا۔ "افسوس! میں ناکام لوٹا ہوں لیکن اس کے ساتھ میں ایک ارادہ بھی کر چکا ہوں۔ ہمارا ایک لشکر جس کا سپہ سالار عقبہ بن نافع ہے افریقہ پر حملہ آور ہونے کو جا رہا ہے۔ اس لشکر نے وادی شعیب میں قیام کر رکھا تھا اور میں دریائے نیل تک اس لشکر کے ساتھ آیا ہوں۔ میں باہر ہی باہر چلا جاتا لیکن میں نے تم لوگوں سے ملنا ضروری سمجھا۔ میں اس لشکر کے ساتھ جاؤں گا اور اپنے رب کی راہ میں جہاد کرنے کے علاوہ افریقہ کے گمنام علاقوں میں اپنے بیٹے کو بھی تلاش کروں گا۔"

امیصا اس کے اس ارادے پر کچھ اُداس ہو گئی تھی۔ حشم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا پختہ ارادہ ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی، میں ابھی یہاں سے روانہ ہوں گا۔ ہو سکتا ہے میرا یہی ارادہ میرے بیٹے کے ملنے کی وجہ بن جائے۔"

امیصا کی گردن جھک گئی اور وہ طروب کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر چلی گئی تھی۔ دونوں نے مل کر اس کے لیے زادِ راہ تیار کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حشم بن ابی بکر اپنے گھر سے نکل کر دریائے نیل کے کنارے کنارے شمال کی طرف اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا رہا تھا شام ہونے سے پہلے ہی پہلے وہ لشکر میں شامل ہو گیا تھا۔



۶۲ ھ کا آغاز تھا۔ فسطاط کی سیدھ میں دریائے نیل کو عبور کرنے کے بعد عقبہ بن نافع اپنے لشکر کے ساتھ برق رفتاری سے مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔

لشکر تین حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ خود لشکر کے سپہ سالار عقبہ بن نافع کے پاس تھا۔ دوسرا حصہ ایک مشہور عرب جرنیل زہیر بن قیس بلوی کی کمانداری میں تھا اور یہی حصہ لشکر کا ہراول بھی تھا۔ تیسرا حصہ ایک اور جرنیل حنش بن عبداللہ صنعانی کے ماتحت تھا۔

عقبہ بن نافع نے اپنے جاسوس پہلے ہی مغرب کی طرف روانہ کر رکھے تھے تاکہ وہ اسے قبل از وقت دشمن کی نقل و حرکت اور اس کے ارادوں سے آگاہ کرتے رہیں حنشم بن ابی بکر زہیر بن قیس کے تحت ہراول دستوں میں شامل ہوگیا تھا۔

برقہ شہر تک یہ کوچ کسی مزاحمت کے بغیر جاری رہا۔ اس شہر میں داخل ہونے کے بعد عقبہ نے یہاں کا نظم و نسق مضبوط کیا اور دو روز وہاں قیام کرنے کے بعد وہ آگے بڑھ گیا تھا برقہ شہر پر پہلے ہی مسلمان قابض تھے۔ یہاں یہود اور نصرانیوں کی نسبت مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی لہٰذا عقبہ بن نافع کی آمد پر کسی نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔ اس کے بعد عقبہ بن نافع بلنس، باغایہ، عمارہ اور طنجہ شہروں کو فتح کرتا ہوا سمندر کے کنارے کنارے مغرب کی طرف کوچ کرتا ہوا بحیرہ محیط کی طرف بڑھنے لگا تھا۔



احمد کو اس اجنبی سرزمین میں رہتے ہوئے چھ برس ہوگئے تھے۔ اب وہ جوان ہو چکا تھا اس دریا کی طرح جس میں سیلاب آگیا ہو اور وہ کناروں سے باہر ہو کر بہہ نکلا ہو اس کے چہرے پر جوانی کی رنگین قوسوں کا ابھار بکھر گیا تھا اور وہ ایسا بھرپور جوان اور تنومند ہوا تھا جیسے اڑتے اور تند لمحوں کی کوئی مکمل اور دل آفریں داستان۔

عقبہ بن نافع کے حملہ آور ہونے سے کسیلا اور قرب و جوار کے دیگر افریقی حکمرانوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی اور وہ مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہونے کے لیے بڑی تیزی سے اپنے لشکر مرتب کرنے لگے تھے۔

احمد، کردام اور انولو کے ساتھ بکریوں کے اسی باڑے میں رہتا رہا۔ کردام اور انولو، احمد کی تبلیغ پر اسلام قبول کر چکے تھے اور اب وہ چوری چھپے اپنی کوٹھڑیوں میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ احمد کے لیے ابھی تک کوئی کھانا اور اس کی ضروریات کی دیگر اشیاء فراہم کر رہا تھا۔ احمد نے اس ہستی کو تلاش کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا کیونکہ اس کے لیے ضروریات زندگی فراہم کرنے والا اس وقت حرکت میں آتا تھا جب

احمد اور اس کے ساتھی گھر سے باہر ہوا کرتے تھے۔

ایک روز جب کہ کردام اور انولو عشاء کی نماز کے بعد سو چکے تھے احمد اپنی کوٹھڑی سے نکل کر صحن میں آیا۔ جب سے اس نے سنا تھا کہ افریقہ کے سارے حکمران عقبہ بن نافع کے خلاف متحد ہو رہے ہیں۔ وہ فکرمند رہنے لگا تھا اور بہت کم سوتا تھا۔ صحن میں آکر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ تاریک گہری رات میں ستاروں کے قافلے اپنی منزلوں کی طرف مائل بسفر تھے۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور بگولوں کے ہم سفر ریت کے گرد آلود فضاؤں میں اڑے جا رہے تھے۔

آسمان کی طرف دیکھتے دیکھتے احمد چونک پڑا۔ باڑے سے باہر اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ وہ چوکنا ہو گیا۔ اتنے میں دیوار کے اوپر سے کسی نے کوئی چیز اندر پھینکی۔ احمد نے فوراً دروازہ کھول کر دیکھا۔ اندھیری رات میں دیوار کے قریب ایک سرمئی سائے کی صورت میں کوئی کھڑا تھا۔ احمد کو باہر نکلتے دیکھ کر وہ سایہ ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔

احمد اس کے پیچھے بھاگا اور اس کے اوپر چھلانگ کر اس نے اسے دبوچ لیا لیکن جلد ہی وہ تڑپ کر علیحدہ ہو گیا کیونکہ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ سایہ کوئی نوخیز لڑکی ہے۔ اس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ لڑکی نے اپنا آپ چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن احمد اسے کھینچتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔

باڑے کے اندر لا کر احمد نے اسے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "جو کچھ تم نے دیوار کے اوپر سے پھینکا ہے اٹھاؤ وہ کیا ہے۔" لڑکی ایک طرف بڑھی اور اندھیرے کے اندر سے اس نے کوئی چیز اٹھالی۔ احمد اس کا ہاتھ پکڑے اپنے کمرے میں لایا اور دیوار کے ساتھ جلتی ہوئی مشعل کے قریب لا کھڑا کیا۔ روشنی میں جب اس نے لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ دنگ رہ گیا۔ وہ اپنی زندگی کے اس مرحلے میں تھی جہاں بچپن اور جوانی ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔

وہ حسین تھی، شبنم آلود چاندنی، جنگل میں چمکتے چاند، نوری موج اور صدائے سحر کی طرح احمد کے سامنے کھڑی وہ یوں لگ رہی جیسے ریت کے ٹیلوں پر چودھویں کی چاندنی بکھر کر پھیل گئی ہو۔ چھوٹی سی اس کوٹھڑی میں اس طلسم ماہ و انجم کی طرح حسین و دلکش لڑکی کا وجود ایسے ہی تھا جیسے چپکے چپکے بہار کا پہلا پھول کھل اٹھا ہو اور پورا باغ معطر ہو کر رہ گیا ہو۔

احمد سنبھلا اور لڑکی نے ہاتھ میں جو کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چھوٹی سی ٹوکری پکڑ رکھی تھی اس کی طرف دیکھا۔ اس میں تازہ پھل تھے۔ اس نے جواب طلب نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا " یہ ٹوکری تم نے دیوار کے اوپر سے اندر کیوں پھینکی تھی "۔

لڑکی نے سر اٹھا کر احمد کی طرف دیکھا کچھ کہنے کو اس کے سرخ اور خوبصورت ہونٹ دھیرے دھیرے کھلنے والے پھول کی طرح ہل رہے تھے۔ احمد نے اس بار ذرا سختی سے کہا " تم چپ کیوں ہو۔ منہ سے بولو۔ کیا تم گونگی اور بہری ہو؟ کیا آج تک میرے لیے کھانا اور ضرورت کی دوسری اشیاء بھی تم ہی میری کوٹھڑی میں لا کر رکھتی رہی ہو؟"

لڑکی کی گردن جھک گئی اور شرماتے ہوئے اس نے کہا " ہم عرب اور یہودی ہیں تم بھی عرب اور یہودی ہو لہٰذا میں ہی تم سے ان ہمدردیوں کا اظہار کرتی رہی "۔ لڑکی کی آواز ایسی تھی جیسے جھرنے کی چھن چھن، گھنگھروؤں کی چھنک یا چاندنی رات میں کسی حدی خوان کی صدا۔ لڑکی جب خاموش ہوئی تو یوں لگا جیسے ساز بج کر کھو گئے ہوں اور پائلیں بج کر چپ ہو گئی ہوں۔

احمد نے اس بار نرمی سے پوچھا " تم کون ہو، تمہارا نام کیا ہے اور تم کس کی بیٹی ہو؟ لڑکی کی حسن و نغمگی اور نرمی و گھلاوٹ سے بھرپور امرت برساتی آواز پھر بلند ہوئی۔

" میرا نام ایمن ہے۔ میرا باپ کسیلہ کے اس محل کا خازن ہے اور اس کا نام آموص ہے۔ میرے ماموں قرطاجنہ شہر میں رہتے ہیں۔ وہ مجھے اور میری ماں کو لینے آج یہاں آئے ہیں وہ کچھ تازہ پھل لائے تھے جن سے میں آپ کا حصہ بھی نکال لائی۔ میں آج تک بڑے سکون سے اپنا کام کرتی رہی پر آج آپ نے مجھے پکڑ لیا "۔

احمد نے ایمن کا بازو چھوڑ دیا اور گردن جھکاتے ہوئے کہا " تم مجھے آپ کہہ کر مخاطب کر رہی ہو۔ میں تو غلام ہوں میں ایسی عزت ایسے احترام کا کہاں حقدار ہوں "۔

ایمن نے بجھے ہوئے سے لہجے میں کہا " میرے بابا مجھے آپ کے متعلق سب کچھ بتا چکے ہیں۔ میں جانتی ہوں آپ کو اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے۔ آپ اس سے بھی زیادہ توقیر اور ترحم کے حقدار ہیں کہ آپ ہمارے ہم مذہب اور ہم قوم ہیں "۔

احمد نے مدھم سی آواز میں کہا " ایمن! ایمن! جاؤ گھر چلی جاؤ "۔ ایمن نے کھجور کے پتوں سے بنی وہ ٹوکری جو پھلوں سے بھری تھی اور جو اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی کوٹھڑی کے کچے فرش پر رکھ دی اور باہر نکل گئی۔ وہ چند قدم ہی دور گئی ہو گی کہ احمد نے اسے پکارا " ایمن! ایمن! ٹھہر جاؤ "۔ ایمن رکی اور مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ احمد قریب آیا اور کہا " باہر گہرا اندھیرا ہے۔ چلو میں تمہارے گھر تک تمہیں چھوڑ آتا ہوں "۔ ایمن نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ خاموشی سے احمد کے ساتھ ہو لی۔

ایمن کو اس کے گھر چھوڑ کر احمد جب لوٹا اور جونہی وہ باڑے میں داخل ہونے لگا۔ کسی نے پیچھے سے اس کی گردن اپنے ایک ہاتھ سے دبوچتے ہوئے زوردار آواز میں پوچھا۔ " اتنی رات گئے تم کہاں سے لوٹ رہے ہو "۔ احمد نے مڑ کر دیکھا۔ وہ خونخوار فریس تھا۔ وہی فریس جس سے وہ بچپن سے پٹتا اور مار کھاتا آ رہا تھا۔

احمد کے چہرے پر خوفناک توسوں کا ابھار مچلنے لگا تھا۔ فریس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے ایک عجیب سی لہر ایک انوکھے ترنگ اور بے نام سے کیف میں کہا " میری گردن چھوڑ دو ورنہ ـــــــ فریس نے احمد کی گردن پر اپنی گرفت اور مضبوط کرتے ہوئے اور اس کی گردن کو خوب زور کا جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا " ورنہ تم کیا کر لوگے؟

احمد نے اپنے پورے بھیانک پن میں کہا " میں اب بچہ نہیں جوان ہوں۔ میں تیرے ضمیر پر لہراتے بدی کے شر کے سایوں کو اور تیری تقدیر کے ہاتھوں کی لکیروں کو مٹا کر تجھے شکار کیے ہوئے جانور کی طرح لہو لہو کر دوں گا۔ اپنا ہاتھ ہٹا لو کہ اس اندھیری رات اور حدِ نظر اڑتی گرد کے اندر میرے لگائے زخم بے دوا اور میرے دیئے ہوئے چاک بے رفو ہوں گے "۔

فریس نے غصے کے عالم میں ایک بھرپور ضرب احمد کی پیٹھ پر لگاتے ہوئے کہا " تم میں ایسی تو قدرت نہیں کہ تم میرے لیے کوئی طوفان کھڑا کر سکو "۔ احمد اس تیزی اور جلادی پن سے مڑا جیسے شب کے سفاک عناصر زمین کو زخم زخم کرنے اور اس پر فنائے نقوش لگانے کو حرکت میں آتے ہیں۔ ایک سخت جھٹکے کے ساتھ اس نے اپنی گردن چھڑا لی، ساتھ ہی اپنے منہ سے ایک سخت اور بھیانک آواز نکالتے ہوئے اس نے فریس

پیٹ پر مُکا دے مارا - وہ پہلی بار یوں بے باک ہو کر فریس کے سامنے لڑنے کو جم گیا تھا، احمد کی فولادی ضرب کی تکلیف سے فریس کراہ اُٹھا اور لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا احمد نے طنز کرتے ہوئے کہا۔" فریس! فریس! میں نے کہا نہ تھا میں اب بچّہ نہیں ہوں میں آج تک تیرے ہاتھوں پٹتا اور مار کھاتا رہا اور اس پردیس میں میرا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا، اب تمہاری باری ہے ۔

فریس سنبھلا اور دوبارہ احمد پر حملہ آور ہوا - اب وہ جنگلیوں کی طرح اپنے منہ سے زور زور کی آوازیں نکالتا ہوا احمد پر حملہ آور ہو رہا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسیلہ کے محل میں رہائش رکھنے والے تمام خاندان باہر نکل کر ان کے گرد جمع ہو گئے تھے - ان لوگوں میں فریس کے ماں باپ کے علاوہ امین بھی اپنی ماں اور باپ کے ساتھ شامل تھی - محل کے کئی مسلح محافظ بھی ان کے گرد آ جمع ہوئے تھے ۔

فریس نے احمد کو زیر کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا - یوں لگتا تھا احمد ایک ایسا وقت تھا جو فریس کے ہاتھوں نکل چکا تھا - بڑے نپے تلے انداز میں وہ فریس پر حملہ آور ہو رہا تھا - اب وہ جوان تھا اور فریس کے سامنے نظر نظر نظارے اور قدم قدم قیامت کھڑی کر دینے کا عزم کر چکا تھا ۔

اچانک احمد نے ایک بل کھایا اور پُر تلاطم ہو کر اس نے لگاتار تین مُکے فریس کے پیٹ چہرے اور گردن پر دے مارے تھے - رات کے سرد اور پُرہول سناٹے میں اس کے مکّوں کی آوازیں یوں اُبھری تھیں جیسے کسی صومعہ کے ناقوس بجتے ہیں ۔

ایک دم کسی آتشی کرن کی طرح حرکت میں آیا - کسی بے کل شاہین اور بھوکے تیندوے کی طرح وہ فریس پر جھپٹا اور پل بھر میں اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر فضا میں بلند کر دیا - اب وہ بے بس فریس کو ہوا میں چکر دینے لگا تھا ۔

فریس کی حالت پر اس کی ماں پتھر کی طرح چپ، کسی شعبدہ گر کی طرح خاموش، ریت کے تپتے ٹیلے کی طرح ملول اور دُکھ کے گیت کی طرح غمگین تھی - فریس کا باپ یہودتھ بھی بے کراں صحرا کی طرح بکھرا بکھرا اور ٹوٹی ہوئی دہلیز کی طرح افسردہ تھا - دوسری طرف

امین کے چہرے پر گرمیوں میں برف کا پانی پینے کی سی راحت، پانی میں نہاتے ہوئے بُوٹوں کی سی دلکشی اور سرخ رنگوں پر چاندنی کے عکس جیسی تابداری تھی - احمد کے ہاتھوں فریس کے پٹنے پر وہ خوش رنگ لمحوں کی طرح پُرسکون اور ریگستان میں سُرخ اونٹوں کی قطاروں کی طرح پُرکشش ہو گئی تھی ۔

احمد نے فریس کو اس کے باپ یہودتھ کے پاؤں پر زور سے پٹختے ہوئے کہا۔" اسے سنبھالو! اسے اپنے ضبط اور گرفت میں رکھو۔ ورنہ میں اسے اُونٹ کی طرح نکیل ڈال دوں گا - اسے سمجھا دو کہ میں اب جوان ہو چکا ہوں - اگر اس نے مجھ سے اُلجھنے کا سلسلہ جاری رکھا تو میں اسے سسکتے لمحوں کی طرح موت کی قید میں ایسا دفن کر دوں گا جہاں یہ اپنی رُوح کا شور تک نہ سن سکے گا - اب میری رگوں میں جوانی کا لہو رقصاں ہے - ایسا نہ ہو فریس کے ضمیر اور میری تلوار کے درمیان فاصلہ سمٹ جائے - اگر ایسا ہوا تو اس کی لوحِ ازل میں ذلّت کے حروف کے سوا کچھ نہ رہے گا آج کے بعد اگر اس نے اپنے آپ کو نہ بدلا تو میں خنجر اور تلوار کی زبان سے اس سے گفتگو کرنے پر مجبور ہوں گا ۔

احمد پیچھے ہٹا اور جب اس نے اپنی پُشت کی طرف دیکھا تو وہاں کرم دام اور انولو یوں کھڑے تھے جیسے وہ بوقتِ ضرورت اس کی مدد کو کود پڑیں گے - یہودتھ نے فریس کو سنبھالا اور اسے سہارا دے کر اپنے گھر لے گیا - دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے ۔

کرم دام نے آگے بڑھ کر احمد کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے باڑے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔" سمرون! سمرون! تم نے ہمیں اسلام کی تبلیغ اور مسلمان کر کے خدا کا تصور اور آخرت کا یقین ہی رُوح کی لطافت اور احساس کی وکالت ہے - صالح خیال کی چمک اور نیک عزائم کی تابانی ہے - ہم بھی اب تمہاری طرح مسلمان ہیں - ہم دونوں بھائیوں نے آج فیصلہ کر لیا تھا کہ فریس نے اگر تمہیں پیٹا تو ہم مار مار کر اس کی ہڈیاں توڑ دیں گے لیکن تم نے آج ثابت کر دیا ہے کہ عرب جوان ہو کر اُونٹ کی طرح تناور اور گھوڑے کی طرح تنومند ہو جاتا ہے - کرم دام اور انولو، احمد کے ہاتھ تھامے باڑے کے اندر لے گئے تھے ۔



دوسرے روز سہ پہر کے قریب جب کہ احمد، کرم دام اور انولو کوہستانِ اطلس میں

کسیلہ کے ریوڑ کی نگہبانی کر رہے تھے۔ احمد چونک اُٹھا اس نے دیکھا سامنے ایکارز کے معبد کی قدیم عمارت سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اس نے پکارتے ہوئے کہا۔ "میرے گلہ بان ساتھیو! ادھر دیکھو۔ یہ ایکارز کے معبد سے آج دھواں کیسا اُٹھ رہا ہے۔ کردام اور انولوں دونوں بھائی پریشان دکھائی دینے لگے تھے۔ پھر کردام نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

"سمرون! سمرون! لگتا ہے آج پھر کسی پر دیوتاؤں کا غضب نازل ہوگا۔ اس معبد سے دھواں اُٹھنا مارس دیوتا کے غضب ناک ہونے کی علامت ہے اور جس روز دھواں اُٹھتا ہے اس روز اس معبد کے آس پاس ضرور کوئی مارا جاتا ہے۔"

احمد نے خفگی اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کیا مسلمان ہونے کے باوجود تم یقین رکھتے ہو کہ دیوتا حرکت میں آتے ہیں اور کسی کے نفع نقصان کا باعث بن سکتے ہیں۔" کردام اور انولو شرمندہ سے ہوکر خاموش رہ گئے تھے۔ احمد نے ایک عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میں آج اس معبد کے دھوئیں کا راز ضرور جاننے کی کوشش کروں گا۔ میں اس معبد کے اندر جاؤں گا اور دیکھوں گا۔ بُت پرستوں کا مارس دیوتا مجھے کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔" کردام نے چونک کر کہا۔ "سمرون! سمرون! اپنے اس فیصلے سے باز رہو ایسا نہ ہو ——— کردام خاموش ہوگیا۔

احمد نے اس کی تسلی کے لیے کہا "تم جانتے ہو میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ تم دونوں یہیں رہو میں معبد سے ہوکر آتا ہوں۔ یاد رکھو، میں مسلمان ہوں اور ایسی من گھڑت خرافات میرے مذہب، میرے عقائد کی ضد ہیں۔"

کردام نے بڑے خلوص سے کہا۔ "ہم تمہیں اکیلا نہ جانے دیں گے۔ اگر تم معبد میں جانے پر بضد ہی ہو تو ہم دونوں بھائی بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔ تاکہ اگر کوئی مصیبت آئے تو تینوں پر اکٹھی آئے۔" احمد نے اطمینان سے کہا۔ "اگر تم دونوں میرا ساتھ دینا چاہتے ہو تو میں تمہیں منع نہیں کروں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔"

ریوڑ کو وہیں چرتا چھوڑ کر وہ تینوں ایکارز کے معبد کی طرف بڑھنے لگے تھے سنسان اور ویران عمارت سے ابھی تک دھواں اُٹھ رہا تھا۔ جب وہ معبد کے پاس گئے تو انہوں نے

دیکھا وہ راستے جو ارد گرد شہر سے معبد کی طرف آتے تھے اُداس پڑے تھے اور ان پر گھاس اُگ آئی تھی لگتا تھا گویا برسوں سے اس معبد کی طرف کوئی نہ آیا ہو۔

وہ تینوں عمارت کے صحن میں داخل ہوئے۔ احمد آگے آگے تھا۔ کردام اور انولو ڈرتے ڈرتے اور سہمے سہمے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے۔ اُنہوں نے دیکھا صحن خوب صاف ستھرا تھا۔ لگتا تھا ویران ہونے کے باوجود کوئی اس کی صفائی کا خیال رکھتا ہو۔

صحن عبور کرکے وہ عمارت کے اندر داخل ہوئے۔ سامنے جیوپیٹر دیوتا کا بہت بُت کھڑا تھا۔ وہ سُرخ اور بھورے رنگ کے پتھر سے تراشا گیا تھا اور اونچائی میں بہت بڑا تھا۔ جیوپیٹر کے دائیں طرف مارس، متھراس، مرکری، اِلا اور دوسرے دیوتاؤں کے بُت کھڑے تھے۔ جب کہ بائیں طرف روما، ڈائنا، وکٹوریہ اور دیگر دیویاں کھڑی تھیں۔

احمد بلا جھجک آگے بڑھتا ہوا جیوپیٹر کے بُت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک وہ سُرخ رنگ کے اس بُت کو غور سے دیکھتا رہا پھر مڑ کر کردام اور انولو کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "آؤ تینوں مل کر اس بُت کو نیچے گرا کر توڑ دیں۔ اس کے ٹوٹنے پر یہاں کے لوگوں کا اس پر عقیدہ بھی ٹوٹ جائے گا ———

کردام اور انولو جواب میں کچھ کہنے والے تھے کہ معبد کے اندر ایک بھیانک اور خوفناک قہقہہ بلند ہوا اور پھر ایک ساتھ کئی زوردار اور انتقامی قہقہے بلند ہوئے۔ پوری عمارت ان وحشی قہقہوں سے گونج اُٹھی تھی۔ کردام اور انولو دہشت کے مارے خوف زدہ ہوگئے تھے۔ احمد کا چہرہ غصے میں انتہائی غضب ناک ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی تلوار کھینچ لی اور غضب ناک آواز میں چلا کر اس نے کہا۔

"تم جو کوئی بھی ہو میرے سامنے آؤ۔ میں تمہارے ان خوفناک قہقہوں کو تمہاری کربناک آہوں اور سسکیوں میں بدل دوں گا"۔ احمد کے جوان چہرے پر ایک عزم اور اس کے بھرپور اور تناور جسم میں ایک ثابت قدمی تھی۔ وہ خوفناک قہقہے فوراً تھم گئے تاہم احمد کی غضب ناک اور غصیلی آواز کی بازگشت ابھی تک معبد کے اندر گونج رہی تھی۔

کردام اور انولو نے بھی اپنی تلواریں بے نیام کرلیں اور احمد کے دائیں بائیں دونوں

بھائی جم کر کھڑے ہو گئے تھے ۔ اب ان دونوں نے بھی اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مارس دیوتا کے پیچھے سے چار مسلح اور خوب تنومند جوان نمودار ہوئے ان کے ہاتھ میں ننگی تلواریں تھیں ۔ ان کی آنکھوں میں غصے کے شعلے اور انتقام کی چنگاریاں تھیں ۔ اپنی شکل اپنی ہیئت اور اپنے لباس سے وہ چاروں رومن لگتے تھے ۔ ان میں سے ایک نے احمد کو مخاطب کر کے پوچھا ۔

"تم تینوں کون ہو اور اس معبد میں کیوں داخل ہوئے ہو ۔ کیوں تم نے اپنے ساتھیوں کو جیوپیٹر کا بت گرا کر توڑ دینے کی تجویز پیش کی تھی"۔ احمد نے چند ثانیوں تک انہیں غور سے دیکھا پھر اس نے اپنی تلوار لہراتے ہوئے غصے اور غضب کی حالت میں کہا ۔

"پہلے تم بتاؤ ۔ کون ہو تم ؟ ورنہ جیوپیٹر کے اس بت کے سامنے تم سب کو میں لہو لہو کر دوں گا"۔ اس کے ساتھ ہی احمد نے پشت سے اپنی ڈھال اتاری ۔ کندھے پر لٹکتی کمان اور پیٹھ پر بندھے ہوئے ترکش کو درست کرتے ہوئے وہ اور زیادہ مستعد ہو گیا تھا ۔ گردام اور انولو نے بھی اپنی ڈھالیں سنبھال لی تھیں ۔

جواب میں اس رومن نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور وہ گھیراؤ کی شکل اختیار کرنے لگے تھے ۔ احمد نے بھی بروقت کوئی فیصلہ کیا اور پلک جھپکنے میں وہ ان میں سے ایک پر حملہ آور ہوا اور اس کی گردن کاٹ کر رکھ دی ۔ باقی تینوں وحشیوں کی طرح ان پر حملہ آور ہو گئے تھے اور جواب میں وہ تینوں بھی اپنی پوری جارحیت کے ساتھ ان کے سامنے جم گئے تھے ۔

احمد ایسے خوفناک اور انتہائی مہلک انداز میں حملہ آور ہوا تھا کہ اس کے سامنے آنے والا رومن صرف چند ثانیوں تک اس کے سامنے ٹھہر سکا پھر احمد کی تلوار اس کے شانوں پر گری اور خوب نیچے تک اسے کاٹتی چلی گئی تھی ۔ احمد طوفان کی طرح وہاں سے ہٹا اور پشت کی طرف سے حملہ آور ہو کر انولو کے ساتھ لڑنے والے رومن کو کاٹ دیا ۔

آخری رومن جو گردام سے جنگ کر رہا تھا بھاگ کھڑا ہوا ۔ احمد نے فوراً ترکش سے تیر نکالا اور اسے چلّے پر چڑھاتے ہوئے اس نے چلا کر کہا ۔ "ٹھہرو ! میرے پاس بھاری منہ کے تیر

ہیں اور میرا نشانہ بے خطا ہے ۔ اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو چھلنی کر دوں گا"۔

وہ رومن رکنے کی بجائے اور تیزی سے بھاگا ۔ ابھی وہ معبد کے دروازے پر ہی گیا تھا کہ احمد کی طرف سے تیر آیا اور رومن کی ٹانگ کو چھیدتا چلا گیا تھا ۔ رومن نے ٹھوکر کھائی اور فرش پر گر گیا ۔ اتنی دیر تک احمد دوسرا تیر بھی چلا چکا تھا جو اس رومن کی پیٹھ میں پیوست ہو گیا تھا ۔

احمد، گردام اور انولو بھاگ کر معبد کے دروازے کی طرف گئے تھے جہاں زخمی رومن گرا پڑا تھا ۔

احمد فرش پر بیٹھ گیا اور اپنا خنجر نکال کر اس رومن کی چھاتی پر رکھتے ہوئے کہا "تم لوگ کون ہو اور ایکارز کے اس معبد میں تم کیا کرتے رہے ہو ۔ وہ رومن کچھ کہنے سے گریز کرتا رہا لیکن جب احمد نے اس کی گردن پر رکھی اپنے خنجر کی نوک پر دباؤ بڑھایا تو رومن نے فی الفور کہنا شروع کیا" ہم لوگ رومن دیوتاؤں کو ماننے والے ہیں ۔ یہاں کے اکثر لوگ جب عیسائیت اور آتش پرستی کی طرف مائل ہونے لگے تو یہاں کے وہ لوگ جو رومن دیوتاؤں کو مانتے ہیں فکر مند ہو گئے کیونکہ ایکارز کا یہ معبد ویران ہونے لگا تھا ۔ صلاح مشورہ کے بعد ہم چاروں کو اس ارادے سے اس معبد میں خفیہ طور پر مقرر کیا گیا ۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی مشہور کر دی گئی کہ مارس دیوتا غصے اور غضب کی حالت میں دریائے لاغوت سے نکل کر ایکارز کے معبد میں داخل ہوا اور پھر ہم چاروں نے ان لوگوں کو قتل کر کے معبد کے باہر پھینکنا شروع کر دیا جو اس طرف آتے تھے جب ہم نے کسی کو قتل کرنا ہوتا تو ہم معبد میں آگ گرم کر کے دھواں نکالنا شروع کر دیتے تھے جس سے اس علاقے میں وحشت پھیل جاتی تھی ۔

ہماری ان حرکات کا خاطر خواہ اثر ہوا ۔ لوگ رومن دیوتاؤں کی قوت اور اثرات کے قائل ہونے لگے اور دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے یہاں کے بادشاہ کسیلا نے ایک اور معبد بھی بنانا شروع کر دیا ہے جس میں رومن دیوتا رکھے جائیں گے ۔ ہم سمجھتے ہیں ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں"۔

احمد نے تلوار کھینچ کر اسے بھی قتل کر دیا ۔ چاروں لاشیں انہوں نے معبد سے باہر پھینک دیں اور اپنے ریوڑ کی طرف چلے گئے تھے ۔



سورج دِن بھر فطرت کے عناصر کے ساتھ جنگ کرنے کے بعد دور مغرب کی اتھاہ ظلمتوں میں غروب ہونے کو جھک رہا تھا۔ صحرائی پرندے اپنے رب کی حمد گاتے سناٹے پر گہری چوٹ لگاتے ہوئے یوں اپنے آشیانوں کو جا رہے تھے۔ جیسے شام کے وقت چرواہے گیت گاتے ہوئے اپنے مسکنوں کو لوٹتے ہیں۔ دن کسی خزاں رسیدہ گلاب کی طرح بکھرتا ہوا ختم ہو رہا تھا اور شام گہرے ابہام لیے تاریکی کا لبادہ اوڑھ کر یوں ہر شے میں تحلیل ہونے لگی تھی جیسے کسی شاعر کے خیالات الفاظ کی نرم باہوں میں ڈھل کر گیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

احمد، کردام اور انولو اپنے ریوڑ کو ہانکتے ہوئے اردیہ شہر اور کوہستان اطلس کے درمیان پڑنے والی چھوٹی سی صحرائی پٹی کو عبور کر رہے تھے۔ وہ تینوں اطراف سے ریوڑ کو ہانک رہے تھے اور تیز ہوا میں ریت اُڑ اُڑ کر دُور دُور تک جا رہی تھی۔

جب وہ باڑے کے قریب آئے تو انہوں نے دیکھا وہاں فرلیس ننگی تلوار لیے کھڑا تھا۔ وہ سخت غصّے اور قہر کی حالت میں تھا۔ اس کے قریب ہی اس کی ماں اور اس کا باپ یہود تھے کھڑے تھے جب کہ اس سے ذرا ہٹ کر امین اپنے باپ، ماں اور ماموں ساتھ کھڑی ہوئی تھی وہ کچھ پریشان اور بکھری بکھری سی تھی۔ اس کی ماں، ماموں اور باپ بھی اداس تھے۔ ان سے بائیں طرف محل کے کچھ پہریدار اور دائیں ہاتھ محل میں کام کرنے والے کئی اور لوگ کھڑے تھے۔

احمد جب باڑے کے قریب آیا تو فرلیس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تلوار لہرائی اور چلّا کر کہا۔ ”تُو آج میرے ہاتھوں بچ نہ سکے گا۔ تیری گردن مَیں ضرور کاٹ کر رہوں گا۔“

احمد نے بھی اپنی تلوار کھینچ لی اور اس سے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

”میرے لیے نمرود اور فرعون نہ بن کہ تیری حالت بھی ان جیسی ہی ہو گی۔ یاد رکھ مَیں اپنے صحرا سے دُور ضرور ہوں لیکن مَیں اپنی صحرائی جبلت اور روایات کو نہیں بھولا۔ سنو! جب عرب کے ہاں بچّہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اسے وِرثے میں تلوار اور خیمے کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ تُو مجھے ننگی تلوار دکھا کر دھمکا نہیں سکتا کہ تلوار میرا ساتھی ہے اور مَیں اس کے دستے پر گرفت رکھ کر اس کے پھل کو استعمال کرنے کا فن جانتا ہوں۔ احمد اور آگے بڑھ کر فرلیس کے قریب ہوا اور پُرغیض و برہم آواز میں کہا۔

”مَیں اس وقت بچّہ تھا جب تیرے حالات کے جبر کا شکار رہا۔ اب مَیں جوان ہوں اور رد و قبول کا فیصلہ کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں۔ اگر تُو نے مجھ سے اُلجھنے کی جرات کی تو مَیں تیری تقدیر کے پاؤں کاٹ دوں گا اور تُو میرے سامنے مٹی کے ڈھیر کی طرح بے بس اور غیر متحرک پڑا ہو گا۔“

احمد کے چہرے کی ہیئت کسی قاتل و جلاد کی طرح سنگین ہو گئی تھی۔ فرلیس نے کوئی جواب نہ دیا اور تلوار لہرا کر احمد پر حملہ آور ہو گیا تھا۔ احمد اپنے دفاع میں فرلیس کے وار روکتا ہُوا پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ اس موقع پر کردام اور انولو نے بھی اپنی تلوار بے نیام کر لیں پھر کردام نے فرلیس کی طرف بڑھتے ہوئے چلّا کر کہا۔

”آج ہم تمہیں ٹھکانے لگا کر رہیں گے کہ تم اب تک ہم تینوں کے لیے عذاب بنے رہے ہو۔“ احمد نے سخت آواز میں دونوں بھائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کردام اور انولو! تم دونوں پیچھے ہٹ کر کھڑے رہو۔ خبردار اس پر حملہ آور نہ ہونا۔ تم دیکھو گے مَیں کیسے اس کی آمریت اور اس کے جلادی پن کا علاج کرتا ہوں“۔

فرلیس بڑھ چڑھ کر احمد پر حملے کرتا رہا۔ کردام اور انولو دونوں بھائی پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ امین خاموش پیڑوں کی طرح غمگین کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا باپ ہَوا کے سایوں اور خلائی پیکر کی طرح بے حِس و گمنام سا کھڑا تھا جب کہ اس کی ماں پیچھے ہٹتے ہوئے احمد کو بے چین نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

ایک دم احمد دفاع سے نکل کر جارحیت پر اُتر آیا تھا۔ اپنے تیز اور طوفانی حملوں کے ساتھ وہ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے فطرت کا کوئی بدمست عنصر قہرمانوں کی گردش اور تیز کرنے کو نکل کھڑا ہُوا ہو۔ اس کی تلوار بڑی تیزی سے اُبھرنے ڈوبنے لگی تھی اور اپنے طوفانی حملوں میں وہ فرلیس کو اپنے آگے آگے خوب تیزی سے بھگانے لگا تھا۔

فرلیس کو اس کے ماں باپ کے سامنے لے جا کر احمد نے اپنی تلوار کو ذرا سا ترچھا کیا پھر اس زور سے فرلیس کی تلوار پر مارا کہ فرلیس کی تلوار دستے کے قریب سے کٹ کر زمین پر گر گئی تھی۔ فرلیس اپنی کٹی ہوئی تلوار کا دستہ اپنے ہاتھ میں لیے عجیب بے بسی اور نہایت دلفگار

حالت میں احمد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اس کی ذہنی اُلجھن کا عکس اور آنکھوں میں ریت کے ویران ٹیلوں سے لپٹ کر روتی ہواؤں جیسی تلخی اور بے قراری تھی۔

احمد کی اس کامیابی پر ایمن کے چہرے پر طلسم حُسن وخیال کا عروج اور انبساط کی لہروں کا نزول تھا۔ وہ پگھلے نیلم کی طرح پُرسکون اور طفلِ معصوم کے عزم جیسی مطمئن تھی۔

احمد نے آگے بڑھ کر فریس کی کٹ کر گری ہوئی تلوار کو پاؤں کی ایک سخت ٹھوکر لگائی پھر فریس کو مخاطب کر کے اس نے کہا۔ "فریس! فریس! میں اپنے وطن سے دور ضرور ہوں لیکن یہ دُوریاں مجھ سے میرا صحرائی پن اور میری روایات نہیں چھین سکتیں۔ یاد رکھو اشب وروز کے تلاطم نے مجھے اپنوں سے دُور ضرور کر دیا ہے لیکن تلوار کا فن جو ایک عرب کو وراثت میں ملتا ہے وہ میرے پاس یادوں کی مشعل اور اُمید کی شمع کی طرح محفوظ اور زندہ ہے"۔

فریس نے کوئی جواب نہ دیا۔ شرمندگی اور ندامت میں اس کی گردن جھکی رہی! احمد نے فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے پھر کہا۔ اگر تم مجھے اس طرح زیر کر لیتے تو ابھی تک تم میری گردن کاٹ چکے ہوتے لیکن تمہیں شکست دینے کے باوجود میں تمہیں معاف کرتا ہوں کہ معاف کرنے میں ہی فلاح اور ضمیر کا سکون ہے اور ——————

احمد کہتے کہتے رُک گیا کیونکہ کسیلہ اپنے محل سے نکلا تھا اور رُخ سیدھا اس کی طرف تھا اور وہاں کھڑے لوگ اسے راستہ دینے کی خاطر اِدھر اُدھر ہٹنے لگے تھے۔ احمد کے قریب آ کر کسیلہ نے احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"سمرون! میں تمہیں اور فریس کو تیغ زنی کرتے دیکھ چکا ہوں۔ تمہاری فتح تمہارے جوان۔ طاقت ور اور تنومند ہونے کا ایک ثبوت ہے۔ آج کے بعد تم ریوڑ نہیں چرایا کرو گے۔ تم جیسے شجاع اور باہمت جوان کی ضرورت کوہستان اطلس کی جنوبی چوٹیوں میں ہے۔ جہاں اپنے آباؤ اجداد کی طرح ہم ایک معبد تعمیر کروا رہے ہیں۔ تم اس معبد میں ایک حمال کی حیثیت سے کام کرو گے۔ فریس کا باپ یہودتھ تمہیں کل صبح سے اس کام پر لگا دے گا۔ وہاں تمہیں کام کی اُجرت بھی ملے گی"۔

کسیلہ واپس چلا گیا۔ احمد، کرمام اور انولو باڑے میں چلے گئے۔ ایمن بھی اپنے ماں باپ

کے ساتھ اپنے گھر لوٹ گئی تھی۔ فریس کے باپ یہودتھ نے غصّے سے فریس کی طرف دیکھتے ہوئے زہریلی آواز میں کہا۔

"فریس! فریس! میں نے تمہیں کہا نہ تھا کہ یہ عرب راکھ میں دبی ہوئی ایک چنگاری ہے جو کسی وقت بھی ایک شعلہ بن سکتی ہے۔ تم نے دیکھا میرا کہا سچ ہُوا۔ وہ ایک ایسا شعلہ بن کر تمہارے سامنے آیا ہے جو اپنے اندر بھڑکنے اور جلانے کی پُوری قدرت رکھتا ہے۔ اب بھی میری مانو اور اس سے چپقلش رکھنے سے باز رہو ورنہ یہی غلام عرب ایک روز وقت کا کاتب بن کر تمہاری تقدیر میں بدبختی اور نحوست کے ذِلّت آمیز نوشتوں کا اضافہ کر دے گا"۔

فریس نے اپنے باپ کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا اور اپنی ماں کے ساتھ وہ اپنے گھر چلا گیا۔ یہودتھ بھی ان کے پیچھے پیچھے اپنے گھر جا رہا تھا۔





ایمن اپنی ماں اور ماموں کے ساتھ قرطاجنہ جا چکی تھی۔ احمد ابھی تک کردام اور انولو کے ساتھ باڑے کے اندر ہی رہ رہا تھا۔ تاہم اس کے کام کی نوعیت ضرور بدل گئی تھی۔ ریوڑ چرانے کے بجائے اب وہ کوہستان اطلس کے جنوبی حصّے میں کام کرتا تھا۔ جہاں اس کے ساتھ اور بہت سے غلام اور قیدی بھی کام کرتے تھے۔

لکڑی کی بھدّی بھدی گاڑیوں کے اندر بڑے بڑے پتھر کھینچ کر کوہستانِ اطلس سے ایک قدرے نشیبی وادی میں اس جگہ لے جائے جاتے تھے جہاں معبد تعمیر ہو رہا تھا۔ اَن گنت صناع بھی اس کام میں جُتے ہوئے تھے جو پتھّروں کو خوب صورت شکل دے کر عمارات اُٹھانے کے علاوہ بڑے بڑے پتھروں سے مختلف رومن دیوتاؤں کے بُت بھی تراش رہے تھے۔ یہ ایک مشقت طلب کام تھا۔ اس طرح وقت پَر لگا کر لمحوں، دِنوں، ہفتوں اور پھر مہینوں میں پرواز کرتا چلا گیا اور احمد کو یہ کام کرتے تین ماہ گزر گئے۔

ایک روز شام کے وقت جب وہ کوہستانِ اطلس پر کام کرنے کے بعد واپس کسیلہ

کے محل کی طرف جا رہا تھا تو شہر کے بازار میں سے گزرتے ہوئے اس نے بوڑھے اخناتون کو دیکھا وہی اخناتون جو یونانی اور ستارہ شناس تھا اور رات کے وقت صحرا میں اِن راہزنوں کی راہنمائی کرتا تھا جنہوں نے اسے وادیِ شعیب سے اغوا کر کے کسیلہ کے پاس لا بیچا تھا۔ اخناتون کی کمر جھکی ہوئی تھی اور وہ ایک تیرہ چودہ برس کے لڑکے کا سہارا لیے جا رہا تھا۔ احمد اس کی طرف بھاگا اور اسے پکارا۔ ”اخناتون! اخناتون!“

بوڑھا اخناتون رک گیا اور مڑ کر احمد کی طرف دیکھا۔ احمد جب اس کے قریب گیا تو اس نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اے اجنبی نوجوان! کیا تُو نے مجھے پکارا؟“ احمد نے مسکرا کر کہا۔ ہاں، مَیں نے آپ کو پکارا۔ کیا آپ نے مجھے پہچانا نہیں، مَیں وہی ہوں جسے آپ کے ساتھی رہزنوں نے آج سے آٹھ نو برس پہلے وادی شعیب سے اغوا کر کے یہاں لا بیچا تھا“۔

اخناتون نے دُکھ سے کہا۔ ”عمر رفتہ میں ایسے کئی طاق ہیں کس کس کو ٹٹول کر پُرانی یادیں زندہ کروں گا۔ اب جب کہ میرے ذہن کی ابلاغی راہیں اور میرا وجدان وادراک زنگ آلود ہو گیا ہے۔ اب مَیں کسی کو کیا پہچانوں گا“۔

احمد نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ ”میرا تعلق عربوں کے ایک قبیلے سے ہے جو یمن سے مصر کی طرف سفر کر رہا تھا کہ وادی شعیب میں رہزنوں نے اُسے لُوٹ کر اُس کے اَن گنت بچوں کو اغوا کر لیا اور مجھے یہاں کسیلہ کے پاس لا بیچا تھا۔ میرا رہزنوں کے ایک فرد سے جھگڑا بھی ہو گیا تھا جس کی پاداش میں میرے چہرے کا بایاں حصّہ جلا دیا گیا تھا مجھے آپ کے اُونٹ پر رکھا گیا تھا اور مجھے تسلّی دینے کے علاوہ آپ نے میرا نام احمد سے سمرون رکھ دیا تھا۔

بوڑھا اخناتون کسی بے خانماں و درِبستہ مکان کی طرح اداس ہو گیا۔ چند لمحوں تک وہ احمد کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھتا رہا پھر کسی قدر مطمئن اور پُرسکون ہوتے ہوئے اس نے کہا۔ ”ہاں، مَیں تمہیں پہچان گیا ہوں، پر اُس وقت تم بچّے تھے اب تم خوب قوی بازوؤں والے اور تنومند ہو گئے ہو۔ تمہارا جسم کیسا بھرپور اور کڑیل ہو

گیا ہے۔ تم اِن دنوں کہاں ہو؟"

احمد نے دکھ سے کہا۔ "میں کسیلہ کا غلام ہی ہوں اور آج کل کوہستانِ اطلس کے جنوبی حصّے میں جو معبد بن رہا ہے اس پر کام کر رہا ہوں۔ آپ آج کل کہاں ہیں"؟

اخناتون نے مغموم آواز میں بچّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے مرنے والے اکلوتے بیٹے کی واحد نشانی ہے۔ میں بیمار ہوں اور اس کے ساتھ طبیب کے پاس گیا تھا۔ بوڑھا ہو جانے کے باعث رہزنوں نے مجھے اپنے گروہ سے علیحدہ کر دیا ہے اور میری جگہ ایک جوان ستارہ شناس کو رکھ لیا ہے"۔ اخناتون جب رُکا تو احمد نے پوچھا "آپ کو کچھ علم ہو کہ میرا قبیلہ وادیٔ شعیب سے اُٹھ کر کدھر گیا تھا"؟

اخناتون نے جواب میں اپنی گردن نفی میں ہلاتے ہوئے کہا "افسوس! مجھے اس کا علم نہیں"۔ احمد اداس ہو گیا۔ تاہم اس نے پھر پوچھا۔ "کیا آپ بتا سکتے ہیں وہ راہزن کون ہیں اور ان کا ٹھکانہ کہاں ہے"؟

اخناتون چند ثانیوں تک خاموش رہا پھر کسی قدر پیار سے اس نے کہا۔ "اُن کا اصل ٹھکانہ وادیٔ طوی ہے۔ جہاں بحیرہ قلزم کے کنارے طوی نام کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے جہاں سے لوگ حبشہ اور وہاں سے واپسی کا سفر کرتے ہیں۔ بندرگاہ کے مشرقی حصّے میں جس قدر کشتیاں کھڑی ہوں گی وہ سب ان راہزنوں کی ہیں۔ رہزنی کے علاوہ مچھلیاں پکڑ کر بیچنے اور لوگوں کو حبشہ لے جانے اور لانے کا کام بھی کرتے ہیں لیکن یاد رکھو ان پر ہاتھ ڈالنا کوئی ایسا آسان نہیں کیونکہ ان کے پاس سینکڑوں جنگجو جوان ہیں جن کی مدد سے وہ ہر بُرا اور قبیح فعل کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں"۔

اخناتون جب خاموش ہوا تو احمد نے تمنّا و حسرت کے دوراہے پر کھڑے کسی بے بس مسافر کی طرح پوچھا۔ "اخناتون! اخناتون! کیا تمہیں علم ہے میرا قبیلہ کہاں جا کر آباد ہوا تھا"۔ اخناتون نے پھر دُکھ سے گردن جُھکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کا علم نہیں ہے"۔ احمد نے چند ثانیوں تک اخناتون کو غور سے دیکھا پھر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔

احمد جب باڑے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا اپنی کچی کوٹھڑیوں سے باہر کردام اور انولو دونوں بھائی خاموش اور اداس بیٹھے تھے۔ احمد ان کے قریب گیا اور فکر مندی سے پوچھا۔ "تم دونوں بھائی اداس اور غمگین کیوں ہو"۔

کردام نے دُکھ سے کہا۔ "آج محل کے ایک غلام لڑکے کو موت کے کنوئیں میں ڈال دیا گیا ہے"۔ احمد نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کون سے موت کے کنوئیں میں"؟ کردام نے آہ بھرتے ہوئے کہا "شہر کے شمال میں ایک پُرانا، خشک اور اندھا کنواں ہے۔ اس کنوئیں میں کسیلہ نے ایک پدم سانپ چھوڑ رکھا ہے۔ جس کسی کو بھی کسیلہ نے موت کے گھاٹ اتارنا ہو اسے اس اندھے کنوئیں میں پھینک دیتے ہیں۔ جہاں سانپ کنوئیں میں گرنے والے کو ڈس لیتا ہے اور وہ مر جاتا ہے"۔

احمد نے فکر مندی سے پوچھا۔ "وہ غلام لڑکا کون تھا اور کس جرم میں اسے یہ سزا دی گئی ہے"؟ کردام نے پھر دُکھ سے کہا۔ "وہ حبشی تھا اور محل کے اندرونی حصّے کی صفائی پر مقرر تھا۔ کسیلہ کا ایک بیٹا بلاوجہ اس پر مظالم کرتا رہتا تھا۔ آج بھی جب وہ اسے مار رہا تھا تو جواب میں غلام لڑکے کا ہاتھ بھی اس کے بیٹے پر اُٹھ گیا جس کی پاداش میں کسیلہ نے اسے موت کے کنوئیں میں پھینک دیا۔ کسیلہ آج بہت پریشان تھا۔ اگر وہ پریشان نہ ہوتا تو شاید اس لڑکے کو اتنی بڑی سزا نہ ملتی۔

احمد گردن جُھکائے خاموش کھڑا رہا پھر اچانک اس نے چونک کر پوچھا۔ "تم ابھی ابھی کہہ رہے تھے کسیلہ آج پریشان تھا۔ کیا تم اس کی وجہ بتا سکو گے"۔ کردام نے اس بار قدرے مطمئن ہو کر کہا۔ "ہمارے جس جرنیل عقبہ بن نافع نے افریقہ پر حملہ کر رکھا ہے اس کے متعلق آج خبر آئی ہے کہ اس نے افریقی حکمرانوں کے ایک متحدہ لشکر کو ایک ساحلی شہر بونہ کے مقام پر عبرت خیز شکست دی ہے۔ اس متحدہ لشکر میں کسیلہ اور تہورا کے بادشاہ برانس کے علاوہ اور کئی حکمرانوں کے لشکر بھی شامل تھے۔ آج کسیلہ اس شکست کا سننے کے بعد خود ایک لشکر کو لے کر یہاں سے روانہ ہو گیا ہے۔ سُنا ہے

عقبہ بن نافع سے مقابلہ کرنے کے لیے وہ کوہستانِ اوراس کی ملکہ جرارہ سے بھی مدد حاصل کرنے کی کوشش کریں گے"۔

احمد نے پریشان ہوکر پوچھا" یہ ملکہ جرارہ کون ہے؟" کردام نے احمد کا بازو پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ کوہستان اطلس کے شمال مشرق میں ایک طویل پہاڑی سلسلہ ہے جسے کوہستانِ اوراس کہتے ہیں۔ یہ عورت جو ساحرہ اور جادوگرنی ہے اسی پہاڑی سلسلے میں رہتی ہے۔ بربروں میں اس قدر مقبول ہے کہ لوگ اس کے بُت بنا کر اس کی پُوجا کرتے ہیں۔ اس کے پاس اپنا ایک جرار لشکر بھی ہے۔

کردام خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اچانک جیسے کوئی چیز اسے یاد آگئی ہو اور اس نے چونک کر احمد سے کہا" سمرون! سمرون! میں ایک ضروری بات تم سے کہنا تو بھول ہی گیا تھا۔ آج دن میں کئی بار محل کا یہودی خازن آموص تمہارے متعلق پوچھتا رہا ہے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی ہمیں کہہ کر گیا تھا کہ سمرون جس وقت بھی لوٹے اسے میرے گھر بھیجو۔ شاید اسے کوئی ضروری کام تم سے ہے"۔

احمد اُٹھ کھڑا ہوا اور مغرب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" مغرب کی نماز کا وقت ہوچکا ہے۔ آؤ پہلے وضو کرکے نماز پڑھ لیں پھر میں آموص سے مل لونگا"۔

تینوں نے اُٹھ کر وضو کیا اور ایک کوٹھڑی کا دروازہ اندر سے بند کرکے انھوں نے چوری چھپے مغرب کی نماز ادا کر لی تھی۔ اب فضاؤں میں اندھیرا پھیل کر خوب گہرا ہوتا جارہا تھا۔

باڑے سے نکل کر احمد آموص کے سکونتی مکان پر دستک دے رہا تھا تھوڑی دیر بعد آموص ہی نے دروازہ کھولا اور احمد کو دیکھتے ہی اس نے کسی قدر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا" سمرون! سمرون! تم آگئے بیٹے!" ساتھ ہی احمد کا ہاتھ پکڑ کر اس نے اندر کھینچ لیا۔ گھر کا دروازہ اس نے اندر سے بند کرلیا اور احمد کا ہاتھ تھامے ایک کمرے میں لے گیا۔ جہاں سولہ سترہ سال کا ایک لڑکا کھڑا تھا۔ آموص نے

اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" اس کا نام عبدہ ہے۔ یہ میری بیوی کے بھائی کا لڑکا ہے۔ یہ آج ہی یہاں آیا ہے پر بُری خبر لایا ہے"۔

احمد نے آموص کے ساتھ ایک مسہری پر بیٹھتے ہوئے پوچھا" یہ آپ کے لیے کیسی بُری خبر لایا ہے"۔ آموص نے احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا" تمہیں خبر ہوگی بیٹے کہ آج سے تقریباً تین ماہ قبل میری بیوی اپنے بھائی کے ساتھ قرطاجنہ گئی تھی۔ میری بیٹی امین بھی ان کے ساتھ تھی۔ اسے میری بدقسمتی جانو کہ وہاں قرطاجنہ کے حاکم کے رشتہ داروں میں سے ایک جوان جس کا نام طبرق ہے میری بیٹی کو اس کے لمبے قد اور خوب صورتی کی وجہ سے پسند کر بیٹھا۔ اس نے فوراً امین کا رشتہ امین کے ماموں سے مانگا لیکن اس کے ماموں نے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ امین کی نسبت میں پہلے ہی کسیلہ کے لشکر کے ایک رومن اور عیسائی جرنیل سے کر چکا ہوں۔ اس طبرق نے کئی بار امین کے ماموں سے اس کا رشتہ مانگا اور جب ہر بار اس نے انکار کر دیا تو اس ظالم نے امین کے ماموں کو قتل کر دیا۔ اب اس نے میری بیوی اور بیٹی کو وہاں محصور کر رکھا ہے اور سختی کر رہا ہے کہ امین کی شادی اس سے کر دی جائے۔ وہ یہ کام زبردستی بھی کر سکتا تھا لیکن اسے خدشہ ہے کہ امین کہیں خودکشی نہ کرلے۔ عبدہ یہ خبر میرے پاس لے کر آیا ہے"۔

آموص تھوڑی دیر رُکا پھر احمد کا شانہ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔" سمرون! سمرون! میں چاہتا ہوں، اس معاملے میں تم میری مدد کرو۔ اگر امین کا منگیتر آسترو یہاں ہوتا تو میں اسے اس مہم پر روانہ کرتا وہ ایک جری، سرکش اور شجاع جوان ہے۔ لیکن وہ تو ان دنوں کسیلہ کے لشکر میں شمال کی سرزمینوں میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ میں کسیلہ ہی سے مدد کی درخواست کرتا لیکن وہ بھی آج یہاں سے ایک لشکر کے ساتھ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہوچکا ہے۔ میں تم پر اس لیے بھروسہ کر رہا ہوں کہ تمہارے ساتھ ہمارا عرب اور یہودی ہونے کا رشتہ ہے۔ اُمید ہے تم مجھے مایوس نہ کروگے۔ اگر تم مجھے میری بیٹی اور بیوی واپس لا

دو تو میں زندگی بھر تمہارا مشکور رہوں گا۔"

احمد نے غور سے آموص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں قرطاجنہ شہر کے محل وقوع سے ناواقف ہوں۔ نہ ہی مجھے خبر ہے کہ آپ کی بیوی اور بیٹی کہاں ٹھہری ہوئی ہیں۔ اس لیے میں انہیں کیسے اور کیونکر تلاش کر لوں گا؟"

آموص نے عبدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے ساتھ جائے گا اور تمہاری راہنمائی کرے گا۔"

احمد نے پھر اعتراض پیش کیا "میں غلام ہوں، میرے یہاں سے جانے پر کسی نے اعتراض کیا تو پھر؟"

آموص نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "کسیلہ کے بعد یہاں کسی میں اتنی ہمّت نہیں کہ میرے فیصلے کے خلاف آواز بلند کر سکے۔ اس معاملے میں کوئی بھی تم سے باز پُرس نہ کرے گا۔"

احمد نے پھر آموص کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں غلام ہوں اگر میں بھاگ گیا تو پھر۔" آموص نے مطمئن انداز میں کہا۔ "میں جانتا ہوں تم مجھے دھوکہ نہ دو گے۔"

احمد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "تو پھر میں آپ کی بیوی اور بیٹی کو لانے قرطاجنہ ضرور جاؤں گا۔" آموص نے احمد کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عبدہ کو اشارہ کیا۔ جواب میں عبدہ کھانا لے آیا اور تینوں اکٹھے بیٹھ کر شام کا کھانا کھا رہے تھے۔



قرطاجنہ کے ایک اوسط درجے کے مکان میں حسین ایمن اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جب کہ اس کی ممانی جو ان دونوں کے سامنے ہی فرش پر بیٹھی تھی برتن اٹھا کر اپنی پشت پر رکھ رہی تھی۔ شاید وہ شام کا کھانا کھا کر فارغ ہوئی تھیں۔ ایمن کچھ دیر تک اپنی ماں کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے شکایت آمیز

میں کہا۔ "ماں! ماں! عبدہ کو گئے آج کئی روز ہو چکے ہیں لیکن کوئی بھی ہماری مدد کو نہیں آیا۔ میں تو اب ہر روز انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ مجھے اب ایک اور فکر لگ گئی ہے۔ خدا کرے میرے بابا تندرست ہوں۔"

ایمن کی ماں عزبان نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "تو فکر مند نہ ہو بیٹی! تو جانتی ہے بیٹی! آسترو تیرا منگیتر تجھے دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے۔ وہ جب یہ حالات سنے گا تو آندھی اور طوفان بن کر قرطاجنہ کا رُخ کرے گا۔ تُو جانتی ہے، ان صحراؤں کے اندر اس جیسا کوئی طاقت ور، شجاع اور بہادر نہیں، وہ تجھے یہاں سے نکال لے جانے کا ضرور بندوبست کرے گا اس لیے کہ ——"

ایمن نے عزبان کی بات کاٹتے ہوئے سوالیہ کیفیت میں کہا۔ "سنو! سنو ماں! باہر کسی کے باتیں کرنے کی آوازیں سُنائی دی ہیں جیسے کسی سے کوئی اُلجھ رہا ہو۔ میرا دل کہتا ہے کوئی ہماری مدد کو آیا ہے۔ اگر یہ آسترو ہے تو وہ مکان سے باہر کھڑے پہریداروں سے اُلجھ کر غلطی کر رہا ہے۔ اس طرح پہریدار اسے پکڑ کر طارق کے پاس لے جائیں گے اور اگر کسی طرح بھی طارق کو علم ہو گیا کہ آسترو میرا منگیتر ہے تو وہ اسے زندہ نہ چھوڑے گا۔ ماں! ماں! تم بیٹھو، میں باہر نکل کر دیکھتی ہوں کون آیا ہے؟"

عزبان بھی کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ "چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں" ایمن کی ممانی بھی اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لی تھی۔

تینوں کمرے سے نکل کر صحن میں آئیں۔ پورا گھر خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا آسمان کے کھوئے ہوئے تارے نہ جانے کن منزلوں کی طرف رواں تھے۔ اونگھتی ہوائیں، تیرگی کی ہر لمحہ دراز ہوتی چادر میں خاموش تھی۔ ہر طرف نراش اور تنہائیوں کے سائے تھے۔ وہ تینوں گھر کے بیرونی دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئیں اور باہر باتیں کرنے والوں کی گفتگو سننے کی کوشش کرنے لگیں۔

ابھی وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی تھیں کہ دروازے پر زور دار دستک دی۔ ایمن کی

ممانی نے دروازے سے منہ لگاتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے؟" باہر سے کپکپاتی سی آواز آئی۔ "دروازہ کھولو ماں! میں عبدہ ہوں"۔

ایمن کی ممانی نے فوراً دروازہ کھول دیا اور جونہی عبدہ اندر داخل ہوا اس نے اسے گلے لگا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ عبدہ نے خود دروازہ بند کیا اور تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ"۔

عبدہ کے ساتھ وہ تینوں پھر وہیں آ بیٹھی تھیں جہاں وہ پہلے بیٹھ کر گفتگو کر رہی تھیں۔ ایمن نے فوراً عبدہ سے پوچھ لیا۔ "عبدہ! عبدہ! تو اکیلا ہی آیا ہے میرے بابا تو ٹھیک ہیں"؟ عبدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تیرے بابا ٹھیک ہیں میری بہن!" میں اکیلا نہیں میرے ساتھ ایک طوفان بھی قرطاجنہ آیا ہے جو یقیناً آپ لوگوں کو یہاں سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا"۔

عزیان نے عبدہ کا شانہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا طوفان سے تمہاری مراد آسترو ہے؟ اگر وہ تمہارے ساتھ آیا ہے تو تم اسے کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

عبدہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ میرے ساتھ آسترو نہیں ہے لیکن جو جوان میرے ساتھ آیا ہے۔ میرے خیال میں وہ آسترو سے کہیں طاقتور اور بہادر ہے"۔ عزلان نے ڈانٹ دینے کے انداز میں کہا۔ "عبدہ! عبدہ! ایسا کہہ کر تم نے آسترو کی توہین کر رہے ہو"۔

ایمن نے بھی بولتے ہوئے کہا۔ "وہ کون ہے جسے تم آسترو پر فوقیت دے رہے ہو اور جسے آسترو کے بجائے میرے بابا نے ہماری مدد کو روانہ کیا ہے؟"

عبدہ نے فخریہ انداز میں کہا۔ "وہ کسیلہ کے محل کا ایک غلام ہے اور اس کا نام سمرون ہے، سمرون بن حشم"۔

عزلان نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ایمن کے باپ نے آسترو کے بجائے سمرون کا انتخاب کر کے یقیناً غلطی کی ہے۔ آسترو بہادر اور طاقتور ہے جبکہ

سمرون بچارہ بچپن سے آج تک کسیلہ کے داروغہ یہودتھم کے بیٹے فریس سے پٹتا اور مار کھاتا آ رہا ہے"۔

ایمن نے فوراً احمد کی طرف داری میں بولتے ہوئے کہا۔ "تم غلط کہہ رہی ہو ماں! سمرون بچپن میں ضرور پٹتا رہا۔ اس لیے کہ فریس اور اس کی عمر میں خاصا فرق تھا لیکن جوان ہو کر وہ اس خیال کے تحت فریس کے سامنے دب جاتا تھا کہ وہ غلام ہے۔ ہماری ادھر روانگی سے قبل کیا تم نے دیکھا نہ تھا کہ تنگ آ کر وہ فریس سے مقابلہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اور تم نے دیکھا تھا ماں! اس نے رات کے وقت فریس کو مار مار کر لہو لہو کر دیا تھا اور دوسرے روز جب ان دونوں میں تیغ زنی کا مقابلہ ہوا، تو چند لمحوں کے اندر ہی سمرون نے فریس کی تلوار کاٹ دی تھی۔ کوئی اور ایسی شجاعت کا اظہار کرتا تو کسیلہ اسے اپنے لشکر میں کسی اچھے عہدے کی پیش کش کرتا لیکن سمرون کو کیا ملا؟ اس بچارے کو تو سزا ملی اور ریوڑ کی نگرانی سے ہٹا کر اسے معبد کے لیے پتھر اٹھانے کے سخت جان کام پر لگا دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ وہ غلام ہے غلام جس کا ماضی ہے نہ مستقبل۔

عزیان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایمن! ایمن! میری بیٹی میرا مطلب سمرون کی توہین کرنا نہ تھا۔ تم جانتی ہو میں نے ہمیشہ اس سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ اگر وہ ہماری مدد کو آیا ہے تو میں اسے خوش آمدید کہتی ہوں"۔

ایمن نے اس بار عبدہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اگر سمرون تمہارے ساتھ آیا ہے تو تم اسے کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

عبدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اے میری بہن! وہ غلام ہوتے ہوئے بھی نہایت عقلمند اور زیرک ہے۔ وہ اس شہر کی ایک سرائے میں ٹھہرا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ میرا گھر پر قیام کرنا درست نہیں اس طرح طبرق کے آدمی اسے جان جائیں گے اور وہ اپنا کام نہ کر سکے گا۔ اس کا خیال ہے کہ وہ آج رات ہی ہمیں یہاں سے لے کر روانہ ہو جائے گا"۔

ایمن نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ "یہ کیسے اور کیونکر ممکن ہے؟" عبدہ نے احمد کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے میں بھی سمرون پر بداعتمادی کا اظہار ہی کرتا تھا لیکن جب سے اس نے راستے میں ایک بار میری جان بچائی ہے میں اس کی طرف سے ہر فعل اور ہر بات کو ممکن سمجھنے لگا ہوں۔"

عبدہ کی ماں نے فکرمندی سے پوچھا۔ "راستے میں تم پر کیا بیتی؟"

عبدہ کہہ رہا تھا۔ "جب میں سمرون کے ساتھ اِدھر آ رہا تھا تو راستے میں صحرا کے اندر چار مسلح جوان ہمارا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ کوہستان اور اس کی ساحرہ ملکہ جرارہ کے جاسوس تھے۔ انہوں نے ہمیں مسلمانوں کے حملہ آور لشکر کا جاسوس جانا اور وہ ہم دونوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن سمرون نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور جنگ پر اُتر آیا۔ میں اپنے گھوڑے پر ہی پُرسکون ہو کر بیٹھا رہا جب کہ اکیلے سمرون نے ملکہ جرارہ کے ان چاروں جاسوسوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔"

ایمن نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات میں کہا۔ "عبدہ! عبدہ! جو کچھ تم نے کہا ہے اگر یہ سچ ہے تو میں سمجھتی ہوں۔ سمرون ہی وہ جوان ہے جس کا انتخاب قدرت ہماری رہائی کا سامان پیدا کرنے کے لیے کر چکی ہے۔ تم یہ بتاتے بتاتے تو دوسری طرف ہی چلے گئے تھے کہ وہ ہمیں یہاں سے کیسے نکالے گا۔"

عبدہ نے کہا اس کا طریقہ کار بہت اچھا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا رات کے وقت جب کہ قرطاجنہ شہر کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں صرف سمندر کا راستہ کھلا رہتا ہے۔ وہ سمندر ہی کے راستے ہم سب کو یہاں سے لے بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ شہر میں داخل ہوتے وقت میں اسے لے کر یہیں سے گزرا تھا اور میں نے اسے اپنا مکان دکھا دیا تھا۔ وہ پہلے بندرگاہ میں کشتی کا انتظام کرے گا پھر ہمیں لینے کے لیے آئے گا۔"

ایمن نے چیختے ہوئے پوچھا۔ "لیکن وہ ہمیں یہاں سے نکالے گا کیسے، تم جانتے ہو طارق کے پہریداروں نے میرا اور ماں کا باہر تک نکلنا بند کر رکھا ہے۔ صرف

اور ممانی سودا سلف خریدنے کی خاطر بازار جا سکتے ہو۔ اگر تمہیں بھی یہ اجازت نہ ہوتی تو تم بھی میرے بابا کے پاس نہ جا سکتے اور ہم یہیں گھٹ گھٹ کر مر جاتے۔"

عبدہ نے پھر بڑے وثوق سے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں وہ کیا کرے گا۔ تاہم مجھے یقین ہے وہ ہمیں بحفاظت یہاں سے ضرور نکال لے جائے گا۔ اس کا خیال رکھنا، وہ جلد ہی یہاں آئے گا کیونکہ ہم شام سے بہت پہلے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ میں اس کے پاس سرائے میں ٹھہرا رہا ہوں۔ اس نے میرا اور اپنا دونوں گھوڑے بیچ دیئے ہیں۔ سرائے سے نکل کر وہ بندرگاہ کی طرف چلا گیا اور میں اِدھر آ گیا ہوں۔"

عبدہ کی ماں نے کہا۔ "پہریداروں نے تم سے یہ نہ پوچھا کہ تم سودا سلف لانے کے بہانے گھر سے نکلے تھے اتنے روز کہاں رہے۔"

عبدہ نے کہا۔ "پوچھا تھا" ——— "پھر تم نے کیا کہا۔"

"میں نے کہا۔ میں اس امر کی اطلاع ایمن کے باپ کو کرنے گیا تھا۔ میں نے اس سے یہ جھوٹ بھی کہہ دیا کہ ایمن کا باپ اس شادی پر رضامند ہو گیا ہے اور وہ آج ہی یہاں پہنچ کر خود ایمن کی شادی طارق سے کر دے گا۔ پہریدار میری ان باتوں سے مطمئن ہو گئے اور مجھ سے زیادہ باز پرس نہیں کی۔ یہ بات کہنے کو بھی مجھے سمرون ہی نے کہا تھا۔ اب تم لوگ اُٹھ کر اپنی تیاری کر لو۔ میں سمجھتا ہوں سمرون بہت جلد اِدھر آئے گا۔"

ایمن اُٹھتی ہوئی بولی "میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں عبدہ!"

عبدہ نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھوک نہیں، میں سمرون کے ساتھ سرائے میں کھانا کھا چکا ہوں۔"

عبدہ کی ماں، عزیاں اور ایمن تینوں اُٹھ کر اپنا وہ مختصر سا سامان سمیٹنے لگی تھیں جو انہوں نے ساتھ لے جانا تھا۔ عبدہ بھی اُٹھ کر اس کام میں ان کی مدد کرنے لگا تھا۔



رات گہری ہو گئی تھی ۔ آسمان ابر آلود تھا ۔ قرطاجنہ شہر کی ناآسودگیاں دم توڑ چکی تھیں اور کوچہ و بازار خاموش اور ویران ہو گئے تھے ۔ فضاؤں میں کوئی جگنو کوئی ستارہ نہ تھا ۔ ہاں آسمان پر چنگھاڑتی وحشی گھٹاؤں کا شور کبھی کبھی دور تک بکھر جاتا تھا ۔ ایمن کے ماموں کے گھر سے باہر طرق کے پہریدار چوکس کھڑے پہرہ دے رہے تھے کہ خاموشیوں کے راگ اور اندھیرے کی چادر کے اندر ایک ہیولہ نمودار ہوا ، جو مکان کے پشت کی جانب گیا تھا ۔ وہاں کھڑے پہریدار نے جب اس ہیولے کو اپنے قریب آتے دیکھا تو اس نے سخت آواز میں پوچھا ۔ ”تم کون ہو اور رات کے وقت یہاں کیا کر رہے ہو“۔

اندھیرے میں ہیولہ دکھائی دینے والا وہ شخص احمد تھا جس نے سردی سے بچنے کے لیے اپنے اوپر سیاہ رنگ کا ایک بوسیدہ سا کمبل ڈال رکھا تھا ۔

احمد اس پہریدار سے قریب ہوا اور جان بوجھ کر اس نے کپکپاتی ٹھٹھرتی آواز میں کہا ۔ ”اے دوست ! تم یہاں کس کا پہرہ دے رہے ہو ۔ میں اس شب کا مسافر اور اجنبی ہوں ۔ میں جنوب مغرب کے اردیہ شہر سے آیا ہوں ۔ جہاں کسیلہ بادشاہ حکومت کرتا ہے ۔ مجھے ایک ایسے تاجر کے ہاں جانا ہے جس کا نام میں خود بھول چکا ہوں ۔ تاہم مجھے اتنا یاد ہے کہ اس تاجر کی بھانجی ہے جس کا نام ایمن ہے یہاں کے حاکم کا ایک رشتہ دار جس کا نام طرق ہے شادی کرنا چاہتا ہے“۔

پہریدار نے چونک کر پوچھا ۔ ”تم کس غرض کے تحت اردیہ شہر سے آئے ہو“۔ احمد کہہ رہا تھا ۔ ”مجھے اس لڑکی ایمن کے باپ نے بھیجا ہے ۔ وہ خود آتا لیکن وہ بیمار پڑا ہے ۔ وہ اس شادی پر بخوشی راضی ہے ۔ اس نے مجھے اس لیے روانہ کیا ہے کہ میں اپنی موجودگی میں ایمن اور طرق کی شادی کرا دوں“

پہریدار نے خوش ہوتے ہوئے کہا ۔ ”تم ایک اچھی خبر لے کر آئے ہو ۔ اب دن رات سردی میں یہاں کھڑے ہو کر پہرہ دینے سے ہماری جان بھی چھوٹ جائے گی“
احمد نے فوراً اپنے کام کی نوعیت کو آگے بڑھانے کی غرض سے کہا ۔ ”کیا تم

اکیلے ہی یہاں پہرہ دیتے ہو ؟“

پہریدار نے جھک کر کہا ۔ ”نہیں میرے ساتھ تین جوان اور ہیں جو مکان کے تینوں اطراف میں کھڑے ہیں“۔

احمد نے منت کرنے کے انداز میں کہا ۔ ”تو پھر آؤ انہیں بھی یہ خوش خبری سنا دیں“۔ پہریدار نے فوراً اپنی ننگی اور سونتی ہوئی تلوار میان میں ڈالتے ہوئے کہا ۔ ”آؤ“

دونوں مکان کے دوسری طرف گئے جہاں ایک اور پہریدار کھڑا تھا ۔

جونہی وہ اس سے قریب گئے اور پہلے پہریدار نے دوسرے سے کچھ کہنا چاہا ۔ احمد نے ایک کوندے کی سی تیزی سے اپنے کمبل کے اندر سے تلوار نکالی اور دوسرے پہریدار کی گردن کاٹ دی ۔ پہلا پہریدار بدحواسی میں ابھی اپنی تلوار نکال ہی رہا تھا کہ احمد کی تلوار اس پر بھی گری اور اسے دو حصوں میں کاٹ گئی ۔ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور اس کی لاش زمین پر گر گئی تھی ۔

تیسرا پہریدار جو مکان کی مغربی سمت تھا اپنے ساتھی کی چیخ سن کر اس طرف بھاگا ۔ احمد مکان کی نکڑ پر کھڑا ہو گیا ۔ جونہی اس پہریدار نے موڑ مڑ کر اس طرف جانا چاہا جہاں اس کے دونوں ساتھیوں کی لاشیں پڑی تھیں ، احمد فوراً حرکت میں آیا اور جھپٹ کر اسے گردن سے پکڑتے ہوئے کہا ۔ ”اپنے چوتھے ساتھی کو اس طرف بلاؤ ، ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گا“

پہریدار بدحواس ہو گیا کیونکہ احمد نے گھات سے نکل کر ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی تلوار چھین لی تھی ۔

تیسرا پہریدار فوراً اپنے چوتھے ساتھی کو پکارنے لگا تھا ۔ احمد نے فوراً اس کا گلا گھونٹ کر اسے بھی ڈھیر کر دیا تھا ۔ چوتھا ساتھی بڑبڑاتا ہوا اسی سمت آ رہا تھا جب وہ موڑ مڑنے لگا تو احمد گھات سے نکلا اور اپنی تلوار کے پہلے ہی وار میں اس نے آخری پہریدار کو بھی ختم کر دیا تھا ۔

چاروں لاشوں کو اس نے مکان کے مغربی حصے میں ایک نشیبی جگہ میں ڈال

دیا تھا اور ان چاروں کی تلواریں اس نے اپنے قبضے میں کرنے کے بعد وہ مکان کے دروازے کی طرف بڑھا تھا۔



آسمان پر اسی طرح سیاہ تاریک بادل چنگاڑ رہے تھے۔ فضاؤں میں ایک سناٹا اور انتظار تھا۔ ایمن، عزبان، عبدہ اور اس کی ماں اپنی تیاری مکمّل کرنے کے بعد ایک کمرے میں اکٹھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر تیز دستک ہوئی۔

عبدہ فوراً اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور چونکتے ہوئے اس نے کہا۔ "دستک کی یہ صدا کیسی معجز نما ہے۔ میرا دل کہتا ہے شیر دل سمرون اپنا کام مکمّل کر چکا ہے اور فارغ ہو کر دروازے پر دستک دے رہا ہے۔"

ایمن بھی کھڑی ہو گئی اور اعتراض کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ کیونکر ممکن ہے۔ وہ اکیلا چار پہریداروں سے کس طرح نمٹ سکتا ہے۔ ضرور دستک دینے والا کوئی پہریدار ہے اور اس سرد بادل چنگاڑتی رات میں اسے کسی چیز کی ضرورت درپیش ہو گی۔"

عبدہ کی ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہاں کھڑے بحث کیوں کر رہے ہو جا کر دروازہ کھولو اور دیکھو دستک دینے والا کون ہے"۔ عبدہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ایمن نے اس کے پیچھے جاتے ہوئے کہا۔ "چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں"۔ دونوں دروازے پر آئے۔ عبدہ نے جب دروازہ کھولا تو انہوں نے دیکھا وہاں سمرون کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک بھاری اور بوسیدہ سے کمبل میں چھپا رکھا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں اس نے چار تلواریں پکڑ رکھی تھیں۔ عبدہ آگے بڑھ کر احمد سے لپٹ گیا اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔ مجھے اُمید تھی آپ ضرور آئیں گے"۔ عبدہ جب علیحدہ ہُوا تو ایمن نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "سمرون! سمرون! ہم سب اس گھر میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔"

احمد گردن جھکائے کھڑا تھا۔ ایمن کی شیریں آواز اسے یوں سُنائی دی جیسے دف پر نازک انگلیوں کی ضرب دِل نشین، جیسے سینۂ کوہسار سے کوئی جھرنا پھوٹتا ہو۔

ایمن نے اپنی آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ خاموش اور چُپ کیوں کھڑے ہیں، بولتے کیوں نہیں"۔

احمد نے گردن اُٹھا کر آسمان پر چمکتی برق کی روشنی میں ایمن کی طرف دیکھا۔ وہی چھریرہ، وہی کسیلا، چھبیلا اور مہکیلا بدن جیسے غنچوں نے جامۂ شبنم پہن لیا ہو۔

ایمن نے لہروں میں نغمے مرتعش کرنے والی اپنی میٹھی آواز میں پھر کہا۔ "آپ اندر آ جائیں نا، باہر کیوں کھڑے ہیں"۔

احمد اندر آ گیا۔ عبدہ نے دروازہ بند کر دیا اور دونوں احمد کو لے کر اس کمرے کی طرف بڑھے جہاں ان دونوں کی مائیں بیٹھی تھیں۔

کمرے میں لے جا کر عبدہ نے پوچھا "سمرون بھائی! باہر پہرہ دینے والوں نے آپ کو اندر کیسے آنے دیا؟" احمد نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چاروں تلواریں عبدہ کو تھماتے ہوئے کہا۔ "یہ تلواریں ان چاروں پہریداروں کی ہیں۔ میں نے ان چاروں کو قتل کر کے ان کی لاشوں کو آپ کے مکان کے مغرب میں ایک نشیب میں ڈال دیا ہے۔ اب دیر نہ کرو۔ آؤ سب یہاں سے بھاگ چلیں اگر دیر ہو گئی اور پہریداروں کے قتل ہونے کی خبر پھیل گئی تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکے گا۔"

عبدہ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تو پہلے ہی آپ کے انتظار میں تیار بیٹھے ہیں۔ ہم ابھی اور اسی وقت کُوچ کرنے کو تیار ہیں"۔

احمد نے مرنے والوں کی چاروں تلواریں ان چاروں میں بانٹتے ہوئے کہا۔ "یہ تلواریں آپس میں بانٹ لو۔ خطرے کے وقت یہ آپ لوگوں کے کام آئیں گی۔"

سامان کی چند چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں جو انہوں نے پہلے ہی باندھ رکھی تھیں اُٹھائیں اور مکان سے باہر نکل گئے۔

بادل آسمان پر اور زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ بجلی بار بار کوندتی اور آسمان

کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک روشنی کی لہر بناتی چلی جاتی تھی۔

احمد ان چاروں کو لے کر تاریک اور ویران گلیوں سے ہوتا ہوا بندرگاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سب دبے پاؤں اور خاموشی سے چل رہے تھے کہ کہیں کوئی آواز پیدا نہ ہو اور ان کے پکڑے جانے کے خطرات نہ اُٹھ کھڑے ہوں۔

جب وہ بندرگاہ پر آئے تو انہوں نے دیکھا وہ ویران پڑی تھی۔ صرف چند بڑے بڑے بادبانوں والے جہاز کنارے پر ہیولوں کی طرح کھڑے نظر آ رہے تھے

احمد ان چاروں کو بندرگاہ کے مغربی حصّے کی طرف لے گیا جہاں ان گنت چھوٹی بڑی کشتیاں کھڑی تھیں۔ شاید یہ ماہی گیروں کی کشتیاں تھیں۔ کنارے پر دُور دُور تک ببول کی جھونپڑیاں بنی تھیں جن کے اندر کہیں کہیں مختلف رنگوں کے خیمے بھی ایستادہ تھے۔

کنارے کی گیلی ریت پر چلتا ہوا احمد ایک کشتی کے پاس آ کر رُک گیا اور عبدہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "عبدہ! عبدہ! تم لوگ اس کشتی میں بیٹھ جاؤ۔ میں اس کے مالک کو بُلا کر لاتا ہوں"۔

احمد خیموں اور جھونپڑیوں کی طرف چلا گیا۔ ایمن، عبدہ اور دونوں کی مائیں کشتی میں سوار ہوئے۔ کشتی کا آدھا حصّہ ننگا تھا جب کہ دوسرے حصّے پر بارش اور دھوپ سے بچنے کی خاطر مخروطی چھت ڈال دی گئی تھی۔

وہ چاروں چھت دار حصّے میں بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئے تھے۔ فضاؤں میں مکمل خاموشی تھی۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گھن گرج جاری تھی اور اب موٹی موٹی بوندیں بھی پڑنے لگی تھیں۔ جلد ہی احمد کشتی کے مالک کو لے آیا جو ڈھلی ہوئی عمر کا ایک بوڑھا تھا۔

تھوڑی دیر تک وہ دونوں کشتی میں کھڑے ہو کر باتیں کرتے رہے پھر بوڑھے ملّاح نے کشتی کے دونوں جانب چپّو لگا دیئے اور دونوں چپّو چلا کر کشتی کو مغرب کی طرف لے جانے لگے تھے۔ عبدہ بھی ان کے پاس آ گیا تھا اور چپّو چلانے میں باری

باری ان دونوں کی مدد کرنے لگا تھا۔ بارش کے اِکّا دُکّا پڑنے والے قطرے بھی بند ہو گئے تھے۔

آدھی رات کے بعد آسمان صاف ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر قبل بادلوں اور ہواؤں کی رقابت کے اندھیرے میں جہاں چاندنی راکھ اور ستارے زخم زخم تھے وہاں اب چاروں طرف شبنم آلود چاندنی بکھر گئی تھی۔ آدھی رات کے بعد بھی وہ کافی دیر تک سمندر کے کنارے کنارے مغرب کی طرف سفر کرتے رہے یہاں تک کہ انہیں دُور آسمان پر ہلکی سی روشنی دکھائی دی اور وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

رات جب ختم ہو گئی اور سورج مشرق سے طلوع ہونے والا تھا تو انہوں نے کشتی روک دی۔ ان کے سامنے کنارے پر عمارۃ شہر کھڑا تھا۔ وہ سب کشتی سے اُتر گئے۔ احمد نے نقدی کی ایک تھیلی اس بوڑھے کو معاوضے کے طور پر دی جسے اس نے ایک بار کھول کر دیکھا اور خوش ہوتا ہوا اپنی کشتی میں بیٹھ گیا تھا اور اس کا رُخ موڑ کر اب وہ مشرق کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

ایمن احمد کے قریب آئی اور بڑی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "آپ نے اس بوڑھے کو معاوضے کے طور پر جو رقم دی ہے وہ آپ نے کہاں سے لی۔ ہمارے پاس نقدی کافی ہے، آپ نے ہم سے مانگ لی ہوتی"۔

احمد جو ٹکٹکی باندھے واپس جاتے ہوئے بوڑھے کو دیکھ رہا تھا، چونکتا ہوا بولا "تمہارے بابا نے مجھے کافی نقدی دی تھی جس میں سے اب بھی میرے پاس چند تھیلیاں بچ رہی ہیں"۔

عزیاں، عبدہ اور اس کی ماں بھی ان دونوں کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔ ایمن نے پھر احمد سے پوچھا۔ "آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ نے اِن چاروں پہریداروں کو کیسے ختم کر دیا"۔

احمد نے ایمن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیئے، آؤ اس شہر میں داخل ہوں اور یہاں سے اپنے لیے گھوڑے خرید کر اپنی منزل کی طرف بڑھ جائیں"۔

سب احمد کے ساتھ ہو لیے اور راستے میں وہ انہیں پہریداروں سے نمٹنے کی تفصیل سُنا رہا تھا۔ عمارہ شہر میں داخل ہو کر احمد نے سب کے لیے گھوڑے خریدے۔ وہاں رُکے بغیر وہ سوار ہوئے اور اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے وہاں سے کُوچ کر گئے تھے۔

ایک روز جب کہ مغربی صحراؤں کے اندر سے سُرخ اور خوفناک آندھی اُٹھ رہی تھی احمد ان چاروں کو لے کر آموص کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس وقت سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور تیز آندھی کے آثار آسمان پر پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مکان کا دروازہ کھلا تو آموص سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لمبے قد اور خوب بھرے ہوئے جسم کا جوان بھی تھا۔

اپنی بیٹی، بیوی، عبدہ اور اس کی ماں کو سلامت دیکھ کر آموص کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ایمن بھاگ کر اپنے باپ سے لپٹ گئی۔ جب وہ علیحدہ ہوئی، تو اس نوجوان نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا "تم کیسی ہو ایمن! میں دو دِن ہوئے جنگ سے لوٹا ہوں۔ تم لوگ اگر چند روز اور نہ آتے تو میں تمہاری طرف روانہ ہو چکا تھا"۔

ایمن کہہ رہی تھی "میں ٹھیک ہوں۔ تمہاری جنگ کا کیا ہُوا؟" اس جوان نے اُداس لہجے میں کہا "ہمیں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست ہوئی ہے۔ وہ تعداد میں بھی ہم سے کم تھے پھر نہ جانے وہ کون سی قوت ہے جس کی بِنا پر انہوں نے ہمیں شکست پر شکست دی ہے"۔

ایمن خاموش رہی۔ احمد اس کی باتوں سے خوش ہو رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ایمن کا منگیتر آسترو ہے۔ اتنی دیر تک آموص نے خود ہی اس جوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ آسترو ہے۔ میری بیٹی ایمن کا منگیتر"۔

احمد کی طرف دیکھتے ہوئے آسترو نے کہا۔ "ایمن کے بابا مجھے تمہارے متعلق پہلے ہی بہت کچھ بتا چکے ہیں۔ اس مہم کو سَر کر کے شاید غلام ہونے کی حیثیت سے تم نے پہلی بار کوئی

اچھا اور باوفار کام کیا ہوگا"۔

ایمن نے آسترو کی اس گفتگو کو سخت ناپسند کیا کیوں کہ غصّے کے باعث اس کی پیشانی پر بَل پڑ گئے تھے۔ آموص اور عزبان کے چہروں پر بھی ناپسندیدگی اور خفگی کے آثار نمایاں تھے۔

احمد نے ایک بار گہری اور غصیلی نگاہوں سے آسترو کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے اپنے گھوڑے کی خرجین سے نقدی کی دو تھیلیاں نکالیں اور انہیں آموص کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "آپ نے مجھے جو رقم دی تھی اس میں سے یہ بچ گئی ہے"۔

آموص نے مسکرا کر شفقت سے کہا "یہ تم اپنے پاس رکھ لو، تم اس کے حقدار ہو"۔ احمد نے تھیلیاں زبردستی آموص کو تھماتے ہوئے کہا "میں اس نیکی کا معاوضہ وصول کر کے اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا"۔ پھر اس نے پانچوں گھوڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ سارے گھوڑے بھی آپ کے ہیں انہیں میں نے آپ کی رقم سے خریدا تھا"۔

احمد جب مڑ کر واپس جانے لگا تو ایمن نے بے چین ہو کر کہا "سمرون! سمرون! رُکو، کھانا ہمارے ساتھ کھا کر جانا"۔ آموص نے بھی کہا۔ "رُک جاؤ بیٹے! میں تمہیں تمہارے غلام ساتھیوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔

احمد رُکے بغیر باڑے کی طرف چلا گیا۔ آسترو نے جل کر کہا "یہ کیسی حماقت ہے کہ آپ لوگ ایک غلام کو اس قدر اہمیت دے رہے ہیں۔ اگر وہ ایمن کو بچا کر لایا ہے تو کوئی احسان نہیں کیا۔ غلام ہوتے ہوئے یہ اس کے فرائض میں شامل ہے"۔

ایمن کے چہرے پر غصّے اور ناراضگی کا طوفان تھا۔ جس کا اندازہ آموص نے بھی لگا لیا تھا لہٰذا وہ سب کو مکان کے اندر لے گیا۔ آسترو گھوڑوں کو پکڑ پکڑ کر مکان کے اصطبل میں باندھنے لگا تھا۔

احمد جب باڑے میں داخل ہُوا تو مغربی صحراؤں سے اُٹھنے والے طوفان کا پہلا جھونکا باڑے کے اندر بکھرے ہوئے پتوں کو اڑاتا ہُوا گزر گیا تھا۔ طوفان اس قدر تیز تھا کہ بہت سے جانور جو بیٹھ کر جگالی کر رہے تھے گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ گو سورج

ابھی ابھی غروب ہوا تھا اور خمارِ شام ابھی پھیلنا شروع ہوا تھا لیکن طوفان کے باعث فضاؤں میں گہری اور مہیب تاریکی پھیل گئی تھی۔ آگے بڑھ کر احمد نے دیکھا وہ کوٹھڑیاں جن میں وہ، کردام اور انولو رہتے تھے تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

احمد نے شور کرتے ہوئے طوفان میں پکارا "کردام! کردام! انولو! انولو! تم دونوں کہاں ہو؟" چنگھاڑتے تیز طوفان میں احمد کی آواز بکھر کر رہ گئی تھی اور اسے کوئی جواب نہ ملا تھا۔ احمد آگے بڑھا۔ یک دم ہی وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ جس کوٹھڑی میں کردام اور انولو رہتے تھے وہاں سے اسے سسکیوں کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ دم توڑتی مگر گہری سسکیاں!

احمد اس کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا وہاں انولو اکیلا بیٹھا سسک رہا تھا۔ احمد کو دیکھتے ہی وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور اپنے بہتے آنسوؤں کو اس نے فوراً روک لیا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے احمد سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ "سمرون! سمرون! تم کب آئے ہو؟"

احمد نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی ابھی آیا ہوں۔ لیکن تم یہاں اکیلے بیٹھے سسک کیوں رہے تھے اور ہاں کردام کہاں ہے؟"

انولو نے پیچھے ہٹتے ہوئے دکھ سے کہا۔ "اب وہ یہاں نہیں ہے"۔ احمد نے بوکھلا کر کہا۔ "کیا مطلب؟" انولو نے پھر سسکتے ہوئے کہا۔ "آسترو جو آموص کی بیٹی کا منگیتر ہے اس نے کردام کو قتل کر دیا ہے"۔ احمد نے شور کرتی غصیلی آواز میں پوچھا۔ "کب؟ کیسے اور کیوں؟"

انولو کہہ رہا تھا۔ "یہ کل کی بات ہے۔ کردام کچھ بیمار تھا لہٰذا میں اسے گھر چھوڑ کر اکیلا ہی ریوڑ لے گیا تھا۔ آسترو نہ جانے کس غرض سے باڑے کی طرف آیا۔ اس وقت کردام عصر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ آسترو نے اسے نماز پڑھتے دیکھ لیا اور سمجھ گیا کہ وہ مسلمان ہے۔ لہٰذا وہ اسے نماز سے ہی گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ وہ بیچارہ بیمار تھا اس لیے کوئی مزاحمت نہ کر سکا۔ جس وقت میں ریوڑ لے کر آیا آسترو نے کردام کو ایک ستون سے باندھ رکھا تھا اور اسے مار رہا تھا۔ میں نے اپنے بھائی کو بچانا چاہا لیکن کسی نے میری فریاد نہ سنی۔

کردام انہیں کہہ رہا تھا کہ میں اکیلا مسلمان ہوں۔ سمرون یہودی اور انولو بت پرست ہے اور میں ان سے چوری چھپے نماز پڑھتا ہوں لہٰذا انہوں نے مجھ سے کوئی باز پرس نہیں کی لیکن کردام کو اس نے اذیتیں دے دے کر مار دیا۔ وہ بار بار کردام سے کہتا تھا۔ (خاکم بدہن)، تمہارا بدو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تمہاری مدد کر سکتا ہے تو اسے پکارو۔"

احمد کا چہرہ غصے میں عرق عرق ہو گیا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی تلوار بے نیام کرتے ہوئے کہا۔ "آسترو بکتا ہے۔ میرے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ستم زدہ بشریت کے محسن، آبروئے دہر اور جانِ عالم ہیں۔ وہ وہی ہیں جن کا زمانہ ازل سے منتظر تھا۔ وہ مرادِ عمران و موسیٰؑ۔ آرزوئے عیسیٰؑ و مریمؑ اور منشاءِ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ ہیں۔ وہ وہی ہیں جنہیں زبانِ وحی نے مزمل کہہ کر پکارا اور جن کا پیغام دِل کے راستے روح میں داخل ہوتا تھا۔"

احمد ذرا رکا پھر وہ طوفانی انداز میں کہہ رہا تھا۔ "انولو! انولو! تم فکر مند نہ ہو۔ میرے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جمیل و اجمل، کریم و مکرم اور مکمل و اکمل ہیں۔ وہ متاعِ لوح و قلم، شیرینیٔ کوثر و زم زم اور سحابِ رحمت ہیں۔ تم دیکھو گے ان صحراؤں کے اندر آسترو کے لیے میں ایک گہرا آلام اور مہیب طوفان بن جاؤں گا۔"

انولو نے دکھ سے کہا۔ "آہ کردام! وہ ایک مخلص بھائی اور میرے لیے شفیق باپ جیسا تھا۔"

احمد نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں کردام کا انتقام لوں گا۔ آج ہی کی رات۔ ہاں آج ہی کی طوفانی رات میں"۔

احمد نے کوٹھڑی میں پڑی ہوئی ایک چادر اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ انولو اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ احمد باڑے کے اندر گیا اور ایک اونٹ کے منہ پر ڈھاٹا چڑھانے لگا۔ انولو نے پریشانی سے پوچھا۔ "یہ کیا کرنے لگے ہو؟"

احمد نے کہا۔ "اس اونٹ کے منہ پر ڈھاٹا چڑھا رہا ہوں تاکہ طوفانی رات میں

اس کے مُنہ میں ریت نہ جائے کیوں کہ اسی اونٹ پر سوار ہو کر میں آسترو سے انتقام لوں گا۔ سنو! سنو! انولو! آسترو اس وقت آموص کے گھر ہے۔ جب وہ یہاں سے نکل کر مستقر کی طرف جائے گا تو میں اسے ریگستان کی اس پٹی کے اندر روک لوں گا جو شہر اور چھاؤنی کے درمیان پڑتی ہے اور وہاں اُسے اذیتیں دے کر ماروں گا۔"

انولو نے فکر مند ہو کر پوچھا۔" لیکن طوفان سخت تیز اور خطرناک ہے اور ریگستان میں ریت بُری طرح اُڑ رہی ہوگی۔"

احمد نے قہر آلود آواز میں کہا۔" یہ طوفان اس طوفان سے تو زیادہ تیز اور بھیانک نہیں جو آسترو نے میرے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بول کر میرے دل، ضمیر اور ذہن میں کھڑا کیا ہے۔"

انولو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔" اگر آسترو رات یہیں رہا اور مستقر میں واپس نہ گیا تو پھر۔" احمد نے بیٹھے ہوئے اُونٹ کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔" تو پھر میں آموص کے گھر میں گھُس کر آسترو کو قتل کر دوں گا۔"

انولو نے نیا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔" آسترو کے ساتھ فریس بھی اس جرم میں شامل ہے۔ وہ بھی ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بولتا رہا ہے اور کردام پر مظالم کرتا رہا ہے۔"

احمد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔" فریس بھی آج رات میرے انتقام کا شکار ہو جائے گا۔"

انولو نے فضاؤں میں اُڑتی ریت سے بچنے کے لیے اپنے عمامے کے پلّو سے اپنی آنکھیں اور چہرہ ڈھانپتے ہوئے کہا۔" سمرون! سمرون! آسترو تو خوب مسلّح ہے اس کے سر پر خود اور جسم پر زرہ بکتر ہے جب کہ ——

اس کی بات کاٹتے ہوئے احمد نے اپنے عمامے کے پیچ اوپر اُٹھائے اور اندھیرے میں انولو کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر کے قریب لے گیا۔ انولو نے محسوس کیا کہ عمامے کے نیچے احمد نے خود پہن رکھا تھا۔ پھر احمد نے اپنا اُوپر کا لبادہ ہٹا کر دکھایا۔ وہ اپنے جسم پر ایک نئی

زرہ پہنے ہوئے تھا۔ قبل اس کے انولو کچھ پوچھتا۔ احمد نے خود ہی کہا۔" یہ زرہ بکتر اور خود میں نے قرطاجنہ شہر سے خریدے تھے۔ اس کے علاوہ ——

احمد کہتے کہتے خاموش ہو گیا کیونکہ اس گہری، طوفانی اور اندھیری رات میں باڑے سے باہر اُسے کسی کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ احمد نے فوراً انولو کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچتا ہوا وہ بیٹھ کر جگالی کرتے چند اونٹوں کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے انولو کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

" کوئی باڑے کے اندر آ رہا ہے۔ اگر کوئی تمہیں یا مجھے پکارے تو مت بولنا یہیں بیٹھے رہنا۔ اگر آنے والے فریس یا آسترو ہوئے تو اس طوفانی رات میں اس باڑے کے اندر ہی ان سے نمٹ لوں گا۔" احمد خاموش ہو گیا اور آنے والوں کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد دو سائے باڑے میں نمودار ہوئے پھر کسی نے اندھیرے کے اندر سرگوشی، پیار اور شفقت سے پکارا۔" سمرون! سمرون!" احمد آواز کو پہچان گیا۔ وہ آموص تھا اور اس کے ساتھ امین بھی تھی۔

آموص نے تین چار بار احمد کو پکارا۔ جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو امین کی فکر مند آواز ہواؤں کے دوش پر بلند ہوئی۔" اے میرے باپ! سمرون کہاں چلا گیا ہے میں تو اس کے لیے کھانا بھی لے کر آئی ہوں۔ اس نے ابھی تک شام کا کھانا بھی نہ کھایا ہو گا۔" آموص کی فکر مند سی آواز سنائی دی۔" انولو بھی نہیں ہے۔ شاید وہ دونوں کہیں چلے گئے ہیں"۔

امین نے پریشان اور بکھری ہوئی آواز میں پوچھا۔" لیکن اس طوفانی رات میں وہ کہاں جا سکتے ہیں"۔ آموص کہہ رہا تھا۔" میرا خیال ہے انولو نے سمرون کو کردام کے قتل کرنے کی ساری داستان کہہ دی ہوگی اور اب وہ دونوں گھات میں چلے گئے ہوں گے تاکہ موقع پا کر آسترو کو قتل کر دیں"۔

ان کی گفتگو سے احمد نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آموص نے سارے حالات امین سے کہہ دیئے ہیں۔

"امین کی پریشان آواز پھر فضاؤں میں اُبھری" بابا! بابا! آسترو نے کردام کو قتل کر کے بہت بڑی غلطی اور نہایت قبیح حرکت کی ہے۔ اگر وہ مسلمان ہو گیا تھا تو پھر کیا ہوا اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا۔ اگر آسترو کے لشکر نے مسلمانوں سے ہزیمت اٹھائی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں جو مسلمان نظر آئے اُسے قتل کر دیا جائے۔

آموص نے پریشانی میں کہا" میں تو اس وقت سے ڈر رہا ہوں جب سمرون آسترو پر حملہ آور ہوگا" امین نے پوچھا" آپ کے خیال میں کون کس کو زیر کر لے گا؟"

آموص نے پھر فکرمندی سے کہا" میں ابھی تک یہ فیصلہ تو نہیں کر سکا کہ کون کسے زیر کر لے گا لیکن میرے دل کی آواز ہے کہ سمرون زبردست ثابت ہوگا۔ وہ قد میں آسترو سے لمبا اور اس کا جسم بھی کڑا ہے اور پھر وہ عرب ہے۔ تلوار عرب کی ساتھی اور جنگ اسے جبلت کے طور پر ملتی ہے"۔ آموص نے دو تین بار اور احمد کو پکارا جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ دونوں واپس چلے گئے تھے۔

اُداس اور پریشان پریشان سے وہ دونوں باپ بیٹی اپنے گھر داخل ہوئے اور اس کمرے میں گئے جس کے اندر عزبان، عبدہ، آسترو اور عبدہ کی ماں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اندر آتے ہی آموص نے آسترو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" آسترو! آسترو اپنے مستقر واپس جانے کے بجائے آج رات یہیں رہو۔ میرے خیال میں انولو نے کردام کی موت کے سارے واقعات سمرون سے کہہ دیئے ہیں۔ اس وقت سمرون باڑے میں نہیں وہ کہیں چلا گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ تم سے انتقام لے۔"

آسترو نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اگر پہلے میں نے نہیں جانا تھا تو اب میں ابھی اور اسی وقت طوفان کی پرواہ کیے بغیر واپس اپنے مستقر جاؤں گا۔ آپ بے فکر رہیں وہ غلام میرے حملوں کی تاب نہ لا سکے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر اس نے اس طوفانی رات میں مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی تو میں اُسے کاٹ کر رکھ دوں گا" امین اور عبدہ دونوں اُداس اور پریشان ہو گئے تھے۔

غصے کی حالت میں آسترو فوراً اصطبل میں آیا اور وہاں سے اپنا گھوڑا کھول کر

روانگی پر آمادہ ہو گیا تھا گھر کے سب افراد اسے دروازے تک چھوڑنے آئے تھے جب وہ اندھیرے میں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو آموص نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ احمد اور انولو اسی طرح باڑے میں بیٹھے تھے کہ انہوں نے آسترو کو جاتے ہوئے دیکھ لیا۔

احمد فوراً کھڑا ہو گیا اور انولو سے کہا۔" انولو! انولو! میرے بھائی! تم یہیں ٹھہرو۔ آسترو جا رہا ہے میں اس کا تعاقب کرتا ہوں۔ انولو نے ضد کرتے ہوئے کہا" میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ آسترو بہت ظالم اور طاقتور ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو ——

احمد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا" تم یہیں رہو۔ آسترو اگر ایک قیامت ہے تو بھی آج کی رات میں اسے زیر کر لوں گا"

انولو خاموش رہا۔ احمد نے اونٹ کی گردن پکڑ کر ایک جست لگائی اور دوسرے ہی لمحے وہ اونٹ کی ننگی پیٹھ پر سوار تھا۔ اونٹ کو ہانک کر احمد نے باڑے سے باہر نکالا اور سانپ کی طرح آسترو کا تعاقب کرنے لگا۔

طوفان اپنے زور پر تھا۔ آندھی سے شہر کے دروازوں کے بجنے کی تیز آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ درخت یوں جھک جھک کر کانپ رہے تھے جیسے زلزلوں سے عمارتوں کا بدن ہلنے لگا ہو۔ فضاؤں میں ریت ہی ریت اُڑ رہی تھی۔ لگتا تھا تند جھونکوں کی یلغار کے سامنے زمین زندگی کی ساری تمازت سے محروم ہو کر بے حس و بے جان ہو گئی ہو۔

احمد بڑی تیزی سے آسترو کا تعاقب کر رہا تھا۔ شہر اور مستقر کے درمیان جو ریگستان کی ایک لمبی پٹی حائل تھی جب آسترو اس میں داخل ہوا تو احمد اس کے سر پر جا پہنچا اور تیز غصیلی آواز میں کہا" ٹھہرو! تمہاری سعی ختم ہوئی۔ اب صحرا کی یہ پٹی تمہارے لیے موت کا میدان ثابت ہوگی"۔

آسترو نے فوراً اپنے گھوڑے کو روک لیا۔ اس کے ہاتھ میں پہلے ہی ننگی تلوار تھی جسے اس نے ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔" مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ یہ طوفانی رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہوگی۔ اگر تم کردام کا انتقام مجھ سے لینے آئے ہو تو تم احمق ہو۔ آسترو نے

زندگی میں کسی سے شکست قبول نہیں کی اور نہ ہی ان صحراؤں کے اندر کسی نے میری تلوار کی تیزی اور اس کی کاٹ کا زیادہ دیر سامنا کیا ہے"۔

اس کے ساتھ ہی آسترو نے اپنی ڈھال بھی سنبھال لی اور گھوڑے سے نیچے کودتے ہوئے اس نے کہا" نیچے اُترو' اس اندھیری اور طوفانی رات میں تمہیں مقابلے کی دعوت دیتا ہوں"۔

احمد نے پشت پر لٹکتی ہوئی اپنی ڈھال سنبھالی - ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے اپنی لمبی اور بھاری پھل کی تلوار کھینچی اور اونٹ سے نیچے کود گیا -

آسترو مقابلے کے لیے مستعد ہو گیا تھا - احمد نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا" اے تخم غلیظ ! تو نے کردام سے کہا تھا (خاکم بدہن) تمہارا بدو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تمہاری مدد کر سکتا ہے تو اسے پکارو - تو نے میرے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کی ہے - تمہارا قتل مجھ پر فرض ہو چکا ہے"۔

آسترو نے چونکتے ہوئے پوچھا" کیا تم بھی مسلمان ہو"۔ احمد نے اور آگے بڑھتے ہوئے کہا" بحمداللہ ! میں مسلمان ہوں - کردام اور انولو نے بھی میری ہی ترغیب پر اسلام قبول کیا تھا - اے فواحش و منکرات کے عادی شیطان ! تو نے میرے رسولؐ کی اہانت کی ہے اس رسولؐ کی جو مجسم امن و امان اور خیر و مہر تھے - وہ عظیم و معظم اور درسگاہ جہاں کے معلم اعظم تھے"۔ آسترو نے حملہ کرنے کے انداز میں آگے بڑھتے ہوئے کہا" اگر تم مسلمان ہو تو تمہیں قتل کر کے میں ابدی سعادت حاصل کروں گا - میں وار برساتا ہوں اگر روک سکتے ہو، تو روک کر دکھاؤ"۔

آسترو نے احمد پر وار کیا جسے احمد نے بآسانی اپنی ڈھال پر روک لیا اور آسترو پر جوابی حملہ بھی کر دیا - آسترو پریشان ہو گیا تھا - ایک تو احمد نے اس کا وار بڑی آسانی سے روک دکھایا تھا - دوسرے اس کے حملہ آور ہونے کا انداز آسترو سے کہیں زیادہ تیز اور خطرناک تھا - صحرا کے اندر ریت اسی طرح اڑ رہی تھی اور دونوں کو اس دوسرے کا وار جانچنے میں دقت پیش آ رہی تھی - اچانک احمد نے اپنے حملوں میں اور زیادہ تیزی پیدا کر لی تھی بالکل اس

طوفان کی طرح جو اس وقت ہر چیز کو اُڑائے لیے جا رہا ہو -

ایک موقع پر جب آسترو نے ایک خطرناک وار احمد پر کیا تو احمد نے اس کا وار اپنی ڈھال پر روکنے کی بجائے تلوار پر لیا اور ساتھ ہی پلک جھپکنے میں اڑتی ریت اور اندھیرے کی اوٹ میں اس نے اپنی ڈھال آسترو کے اس ہاتھ پر دے ماری جس اس نے تلوار تھام رکھی تھی - ڈھال ایسی زور دار پڑی کہ آسترو کے منہ سے سوکھے پتوں کی سی آواز جیسی ایک درد انگیز سسکی نکل گئی اور اس کی تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ریت پر گر گئی تھی -

احمد نے اپنی تلوار کی نوک فوراً اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا" اے غلام شکم ! تو تھوڑی دیر قبل تک کیا فضول گھمنڈ و لاف زنی اور اپنی شجاعت اور دلیری کی باتیں کر رہا تھا - دیکھ تیغ زنی کے اس مقابلے میں تیری رقابتوں کے اندھیرے کو میں نے کیسا دھو ڈالا ہے - مقابلے کی ابتدا کرتے ہوئے تم نے تلوار برسائی تھی اور میں نے روک دی تھی - دیکھ اب میں تم پر تلوار برساتا ہوں اگر روک سکتا ہے تو روک کر دکھا"۔

آسترو فوراً مستعد ہو گیا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں ڈھال لے کر اس نے اپنے جسم کا اوپر کا حصہ ذرا نیچے جھکا لیا - احمد نے اپنی تلوار بلند کر کے گرائی - آسترو نے اسے اپنی ڈھال پر لینا چاہا کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ احمد اس کے شانے پر تلوار گرانا چاہتا تھا لیکن تلوار بالکل قریب لا کر احمد نے اس تیزی، مہارت اور قوت سے اپنی تلوار کا رُخ بدلا کہ اس کی تلوار ایک تیز سنسناہٹ کے ساتھ آسترو کی کمر پر گری اور اسے دو حصوں میں کاٹتی چلی گئی تھی - احمد نے آسترو کی لاش کو پاؤں کی ایک ٹھوکر مارتے ہوئے -" تیرے جیسے دو فرعون بھی اگر ہوتے تو اس ریگستانی طوفان میں انہیں زیر کر کے رکھ دیتا"۔

احمد نے پہلے اپنی تلوار صاف کر کے میان میں ڈالی پھر اس نے آسترو کی تلوار اور ڈھال بھی اپنے قبضے میں کر لی تھی - اونٹ کو زمین پر بیٹھانے کے بجائے اس کی گردن پکڑ کر اس نے ایک زہریلی جست لی تھی اور اس پر سوار ہو گیا - احمد نے اونٹ کا رُخ موڑا اور اسے ایک سخت مہمیز لگا کر شہر کی طرف بھگانے لگا تھا - اندھیری اور طوفانی رات میں آسترو کا گھوڑا اپنے آپ کو اکیلا دیکھ کر خود بخود اونٹ کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا تھا

اونٹ کو بھگاتا ہوا احمد شہر میں داخل ہوا اور کسیلہ کے پتھریلے محل کے وسیع احاطے میں داخل ہو کر اس نے اونٹ کو فرلیس کے گھر کی دیوار کے پاس روک دیا۔ کسیلہ کے ریوڑوں کا باڑا اور اس کے اہل کاروں کے مکانات چونکہ محل کی پشت پر واقع تھے اور وہاں آمد و رفت کا دروازہ علیحدہ تھا لہٰذا پہریداروں کی کسی قسم کی روک اور رکاوٹ کا کوئی خطرہ نہ تھا اونٹ کی مدد سے وہ دیوار پر چڑھا اور اندر کود گیا۔

ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اس کے اندر فرلیس اور اس کے ماں باپ سو رہے تھے۔ احمد اپنی تلوار بے نیام کرتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا اور اپنی تلوار کا دستہ اس نے سوئے ہوئے فرلیس کے شانے پر مارتے ہوئے کہا۔ "اٹھو! تمہاری بداعمالیوں کے حساب کا وقت آگیا ہے"۔ فرلیس ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے ماں باپ ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔

احمد نے زہریلی آواز میں کہا۔ "تو نے میری غیر موجودگی میں نہ صرف آسترد کے ساتھ مل کر دام کو اذیتیں دے دے کر مارا بلکہ مسلمانوں کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مضحکہ اڑایا۔ تو واجب القتل ہے"۔ احمد نے تلوار لہرا کر گرائی اور فرلیس کی گردن کاٹ دی۔ فرلیس کی دم توڑتی آواز کی تند لہریں کمرے میں گونج گئی تھیں اور اس کے ماں باپ اسی طرح سوئے پڑے تھے۔ اتنی دیر تک احمد باہر نکل چکا تھا۔ اس نے بھاگ کر دیوار پھلانگی اور اونٹ کو لے کر باڑے کی طرف بھاگ گیا تھا۔

انولو ابھی تک باڑے میں کھڑا بڑی بے چینی سے احمد کا انتظار کر رہا تھا۔ جونہی احمد باڑے میں داخل ہوا اس نے بھاگ کر اونٹ کی نکیل اس کے ہاتھ سے لے لی اور اونٹ کے گھٹنے پر نکیل کی رسی مار کر اونٹ کو بٹھانے کے بعد وہ بھاگ کر احمد کے پاس آیا اور سرگوشی میں پوچھا۔ "کیا ہوا سمرون!"

احمد نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے آسترو اور فرلیس دونوں کو قتل کر دیا ہے۔ تم نے کوئی چیز لینی ہو تو لے لو اور آؤ یہاں سے بھاگ چلیں تاکہ کسی کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ کہ میرا نام سمرون نہیں احمد ہے۔ آؤ

یہاں سے بھاگ چلیں"۔

انولو وہاں سے ہٹنا ہی چاہتا تھا کہ باڑے کی بھیڑوں کے اندر سے کوئی اٹھا اور دھیمی سی آواز میں اس نے کہا۔ "ٹھہرو!"

احمد اور انولو دونوں نے اپنی تلواریں سنبھال لیں۔ بھیڑوں کے اندر سے اٹھنے والے نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ "احمد! احمد! اپنی تلوار میان میں کر لو۔ میں عبدہ ہوں بخدا یہ جاننے کے باوجود کہ تم مسلمان ہو اور آسترد کے علاوہ فرلیس کو بھی قتل کر چکے ہو میں خوش ہوں۔ تم نے ہمیں قرطاجنہ کی مصیبت سے رہائی دلائی تھی۔ تم میرے بھائی ہو اور میں اپنے بھائی سے دھوکہ نہیں کر سکتا"۔

احمد اور انولو دونوں نے اپنی تلواریں نیام میں کر لیں۔ عبدہ قریب آیا اور احمد سے لپٹتے ہوئے اس نے کہا۔ "اے میرے بھائی! یہاں سے نکل کر تم کس طرف جاؤ گے تاکہ میں آنے والے دور میں تم سے مل سکوں"۔

احمد نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ہماری منزل اپنے مسلمان جرنیل عقبہ بن نافع کا لشکر ہے جو افریقہ کی شیطانی قوتوں کے خلاف برسرپیکار ہے"۔

عبدہ نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں ٹھہرو! میں تمہارے لیے نقدی اور زادِ راہ لے کر آتا ہوں۔ اس قدر طویل سفر بغیر زادِ راہ کے تمہارے لیے مشکل ہوگا"۔

احمد نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "عبدہ! عبدہ! رک جاؤ۔ اس طرح ایمن اور اس کے ماں باپ کو خبر ہو جائے گی کہ میں نے آسترد کو قتل کر دیا ہے۔ لہٰذا میرا یہاں سے سلامتی کے ساتھ بھاگ نکلنا مشکل ہو جائے گا"۔

عبدہ دوبارہ قریب آیا اور سرگوشی میں احمد سے کہا۔ "احمد! احمد! تم کیسے نادان اور بے خبر ہو۔ ایمن تمہیں پسند کرتی ہے۔ اسے آسترد کی موت کا کوئی دکھ اور غم نہ ہوگا بلکہ اسے یہ سن کر خوشی ہوگی کہ تم نے آسترو کو قتل کر دیا ہے۔ اس لیے کہ آسترد ایک زنجیر تھی جو زبردستی اس کے پاؤں میں ڈال دی گئی تھی۔

سنو احمد! جس وقت تم اپنے اونٹ پر سوار ہو کر آسترد کے پیچھے گئے تھے میں

اور امین اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر تمہیں دیکھ رہے تھے ۔ اس عرصے میں وہ بیچاری رو رو کر تمہاری سلامتی اور کامیابی کی دعائیں مانگتی رہی ہے ۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے ہی باڑے میں داخل ہوا ہوں ۔ امین تمہارے لیے زادِ راہ تیار کر چکی ہو گی کیونکہ ہم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آسترو کے قتل کے بعد تمہارا یہاں سے بھاگ جانا ہی ضروری ہے ۔ امین کے ماں باپ بھی تمہارے حق میں ہیں" ۔ پھر عبدہ نے انولو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

"انولو ! انولو ! تم ایک اونٹ پر کجاوہ ڈالو اور اسے لے کر محل کے احاطے سے باہر کھڑے ہو جاؤ ۔ احمد ! تم یہیں کھڑے ہو کر میرا انتظار کرو ۔ میں ابھی آتا ہوں" ۔

عبدہ چلا گیا ۔ انولو نے جلدی جلدی ایک توانا اونٹ پر کجاوہ ڈالا اور اس کی مہار پکڑ کر وہ محل کے احاطے سے باہر نکل گیا تھا ۔ احمد وہیں کھڑا رہا اور عبدہ کا انتظار کرتا رہا ۔

طوفان کا زور اب ٹوٹ چکا تھا ۔ اور چنگاڑتے طوفان اور سنسناتی آندھی نے اب تیز ہوا کی شکل اختیار کر لی تھی ۔ لگتا تھا زمین کے نگران عناصر پر خواب اور خوابیدہ ہونے لگے ہوں ۔

احمد اسی طرح باڑے میں کھڑا تھا کہ اسے دو سائے اپنی طرف آتے دکھائی دیئے ۔ جب وہ نزدیک ہوئے تو وہ پہچان گیا کہ وہ عبدہ اور امین تھے ۔ عبدہ دور ہی کھڑا رہا اور امین اکیلی آگے بڑھی ۔ شاید اس طرح وہ دونوں کو کھل کر گفتگو کرنے کا موقع فراہم کرنا چاہتا تھا ۔

امین چپ چاپ احمد کے سامنے آ کھڑی ہوئی ۔ اس کی آنکھوں میں جذبات کا ایک طوفان اور چاہت کا سندیس تھا لیکن وہ خاموش اور چپ تھی جیسے اس کے خیالات کی سانس رک گئی ہو اور تصورات کا ماتھا سنگ اٹھا ہو ۔ غیب و شہود کے سنگم کی طرح حسین اور اتصال عبودیت و ربوبیت کی طرح پرکشش امین اس موقع پر درد کے ٹوٹتے ہوئے کسی ستارہ کی طرح غمگین اور ٹوٹ کر بکھرے ہوئے آئینے کی طرح افسردہ کھڑی تھی ۔

احمد نے اسے پکارا ۔ "امین ! امین !" ـــــ امین نے اپنی جھکی ہوئی پلکیں اٹھائیں اور ایک نیم نگاہ احمد کے چہرے پر ڈالی ۔ اندھیرا ہونے کے باوجود احمد نے دیکھ لیا کہ امین کی سرشار و پرخمار آنکھوں میں آنسو منڈلا رہے تھے ۔ احمد نے دردمندی سے کہا "مجھے افسوس ہے آسترو میرے ہاتھوں مارا گیا ہے ۔ کاش اس نے کردام کو قتل نہ کیا ہوتا ۔ کاش اس نے اس پیغمبر کے خلاف بد زبانی نہ کی ہوتی جو زیر دستوں کے لیے بیعت گاہ اور زیردستوں کے لیے پناہ گاہ تھے ۔

امین نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور کسی قدر سنبھلتے ہوئے اس نے اپنی وہی مسحور کن اور کشش انگیز آواز میں کہا ۔ "آسترو کے قتل پر آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے ۔ وہ شریک ابلیس اور غلام شکم انسان تھا ۔ میں زبردستی اس سے منسوب کی گئی تھی ۔ اس میں میری مرضی شامل نہ تھی ۔ اس نے آج سے ایک سال قبل مجھے کہیں دیکھا اور کسیلہ سے میرے ساتھ شادی کرنے کا اظہار کیا ۔ کسیلہ نے فوراً میرا عندیہ لیے بغیر میری اور اس کی منگنی کر دی ۔ اس لیے کہ وہ کسیلہ کا ایک ہر دل عزیز جرنیل تھا ۔ کاش میں اس وقت اس کی زندگی کی آنکھوں کی بے بسی دیکھتی جب وہ آپ کے ہاتھوں شکست کھا رہا تھا ۔ وہ ظلمتوں کا رہبر اور منکرات و فواحش کا پرچم تھا ۔ اسے سرنگوں کرنے پر میں آپ کو مبارک باد دیتی ہوں" ۔

احمد نے رکتے رکتے کہا ۔ "امین ! امین ! میں نے تم لوگوں سے جھوٹ کہا تھا ۔ میں یہودی نہیں مسلمان ہوں اور ایسا میں نے ایک مصلحت کے تحت کہا تھا" ۔

ہلکا ہلکا مسکراتے ہوئے امین نے کہا ۔ "کردام کی موت سے ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ مسلمان ہیں ۔ اس کے علاوہ عبدہ بھی مجھے آپ سے متعلق بہت کچھ بتا چکا ہے ۔ عبدہ کہہ رہا تھا آپ نے فرلیس کو بھی قتل کر دیا ہے ۔ کاش حالات ایسے ہوتے کہ میں آپ کو یہاں روک سکتی ۔ صبح جب آسترو اور فرلیس کے قتل کی خبریں پھیلیں گی تو سب سے پہلے آپ پر شک کیا جائے گا اور آپ کو کسی نے پکڑ لیا تو یہ میری موت کا باعث ہو گا ۔ کاش حالات ایسے ہوتے کہ میں آپ کا ساتھ دے سکتی ۔ میں ثابت کر سکتی کہ وقت

کے تیز طوفان بھی مجھ سے آپ کی یادوں کے بادلوں کو اور آپ کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کی صداؤں کو چھین نہیں سکتے ۔ آہ ہم دستور کے پابند ہیں ۔

احمد نے ایمن کے دونوں ہاتھ تھام لیے ۔ ایمن کا پورا جسم کپکپا اُٹھا تھا اور اس نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی ۔ احمد کہہ رہا تھا ۔ "ایمن ! ایمن ! میں ایک ایسا بدقسمت مسافر ہوں جس کے پاس چند موہوم اُمیدوں اور آلام کے مہیب سایوں کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ کاش میں یہاں ایک مجرد اکائی اور غلام نہ ہوتا ۔ قسم مجھے خداوندِ لم یزل کی میں اگر آج اپنوں میں ہوتا تو میں تمہیں راحتوں اور خوشیوں کا پیغام دیتا لیکن اس موقع پر جب کہ میں تم سے ایک بے بس طائر کی طرح جُدا ہو رہا ہوں، میں تمہیں سپنوں کے باغات نہیں دکھا سکتا ۔ میری منزل اب شمال مغرب کی وہ وادیاں ہیں جہاں فرزندانِ توحید پرستانِ باطل کے خلاف ہولناک بلغار میں مصروف ہیں ۔ ایمن ! ایمن ! کیا تم میرا انتظار کرو گی ؟"

ایمن کے لب جنبش میں آئے اور ایک شعوری کشش میں اس نے کہا ۔ "احمد ! احمد ! آپ اس قدر مایوس اور افسردہ کیوں ہوتے ہیں ۔ ربِ لازوال کی قسم میں آپ کا انتظار کروں گی ۔ یادوں کی جلتی چتاؤں میں آپ کی واپسی کے انتظار میں ساری کلفتیں، ساری پریشانیاں میں بھول جاؤں گی ۔"

ایمن ذرا رُکی پھر وہ جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی ۔ "خدا کی قسم ! میں شمشیروں کی چھاؤں، بے کفنائی ہوئی لاشوں، وقت کے تیز طوفانوں اور موت کے سایوں میں بھی کھڑی ہو کر آپ کا انتظار کروں گی ۔ موت کے سوا دنیا کی کوئی طاقت مجھے آپ سے چھین نہ سکے گی ۔"

احمد نے ایمن کے تھامے ہوئے ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا ۔ "ایمن ! ایمن ! میں تمہیں مایوس نہ کروں گا ۔ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ اس سے بھی کہیں بہتر حالت میں ملنے میں تمہارے پاس آؤں گا ۔ اب مجھے اجازت دو میں جاتا ہوں ۔ عبدہ میرا منتظر کھڑا ہے اور اس احاطے سے باہر انولو اونٹ کی مہار تھامے میرا انتظار کر رہا ہو گا ۔"

ایمن نے اپنے لباس کے اندر سے کوئی چیز نکالتے ہوئے کہا ۔ "میرے بابا بھی

وہیں کھڑے آپ کا انتظار کر رہے ہیں ۔" پھر اس نے ایک تھیلی احمد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ۔ "یہ آپ اپنے پاس رکھ لیں اس میں سنہری سکے ہیں جو اس پُر آشوب دور میں آپ کے کام آئیں گے ۔"

احمد ہچکچا رہا تھا ۔ ایمن نے زبردستی نقدی کی وہ تھیلی احمد کو تھماتے ہوئے کہا ۔ "آپ اب مجھ سے کوئی چیز لیتے ہوئے کیوں ہچکچاتے ہیں ۔" احمد اُسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہُوا خاموش رہا ۔

دونوں باڑے سے نکل کر اس جگہ آئے جہاں عبدہ کھڑا ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا ۔ عبدہ کے پاس آ کر ایمن نے پھر احمد سے کہا ۔ "میں عبدہ کو کبھی کبھی آپ کی خیریت معلوم کرنے بھیجتی رہوں گی ۔"

تینوں تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اس جگہ آئے جہاں انولو اونٹ پکڑے کھڑا تھا انہوں نے دیکھا انولو کے ساتھ ایمن کا باپ آموص بھی کھڑا تھا ۔ احمد جب قریب گیا تو آموص نے آگے بڑھ کر احمد کو گلے لگاتے ہوئے کہا ۔ "احمد ! احمد ! عبدہ مجھے تمہارے متعلق سب کچھ بتا چکا ہے ۔ اب تم یہاں سے روانہ ہو جاؤ ۔ جب حالات بہتر اور سازگار ہو گئے تو میں عبدہ کو بھیج کر تمہیں یہاں بلوا لوں گا ۔ یہاں سے یہ سمجھ کر رخصت ہونا کہ تم کسبیلہ کے غلام نہیں میرے گھر کے ایک فرد ہو ۔ تمہارے اونٹ کے کجاوے میں میں نے تم دونوں کے لیے ایک ہفتے کی خوراک کے علاوہ خشک پھل اور پانی کے دو مشکیزے بھی باندھ دیئے ہیں ۔ اب تم یہاں سے روانہ ہو جاؤ، میں تمہیں خدا حافظ کہتا ہوں ۔"

احمد نے آموص اور عبدہ سے مصافحہ کرنے کے بعد ایک گہری اور محبت بھری نگاہ ایمن پر ڈالی ۔ پھر اس نے اُونٹ کی گردن پر ہاتھ ڈالا اور ایک زہریلی جست لگا کر وہ کجاوے پر ہو بیٹھا تھا ۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے انولو کو بھی اُوپر کھینچ لیا اور کجاوے پر اپنے پیچھے بٹھا لیا اور اُونٹ کو مہمیز لگا کر اس نے ہانک دیا تھا ۔

ایمن، عبدہ اور آموص وہاں کھڑے ہو کر انہیں دیکھتے رہے ۔ جب وہ

اندھیرے میں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو وہ اُداس اور افسردہ افسردہ سے واپس جا رہے تھے۔



احمد ساری رات اُونٹ کو سرپٹ دوڑاتا رہا۔ جب لیل مظلم ختم ہوئی اور نور بخش سحر کے آثار دُور تاریک آسمان میں ہلکی سی روشنی کی مانند ظاہر ہوئے تو وہ کوہستان اطلس کی شمالی وادیوں سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ پانی کا چشمہ دیکھ کر انہوں نے اُونٹ کو روک لیا۔ دونوں نیچے اُترے۔ اونٹ کا گھٹنا باندھ کر اُسے چرنے کے لیے انہوں نے کھلا چھوڑ دیا۔ خود انہوں نے وہاں بیٹھ کر وضو کیا، پہلے فجر کی نماز ادا کی۔ پھر دونوں نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھا لیا تھا۔

اب سحر نے پُوری طرح اپنا نقاب اُلٹ دیا تھا۔ مشرق کی طرف سے سورج اپنی پُوری تمازت کے ساتھ طلوع ہُوا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے اتنی دیر تک اُونٹ بھی اپنا پیٹ بھر کر ستا چکا تھا۔ دونوں پھر سوار ہوئے اور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ دوپہر تک وہ کوہستان اطلس کے اندر ہی سفر کرتے رہے اس کے بعد شمال مغرب کی طرف آگے بڑھنے کے لیے وہ صحرائے اور اس میں داخل ہو گئے تھے۔ پچھلی رات کے تیز طوفان نے صحرا کے اندر سارے راستے معدوم کر دیئے تھے۔ تاہم وہ اندازے سے اپنے اُونٹ کو صحرا کے اندر آگے ہانکتے رہے۔

لگاتار دو روز تک وہ صحرائے اروس کے اندر دھکے کھاتے رہے۔ اصل میں وہ صحرا کے اندر کوئی راستہ نہ پا کر بھٹک چکے تھے اور صحرا کی بھول بھلیوں میں کھو گئے تھے انہوں نے صحرا سے نکلنے کی انتہائی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے اور پھر ان کے پاس پانی بھی ختم ہو گیا تھا اور ابھی تک وہ ریت کے بلند ٹیلوں کے اندر گھوم رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کس طرف سفر کریں کہ کسی آبادی کی طرف نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ ان کا اُونٹ بھی اب تھک کر جواب دیتا جا رہا تھا۔

ایک روز سہ پہر کے قریب جب کہ وہ صحرا کی گرم ریت اور تپتے ہوئے ٹیلوں

کے اندر سفر کر رہے تھے۔ انولو شدت پیاس سے پانی پانی کرنے لگا۔ احمد پریشان ہو گیا اور بدحواسی میں اس نے دونوں مشکیزوں کو دیکھا جو خالی تھے اور دھوپ میں رکھے کپڑے کی طرح خشک ہو چکے تھے۔ قبل اس کے احمد اس کی کوئی مدد کرتا انولو بے ہوش ہو چکا تھا۔ گھبراہٹ اور پریشانی میں احمد نے اُونٹ کو مہمیز لگا کر اس کی رفتار تیز کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بھوکا اور پیاسا اونٹ اب خفگی اور ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر دُور دُور تک پھیلے ہوئے صحرا میں اور سفر کرنے کے بعد احمد بھی پیاس کے باعث بے ہوش ہو چکا تھا۔ پہلے احمد انولو کو سنبھالے ہوئے تھا اب جو اس کے اوسان بھی جاتے رہے تو دونوں اُونٹ کی پیٹھ سے صحرا کی گرم ریت پر گر گئے تھے ان کا اونٹ ان کے گرد منڈلانے لگا تھا۔



احمد جب ہوش میں آیا تو اس نے دیکھا سُورج غروب ہونے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ ریت پر لیٹا تھا اور وہ ریت گرم نہیں ٹھنڈی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ اس نے سر اُٹھا کر دیکھا، اس کے دائیں طرف دو خیمے نصب تھے جن کے سامنے ایک لڑکی اور چار جوان بیٹھے تھے جو اپنی شکل و صورت سے رومن لگتے تھے، لڑکی بھی رومن تھی اور وہ سُرخ و سفید رنگ اور لمبے قد کی ایک حسین ترین لڑکی تھی۔ اس لڑکی کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایسی کشش تھی جیسے کسی بلوری نگار خانے میں رموز کن جھلک رہے ہوں۔ اس نوخیز اور شفق شمائل لڑکی کا چہرہ ایسا روشن و چمکدار تھا جیسے وہ فسوں خیز چاندنی بن کر اندھیر دل کا سینہ چھلنی کرنے اور کرنوں کا ستون بن کر صحرا کو گلزار بنانے کے لیے پیدا کی گئی ہو۔

احمد نے چند لمحوں تک ان چاروں مردوں اور لڑکی کو بغور دیکھا پھر وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے کوئی اس کے منہ میں پانی ڈالنے کی کوشش کرتا رہا ہو۔ اس نے جب اپنے بائیں طرف دیکھا تو وہاں تین آدمی ریت پر بیٹھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک انولو اور دوسرے دو اس کے لیے اجنبی تھے۔

احمد کے سامنے شفاف پانی کی ایک تیز دھار بہہ رہی تھی۔ ان کے بالکل قریب ہی دائیں طرف ایک کوہستانی سلسلہ تھا جس کی طرف سے پانی کی یہ تیز دھار بہتی آرہی تھی اور صحرا کے اندر ذرا آگے جاکر پانی کی یہ ننھی دھار خشک ہوگئی تھی۔ احمد اٹھا گھٹنوں کے بل وہ گیلی ریت پر بیٹھ گیا اور صحرا کی اس ننھی دھار سے پانی پینے لگا تھا۔

وہ چاروں جوان اور لڑکی جو رومن لگتے تھے اٹھ کر اس کے اردگرد کھڑے ہوگئے تھے۔ احمد جب پانی پی چکا تو پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے ان رومنوں سے پوچھا "تم لوگ کون ہو؟ اور میں اس وقت کہاں ہوں"۔

ایک رومن نے اس سے قریب ہوتے ہوئے کہا "ہم ملکہ جرارہ کے جاسوس ہیں اور ان کوہستانوں سے پچاس میل مغرب تک کے علاقے کی نگہداشت کرتے ہیں ان دنوں چونکہ مسلمانوں نے افریقہ پر حملہ کر رکھا ہے لہٰذا ہم ان کی طرف سے چوکس رہتے ہیں۔ آج ہماری خوش قسمتی کہ ہمارے ہاتھ دو مسلمان جاسوس آگئے۔ ہم انہیں پکڑ کر اپنے مستقر کی طرف لوٹ رہے تھے کہ ایک جگہ تم اور تمہارا ساتھی بے ہوش پڑے مل گئے۔ ہم نے تم دونوں کو اٹھا لیا اور اس چشمے کے کنارے آخیمہ زن ہوئے کہ تم ہوش میں آؤ تو سفر جاری رکھا جائے"۔

احمد نے انولو کے ساتھ بیٹھے دونوں جوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "کیا وہ دونوں جو میرے ساتھی کے پاس بیٹھے ہیں مسلمان جاسوس ہیں"۔

اس رومن نے کہا "ہاں، یہ مسلمان جاسوس ہیں اور نہایت خطرناک ہیں۔ یہ بھی صحرا کے اندر بھٹک گئے تھے۔ ہم نے بڑی مشکل سے ان پر قابو پایا ہے"۔

احمد نے نرمی سے پوچھا "وہ تو مسلمانوں کے جاسوس ہیں اور تم لوگوں نے ان کے ہاتھ پشت پر باندھ رکھے ہیں لیکن ہمارا کیا قصور؛ ہم سے ایسا سلوک کس بنا پر کیا گیا ہے اور پھر ہم دونوں سے ہماری تلواریں اور ڈھالیں بھی چھین لی گئی ہیں۔ آپ لوگ کس لحاظ سے ہمیں مشکوک جانتے ہیں"۔

رومن نے شکایت آمیز لہجے میں کہا "ہم نے تمہارے ساتھی سے پوچھا لیکن

وہ اتنا ہی بتاتا ہے کہ ہم دونوں غلامی کی زنجیریں توڑ کر بھاگے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ اب میرا ساتھی ہی میرا آقا اور رہبر ہے وہ مجھے کہاں لے کر جائے گا مجھے خبر نہیں ہے"۔

احمد نے کہا وہ ٹھیک کہتا ہے۔ ہم دونوں اروبہ کے بادشاہ کسیلہ کے غلام تھے۔ ان کا مذہب بت پرستی جب کہ ہم دونوں عیسائی ہیں۔ انہوں نے ہمیں بھی بت پرستی پہ آمادہ کیا لیکن ہم موقع پا کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ ہمارے سامنے کوئی منزل نہ تھی، ہمیں کہیں بھی سر چھپانے کو جگہ چاہیے تھی لیکن افسوس ہم صحرا میں بھٹک گئے اور اب تمہاری گرفت میں مجبور اور بے بس ہیں"۔

اس رومن نے فیصلہ کن انداز میں کہا "ہم تم دونوں کو آزاد نہیں کرسکتے اور نہ ہی ہم اس کے مجاز ہیں۔ تمہیں ہمارے ساتھ ملکہ جرارہ کے سامنے پیش ہونا ہوگا۔ وہاں جاکر اپنی کہانی کہنا، ہوسکتا ہے وہ تم دونوں پر رحم کھا کر تمہیں رہا کردے"۔

سورج غروب ہونے کے لیے سرخ ہوکر نیچے جھکتا جا رہا تھا۔ احمد کے چہرے پر اس رومن کی باتوں سے سختی اور بربریت پھیل گئی تھی۔ تاہم اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا "سورج غروب ہو رہا ہے۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ میرا ساتھی بھی بھوکا ہے۔ کیا تم ہمیں کھانے کو کچھ نہ دو گے"۔

رومن نے مسکرا کر کہا "ہمارے پاس کھانے کو بہت کچھ ہے۔ اطمینان رکھو تم بھوکے نہ رہو گے۔ ہم اب یہاں سے کھانا کھا کر ہی کوچ کریں گے۔ اس رومن نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لاؤ کھانا لاؤ" لڑکی جس کا نام پکارا گیا تھا خیمے کے اندر چلی گئی اور وہاں سے کھانے کی چیزیں برتنوں میں سجا سجا کر خشک ریت پر رکھنے لگی۔ پہلے ان پانچوں نے خود کھانا کھایا پھر انہوں نے ایک مسلمان جاسوس کے ہاتھ کھولے اور اسے کھانے پر بٹھایا جب کہ ان کا ایک ساتھی ننگی تلوار اور ڈھال ہاتھ میں لیے اس کے پاس کھڑا ہو کر پہرہ دینے لگا۔ جب وہ کھانا کھا چکا تو اس کے ہاتھ دوبارہ پشت پر باندھ دیئے گئے اسی طرح انہوں نے دوسرے جاسوس اور انولو کو بھی کھانا کھلا کر ان کے ہاتھ دوبارہ پشت

پر باندھ دیئے اور وہ وہیں بیٹھ گئے جہاں وہ پہلے بیٹھے ہوئے تھے۔

آخر میں اُنہوں نے احمد کے ہاتھ کھولے اور اسے کھانے پر بٹھایا۔ ایک رومن اسی طرح ننگی تلوار اور ڈھال ہاتھ میں لیے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ احمد نے پہلے اطمینان سے کھانا کھا کر سکون سے پانی پیا۔ پانی کا خالی برتن نیچے رکھنے کے بعد وہ بجلی کے کوندے اور تیز طوفان کی طرح حرکت میں آیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں ریت بھر کر اس نے اس رومن کی آنکھوں میں ڈال دی جو اس کے سر پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ جونہی وہ رومن اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا احمد ایک جست لگا کر آگے بڑھا، ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے اس کے ہاتھ سے تلوار اور ڈھال چھین لی اور دوسرے ہی لمحے وہ اس رومن کی گردن بھی کاٹ چکا تھا۔

ذرا فاصلے پر بیٹھے ہوئے تینوں رومن کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنی تلواریں سونت لی تھیں۔ لڑکی بھی بدحواس ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی نازک کمر سے بھی تلوار لٹک رہی تھی لیکن اپنی تلوار اس نے بے نیام نہ کی تھی۔

احمد کی طرف بڑھتے ہوئے ایک رومن نے کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمارے ایک ساتھی پر قابو پانے اور اسے قتل کرنے کے بعد تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہو ابھی تمہیں ہماری تین تلواروں کا سامنا کرنا ہوگا۔ جو تمہیں لخت لخت اور تمہاری رُوح کو لہولہو کر دیں گی۔"

احمد نے تلوار لہراتے ہوئے کہا۔ "قسم مجھے غارِ حرا کی جس کے اندر اپنے رب کی پہلی وحی کے جواب میں میرے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے مَا اَنَا بِقَارِیْ کہا، مَیں تم پر اولوں کی طرح برسوں گا۔ یاد رکھو! تم صرف تین ہو اگر تمہاری تعداد چھ بھی ہوتی تو بھی اس صحرا کے اندر مَیں تمہارے ازل و ابد اور مہد و لحد کے فاصلے کو سمیٹ کر رکھ دیتا۔ یاد رکھو! مَیں مسلمان ہوں اور میرا رب جو لازوال، دائم و دیوم، قائم و قیوم ہے میری مدد اور نصرت کا سامان کرے گا۔"

رومن آگے بڑھ رہے تھے۔ احمد کے چہرے پر قہر اور بربریت کی شکنیں گہری ہو گئی تھیں، لگتا تھا وہ از مکان تا لامکاں ایک اندیشہ اور طوفان کھڑا کر دینے کا عزم کر چکا ہو۔

رومن جب قریب ہوئے تو احمد آگے بڑھا اور ان پر حملہ آور ہو گیا۔ تینوں رومن یہ سوچ رہے تھے کہ چند لمحوں کے ٹکراؤ کے بعد ہی وہ اپنے دشمن کو زیر کر لیں گے لیکن اُنہیں مایوسی ہوئی احمد نے حملوں میں ایسی تیزی اور بھیانک پن تھا کہ وہ چکرا کر رہ گئے تھے۔ احمد کے خطرناک مہیب اور جان لیوا وار انہیں بار بار بوکھلا جانے پر مجبور کر رہے تھے۔

اچانک ان تینوں میں سے ایک احمد کی تلوار کا شکار ہو گیا اور اس کی لاش ریت پر گر کر عبرت کا سماں پیدا کرنے لگی تھی۔ دوسرے رومن نے جونہی اپنے ساتھی کی لاش کی طرف بوکھلاہٹ میں دیکھا احمد نے موقع سے فوراً فائدہ اُٹھایا اور اس کی بھی گردن کاٹ کر رکھ دی تھی۔ اب مقابلے پر صرف ایک رومن رہ گیا تھا جو اپنے آپ کو ایک زہریلے اور انتہائی دشمن کے سامنے بے بس اور مجبور پا رہا تھا، کانپنے اور لرزنے لگا تھا۔

احمد آگے بڑھا اور قہر آلود آواز میں اس نے کہا۔ "اے دشمنِ دین! اے عدوے ایمان! دیکھا تو نے مَیں نے کیسے تمہارے گھمنڈ کی چادر کو اور تمہارے عنکبوتِ وہم کے بُنے ہوئے جالے کو چاک کیا ہے۔ اب تیری باری ہے، مَیں تجھ پر لہو کی بارش کروں گا۔ تیری روح میں رجائیت گھول دوں گا اور تیری ساری ماورائی خوش فہمیاں دور کر دوں گا۔" وہ رومن بُری طرح کانپنے لگا تھا۔ احمد آگے بڑھ کر حملہ آور ہُوا۔ رومن بدحواسی میں چند لمحوں تک اُلٹے سیدھے ہاتھ مار کر اپنا دفاع کرتا رہا پھر وہ بھی احمد کی تلوار کا شکار ہو کر ختم ہو گیا تھا۔

احمد نے تلوار کی مدد سے پہلے انولو اس کے بعد ان دونوں مسلمان قیدیوں کی وہ رسیاں کاٹ دیں جن میں ان کے ہاتھ جکڑے ہوئے تھے۔ پھر اس نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم دونوں کون ہو، تمہارے نام کیا ہیں؛ تم کہاں سفر کر رہے تھے کہ ان کے ہاتھ لگ گئے۔" ان میں سے ایک آگے بڑھا اور احمد کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔

"میرا نام نعبان اور میرے ساتھی کا نام عفان ہے۔ پہلے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ہم خوش بخت ہیں کہ ہماری رہائی آپ جیسے ایک مسلمان بھائی کے ہاتھوں ہوئی۔ خدا کی قسم آپ جیسے نوجوان ہی میری ملت کی رُوح اور مسلم قوم کا حسن ہیں۔ آپ کے حملوں کا تیکھا پن

ماورائے مماں ہے ۔ آپ کے لڑنے کا انداز دیکھ کر احساس کی تشنگی نہیں رہی ۔ آپ نے جس طرح فطرت کا دستور بن کر ایک ساتھ چار دشمنوں کو بے جان شعل کی طرح کر دیا ہے ۔ یہ کام ایسے جوان ہی کر سکتے ہیں جو اپنی قوم کے لیے مرنا اور مذہب کے لیے خون بہانے کا حوصلہ رکھتے ہیں ———

احمد نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا ۔" میں اپنی تعریف سننے کا عادی نہیں ہوں ۔ تم اپنی داستان کہو ۔ تم اس حالت تک کیسے پہنچے "۔

ثعبان نے کہا ۔" ہمارا تعلق زہیر بن قیس بلوی کے لشکر سے ہے "۔ احمد نے پھر ٹوکتے ہوئے کہا ۔" یہ شخص کون ہے میں نے تو صرف عقبہ بن نافع کے متعلق سن رکھا ہے کہ اس نے افریقہ پر یلغار کر رکھی ہے "۔

ثعبان نے دکھ سے کہا ۔" آہ ! یہ کیسی کربناک حقیقت اور کسی اندھے ہیولوں جیسی خبر ہے کہ عقبہ بن نافع ایک جنگ میں تین سو کبار صحابہ اور تابعین کے ساتھ شہید ہو چکا ہے "

احمد نے چونک کر پوچھا ۔" یہ تم نے کیا کہا مجھے یہ واقعات تفصیل سے کہو "۔

ثعبان کہہ رہا تھا ۔" عقبہ بن نافع افریقہ کے شمالی حصے کو لگاتار فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا ۔ یہاں تک کہ وہ مغرب کی سمت فتح کے پرچم اڑاتا ہوا بحیرہ محیط کے کنارے سوس شہر میں جا پہنچا ۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کر کے اس نے واپسی کا ارادہ کیا ۔ لشکر کا ایک مختصر سا حصہ اس نے اپنے ساتھ لیا اور قیروان کی طرف واپس کوچ کر گیا ۔ باقی لشکر پر اس نے اپنے ایک جرنیل زہیر بن قیس کو سالار مقرر کیا ۔ اس دوران افریقہ کے دو حکمرانوں اردیہ کے کسیلہ اور تہودا کے بربرانس نے مل کر ایک سازش تیار کی ۔ انہوں نے ایک متحدہ لشکر تیار کیا اور بے خبری کی حالت میں عقبہ بن نافع پر حملہ کر دیا ۔ عقبہ نے اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کر مقابلہ کیا ۔ لیکن دشمن تعداد میں بہت زیادہ تھا لہٰذا عقبہ بن نافع اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگ میں کام آ گیا ۔ جب اس ہولناک واقعہ کی خبر زہیر بن قیس کو ہوئی تو اس پر وحشت سی طاری ہو گئی تھی ۔ اب زہیر بن قیس اپنے لشکر کے ساتھ مشرق کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ ہم دونوں اس لشکر کے جاسوس ہیں ۔ ہمیں دو روز پہلے روانہ کیا گیا تھا تاکہ اس راستے کی سلامتی کا خیال رکھیں جس پر ہمارا لشکر سفر

کرتا آ رہا ہے لیکن افسوس ہم ملکہ جرارہ کے ان آدمیوں کے ہاتھ لگ گئے اور اس کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ آپ کی موجودگی میں ہی ہوا ۔ کل تک ہمارا لشکر بھی یہاں پہنچ جائے گا اور ہم مشرق کی طرف کوچ کر جائیں گے ۔ آپ نے ابھی تک اپنے اور اپنے ساتھی کے متعلق کچھ نہیں کہا ۔

احمد نے کہا ۔" میرا نام ماں باپ نے تو احمد ہی رکھا تھا لیکن حالات نے مجھے سمرون بنا دیا ۔ اب میں اپنا نام سمرون ہی بتاتا ہوں اور میرے ساتھی کا نام انولو ہے "۔ اس کے بعد احمد نے انہیں اپنے اور انولو کے اردیہ سے فرار ہونے کے مختصر حالات کہہ ڈالے تھے ۔ وہ اپنے اغوا ہونے اور غلام بننے کے حالات چھپا گیا تھا ۔ اس نے انہیں اپنا اصل نام بھی نہ بتایا تھا ۔ شاید اس خیال سے کہ وہ دونوں ابھی تک اس کے لیے ناقابلِ اعتماد تھے ۔

مرنے والوں کی ساتھی لڑکی ابھی تک پریشان اور چپ کھڑی تھی ۔ احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔" تم جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو ۔ ہم تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے ۔" لڑکی کے ہونٹوں پر پُرسکون مسکراہٹ بکھر گئی ۔ وہ اس طرف بڑھی جہاں خیموں کے پیچھے پانچ اونٹ بیٹھے ہوئے تھے ۔ ان میں احمد کا اونٹ بھی شامل تھا ۔ لڑکی ایک اونٹ پر سوار ہوئی ۔ اسے مہمیز لگا کر اٹھایا اور چپ چاپ مشرق کی طرف روانہ ہو گئی تھی ۔ احمد اور اس کے ساتھیوں نے وہ خیمے اکھیڑے سارا سامان باندھ کر انہوں نے اونٹوں پر لادا پھر وہ بھی رات کی تاریکی میں شمال مغرب کی طرف کوچ کر رہے تھے ۔

دوسرے روز وہ چاروں ایک ایسے لشکر میں داخل ہوئے جو ریگستان میں ایک کوہستانی سلسلے کے قریب خیمہ زن تھا ۔ یہ عقبہ بن نافع کا وہ بچا ہوا لشکر تھا جس پر زہیر بن قیس کو اس نے سالار مقرر کیا تھا ۔ ثعبان اور عفان دونوں چمڑے کے ایک بڑے سے خیمے پر رک گئے ۔ احمد اور انولو کو انہوں نے باہر ہی رک کر انتظار کرنے کو کہا ۔ خود وہ دونوں اس خیمے کے اندر چلے گئے تھے ۔

احمد اور انولو وہاں رک کر انتظار کرنے لگے یہاں تک کہ ثعبان اور عفان اس خیمے سے باہر آئے ۔ ثعبان نے قریب ہوتے ہوئے احمد سے کہا ۔" یہ لشکر ہمارا ہے اور اس کے سالار

امیر زہیر بن قیس ہیں ۔ مَیں نے ان سے آپ کے مختصر حالات کہہ دیئے ہیں ۔ اب آپ اندر جائیں انہوں نے آپ کو طلب کیا ہے"۔

انولو باہر ہی ثعبان اور عفان کے پاس کھڑا رہا ۔ احمد جھجکتے ہوئے اس خیمے میں داخل ہُوا ۔ خیمے کے اندر بچھی ہوئی کھجور کے پتوں سے بنی ہُوئی چٹائی پر دو شخص بیٹھے ہوئے تھے ۔ ان میں سے ایک لشکر کا سپہ سالار زہیر بن قیس بلوی اور دوسرا اس کا ایک جرنیل حنش بن عبد اللہ صنعانی تھا ۔ زہیر بن قیس نے ہاتھ کے اشارے سے احمد کو اپنے سامنے چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ "کیا تم ہی سمرون ہو جس نے میرے دو ساتھیوں کی جان بچائی ہے"۔

احمد نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "میرا نام ہی سمرون ہے"۔

زہیر نے بڑی شفقت اور نرمی سے کہا "میرے آدمی مجھے تمہارے متعلق بہت کچھ بتا چکے ہیں ۔ تم میرے لشکر میں ہی قیام کرو ۔ مَیں نے ثعبان اور عفان کو سمجھا دیا ہے وہ تمہارا خیال رکھیں گے ۔ کسی جنگ میں تمہاری کارکردگی دیکھنے کے بعد مَیں تمہارے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کروں گا"۔

احمد نے چھاتی تانتے ہوئے کہا "انشاء اللہ مَیں آپ کو مایوس نہ کروں گا"۔ زہیر نے ہاتھ آگے بڑھا کر احمد سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "اب تم جاکر آرام کرو ۔ آج شام ہم یہاں سے قیروان کی طرف کوچ کریں گے"۔

احمد اُٹھ کر خیمے سے باہر آیا ۔ وہاں انولو، ثعبان اور عفان اس کا انتظار کر رہے تھے ثعبان نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور چاروں خیموں کے اندر واپس طرف چل دیئے ۔ ثعبان اُنہیں ایک ایسے خیمے میں لے گیا جو خالی تھا ۔ وہاں انہوں نے اکٹھے بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا اور تھوڑی دیر ستانے کے لیے وہ خیمے کی چٹائی پر لیٹ گئے تھے ۔



اسی روز شام کے وقت زہیر بن قیس نے اپنے لشکر کے ساتھ اس صحرائی پڑاؤ سے کوچ کیا اور چند روز کے لگاتار سفر کے بعد وہ قیروان شہر میں داخل ہوا ۔ عقبہ بن نافع کی موت کے باعث شہر ویران پڑا تھا کیونکہ افریقہ کے وہ لوگ جو اسلامی لشکر کی فتوحات اور

تبلیغ کے باعث مُسلمان ہوگئے تھے ۔ وہ اب اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرنے لگے تھے ۔ وہ قیروان شہر کو چھوڑ کر دُور دراز اور گمنام علاقوں میں جاکر آباد ہوگئے تھے ۔ وہ بچارے اس انتظار میں تھے کہ مسلمانوں کا کوئی اور لشکر آئے جس کے سائے اور حفاظت میں وہ مسلمان کی حیثیت سے اپنی زندگی بسر کرسکیں ۔

زہیر بن قیس چاہتا تھا کہ عقبہ بن نافع کے مرنے سے اسلامی لشکر کے وقار میں جو خلا پیدا ہُوا ہے وہ فوراً پُر کیا جائے ۔ لہٰذا قیروان شہر میں داخل ہونے کے دوسرے روز ہی جب اسے یہ اطلاع ملی کہ کسیلہ اور برانس کے لشکروں کے کچھ دستے ایک متحدہ ہراول کی شکل میں قیروان کی طرف بڑھ رہے ہیں تو زہیر بن قیس نے ایک مجلسِ شوریٰ طلب کی جس میں حنش بن عبد اللہ صنعانی کے علاوہ لشکر کے کچھ اور سرکردہ لوگوں اور چھوٹے سالاروں نے بھی شرکت کی ۔ احمد کو بھی مجلسِ شوریٰ کے اس اجتماع میں شامل کیا گیا تھا ۔

جب سب لوگ جمع ہوگئے تو زہیر بن قیس نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا "اے جاں نثارانِ ملت کسیلہ اور برانس کا ایک متحدہ ہراول بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے اور اس ہراول کے پیچھے کسیلہ اور برانس کے لشکر بھی ہیں ۔ انہوں نے ابھی تک اس نیت سے ہماری طرف کوچ نہیں کیا ہے کہ ان کا متحدہ ہراول ہی ہمیں قیروان سے مار بھگائے گا ۔ مَیں چاہتا ہوں ہم شہر میں پڑے رہنے کے بجائے کھلے میدانوں میں ان کے ہراول کو عبرتناک شکست دیں ۔ ایسا کرنے سے کسیلہ اور برانس پر ہمارا ایک رُعب طاری ہوجائے گا وہ فی الفور ہم پر ہاتھ نہ ڈالیں گے اور ہمیں تیاری کا موقع مل جائے گا"۔

حنش بن عبد اللہ نے فوراً اختلافِ رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔ "مجھے آپ کے ان ارادوں سے اختلاف ہے ۔ عقبہ بن نافع کی موت نے ہماری قوت اور طاقت پر ایک بھرپور ضرب لگائی ہے ۔ لشکر میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو عقبہ بن نافع کو فتح کا سرچشمہ خیال کرتے ہیں، وہ اب مایوس ہوچکے ہیں ۔ وہ اب جنگ میں اس کارکردگی کا اظہار نہ کرسکیں گے جس کا مظاہرہ وہ عقبہ بن نافع کے ساتھ کرتے رہے ہیں ۔ میری رائے ہے کہ ہمیں فوراً مصر کی طرف کوچ کرنا چاہیئے اور وہاں سے کمک لے کر دوبارہ اِدھر کا رُخ کرنا چاہیئے"۔

زہیر بن قیس نے فیصلہ کن انداز میں کہا ۔"میں آج ہی اپنے دو جوانوں کو کمک طلب کرنے کے لیے خلیفہ عبدالملک بن مروان کی طرف روانہ کر چکا ہوں ، ہماری منزل مصر نہیں ہمارا جینا مرنا ان ہی صحراؤں کے اندر ہوگا ۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں ایک بے بس اور بزدل سپاہی کی طرح لوگوں سے جاکر اپنی مجبوری کا قصہ ، بربادی کی داستان اور کچلی ہوئی عزت کی روداد کہتا رہوں ۔ میں اپنی روندی ہوئی روح کے ساتھ تنہائیوں کے اس دوزخ میں تو زندگی بسر کر سکتا ہوں لیکن اپنے سر پر بے بسی اور شکست کی دستار سجا کر میں اپنی قوم کا سامنا نہ کر سکوں گا ۔ میں اس اجنبی دیس میں غیر سرزمین میں یا تو اپنے مذہب و قوم کی خاطر لڑتے لڑتے مارا جاؤں گا یا ان صحراؤں کے اندر دشمن کو ایک عبرت ناک درس دوں گا ۔"

زہیر بن قیس چند ثانیے رکا پھر حنش بن عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا ۔"میرے اس قدر کہنے کے باوجود بھی اگر تم مصر واپس جانے کا فیصلہ کر چکے ہو تو میں کچھ نہیں کر سکتا ۔ مجبور ہوں ، میں اپنے خون کے آخری قطرے تک اپنی قوم کی فلاح اور مذہب کی سربلندی کے لیے جنگ تو کر سکتا ہوں لیکن تمہیں اطمینان دلانے کی خاطر میرے پاس کُن فیکون کا کوئی ایسا نغمہ نہیں جسے گا کر میں تمہارے لیے معجزات و عجائبات کا ظہور کر سکوں ۔ حنش ! تم جانتے ہو مجھے پتھر کے سے جمود سے نفرت ہے ۔ میں ہمیشہ ایسی پُرحرکت قوت بن کر رہنا پسند کرتا ہوں جو میدان جنگ کو شکن شکن اور دشمن پر لرزہ و خوف طاری کر دے ۔"

حنش بن عبداللہ نے اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے کہا ۔"میں مصر جانے کے فیصلے پر قائم ہوں ۔ میرے ساتھ وہ لوگ بھی یہاں سے کوچ کر جائیں گے ، جو میرے حامی ہیں ۔"

زہیر بن قیس کے چہرے پر برہمی کے رنگ بکھر گئے ۔ حنش کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے غصے اور دکھ سے کہا ۔"حنش ! حنش ! تمہارے خیالات کیسے اتھلے اور تمہاری سوچیں کیسی سطحی ہیں ۔ اپنے کھوکھلے پن کو چھوڑو ۔ میرا ساتھ دو ۔ آؤ دونوں مل کر ایک اجتماعی حقیقت بن کر پیچھا نہ چھوڑنے والے سائے کی طرح اپنے دشمنوں کا مقابلہ کریں ۔

یاد رکھو ! تمہارے اس فریب اور مغالطے سے لشکر میں وسواس اور بدگمانی پیدا ہوگی ۔"

حنش نے اپنی جگہ پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا ۔"کچھ بھی ہو ، میں مصر واپس جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور میں ابھی یہاں سے کوچ کر رہا ہوں ۔" حنش بن عبداللہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا ۔ اس کے حامی بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے ۔

قیران شہر سے باہر وہ ایک کھلا میدان تھا جس کے اندر لشکر نے پڑاؤ کر رکھا تھا ۔ اور اسی میدان میں ایک خیمے کے اندر مجلس شوریٰ کا اہتمام کیا گیا تھا ۔ حنش بن عبداللہ اور اس کے حامیوں کے چلے جانے کے بعد زہیر بن قیس خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا ۔ اس کے کچھ حامی اس کے ارد گرد بیٹھے تھے ان میں احمد بھی شامل تھا ۔

تھوڑی دیر بعد زہیر بن قیس خیمے سے باہر آیا ۔ اس وقت حنش بن عبداللہ لشکر کے ایک حصے کے ساتھ جو اس کا حامی تھا مصر کی طرف کوچ کر رہا تھا ۔ احمد زہیر بن قیس کے قریب کھڑا تھا ۔ وہ اس کی بے بسی پر غمگین اور اداس تھا ۔ اتنے میں زہیر نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا ۔

"جاؤ ! میں تم لوگوں کو زبردستی اپنی ذات کے حصار میں بند نہیں کر سکتا ۔ میرا خدا میرا حامی و ناصر ہے اور میں اس کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے تعاقب کی مشعل بن کر دشمن کا پیچھا کروں گا ۔"

زہیر بن قیس خاموش ہو گیا اور اس کی گردن جھک گئی تھی ۔ احمد آگے بڑھا اور زہیر بن قیس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔"اے امیر ! اس صحرائے وحشت اور اندھے ہیولوں کی اس سرزمین کے اندر میں آپ کا ساتھ دوں گا ۔ ایک نئی تاریخ کے اوراق کو جنم دے کر ہم اندھیری فضاؤں میں اس دشتِ غربت کے ذروں کو تاروں کی تنویر اور جگنوؤں کی جگمگاہٹ دیں گے ۔ یاد رکھیے ! جو قومیں قدرت کے سونپے ہوئے جبلی مقاصد کی تکمیل نہیں کرتے ہیں وہ برگ آوارہ کی طرح بھٹک بھٹک کر زندگی بھر کی اذیت میں مبتلا رہتی ہیں ۔ آیئے اپنی اپنی ذات کے سود و زیاں کو فراموش کر کے کشفِ حقائق کی طرف متوجہ ہوں ۔ میرا دل کہتا ہے ، ان صحراؤں کے اندر ہماری آخری شام نہ ہوگی ۔"

زہیر بن قیس یوں سنبھلا جیسے وہ طلسماتِ خیال سے چونکا ہو۔ اس نے احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری باتوں میں رس ہے اور تمہاری سوچیں زندہ اور فعال ہیں۔ اگر تم میرا ساتھ دینے کا عزم کر چکے ہو تو تمہاری جمعیت میں نفرت و حقارت اور اذیت ودور کا وہ آگ بجھا دوں گا جسے حنش بن عبداللہ نے ہم سے علیحدہ ہو کر روشن کیا ہے۔ میں ابھی اور اسی وقت کسیلہ اور بر انس کے اس متحدہ ہراول پر حملہ آور ہوں گا جو قیروان کی طرف بڑھ رہا ہے"۔

احمد نے چھاتی تانتے ہوئے کہا۔ "خدا آپ کو اس نیک امر کی جزا دے گا"۔ احمد کو ساتھ لے کر زہیر بن قیس لشکر کے خیموں میں گھس کر کوچ کا حکم دینے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد زہیر بن قیس اپنے لشکر کے ساتھ وہاں سے کوچ کر رہا تھا۔ اس کا رُخ جنوب مغرب کی طرف تھا۔ لشکر کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصہ زہیر نے اپنے ایک چھوٹے سالار کی نگرانی میں دیا تھا اور دوسرا حصہ اس نے اپنے پاس رکھا تھا۔ احمد اور لولو کو زہیر نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔

دوسرے روز شام کے قریب قیروان سے غارویہ شہر کی طرف جانے والی صحرائی شاہراہ کے کنارے دشمن کے ساتھ اُن کی مڈبھیڑ ہوئی۔ زہیر بن قیس نے بغیر کسی توقف کے حملہ آور ہونے کا حکم دے دیا تھا۔

زہیر بن قیس خود دائیں طرف سے اور اپنے لشکر کے دوسرے حصے کو اس نے بائیں طرف سے حملہ آور ہونے کا حکم دے دیا تھا۔ جیسے تیز آندھیاں صحراؤں کی ریت پر شب خون مارتی ہیں ایسی ہی تندی اور تیزی سے مسلمان بھی حملہ آور ہوئے تھے۔ گو دشمن تعداد میں زیادہ تھا۔ اس کے باوجود صرف شام سے عشاء تک جنگ کرنے کے بعد مسلمان دشمن کو اپنے آگے یوں بھگا رہے تھے جیسے کو شیر دل چوپان اُمڈے ہوئے سیلاب کی طرح بھیڑ بکریوں کو اپنے آگے آگے بھگاتا ہے۔

تھوڑی دیر تک اور جنگ کرنے کے بعد دشمن مکمل طور پر شکست کھا کر منتشر ہو گیا تھا۔ زہیر نے تھوڑی دور تک دشمن کا تعاقب کیا۔ اس کے بعد وہ اس خیال سے لوٹ آیا کہ اس ہراول کے پیچھے دشمن کے کئی اور لشکر بھی ہوں گے جو اس کے لیے نقصان دہ

ثابت ہوں گے۔

واپس لوٹتے ہوئے احمد اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا زہیر کے پہلو میں لایا اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اے امیر! میں آپ کو اس فتح پر مبارک باد دیتا ہوں"۔

زہیر نے گہری مسکراہٹ میں احمد کی طرف دیکھا پھر وہ کہہ رہا تھا۔ "سمرون! سمرون! میں نے میدانِ جنگ میں تمہیں لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ خدا کی قسم تم حنش بن عبداللہ سے بھی کہیں بہتر میرے ساتھی اور دستِ راست بن سکتے ہو۔ آج سے تمہاری حیثیت لشکر میں ایک سالار کی سی ہو گی۔ میں خوش اور مطمئن ہوں کہ مجھے تم جیسا رفیق کار مل گیا ہے۔ خدا کی قسم میں نے تمہارے حملوں میں قدم قدم پر قیامت اور لڑنے کے انداز میں ایک نئی طاقت و سختی دیکھی ہے"۔

زہیر چند ساعتوں کو رُکا پھر وہ کہہ رہا تھا۔ "سمرون! سمرون! سنو، دشمن اب چاروں طرف سے ہم پر یلغار کرے گا۔ جب کہ ہمارے لشکر کی تعداد ان کے سامنے نہ ہونے کے برابر ہے۔ لشکر کا ایک بڑا حصہ عقبہ بن نافع کے ساتھ جنگ میں کام آ گیا۔ وہ ایک باجبروت مجاہد اور قوم کا جلیل فرزند تھا۔ وہ جس طرف بھی بڑھتا تھا۔ دشمن کو بساط کی طرح سمیٹتا چلا جاتا تھا۔ مجھے اس کا نائب سالار ہونے پر فخر تھا۔ اس کی موت نے بھی لشکر پر بُرا اثر ڈالا ہے۔ اس کے علاوہ رہی سہی کسر حنش بن عبداللہ نے نکال دی ہے جو لشکر کے ایک حصے کے ساتھ علیحدہ ہو کر مصر کی طرف روانہ ہو گیا۔ سنو سمرون! ہمارا اب قیروان میں قیام کرنا انتہائی خطرناک ثابت ہو گا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم یہاں سے کوچ کرنے کے بعد برقہ شہر کی طرف روانہ ہوں گے۔ وہ شہر دشمن کی دسترس سے دور اور محفوظ ہے۔ میں وہیں قیام کر کے اس کمک کا انتظار کروں گا جو میں نے خلیفہ عبدالملک بن مروان سے طلب کی ہے۔ کمک آنے پر میں کھل کر دشمن کے خلاف حرکت میں آؤں گا"۔

احمد نے زہیر کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "میں ہر حال میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کا ہر فیصلہ میرے لیے آخری حکم ہو گا"

زہیر خاموش اور مطمئن رہا۔ لشکر اس جگہ آیا جہاں جنگ ہوئی تھی۔ وہاں سے اس

نے وہ مالِ غنیمت سمیٹا جو دُشمن چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اس کے بعد زہیر اپنے لشکر کے ساتھ قیروان کی بجائے برقہ شہر کی طرف کُوچ کر رہا تھا۔



برقہ شہر میں آبادی چونکہ زیادہ مسلمانوں کی تھی۔ لہٰذا زہیر بن قیس کا اس شہر سے قیام محفوظ اور پُرسکون تھا لیکن اسے برقہ شہر میں زیادہ انتظار کی زحمت نہ اُٹھانا پڑی تھی عبدالملک بن مروان نے اس کے لیے فی الفور کمک روانہ کر دی تھی۔

۶۷ھ میں اپنے لشکر کو از سرِ نو منظم کرنے کے بعد زہیر بن قیس نے دوبارہ مغرب کی طرف کُوچ کیا کسیلہ اور برانس کو بھی اپنے جاسوسوں کے ذریعے زہیر کے کوچ کی خبر ہو گئی تھی۔ لہٰذا زبردست جنگی تیاری کے بعد انہوں نے صحرائے بروج کے اندر کے مقام پر اپنے جرار لشکر کے ساتھ قیام کیا اور اسلامی لشکر کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ زہیر کو بھی اس کے قاصد دشمن کی نقل و حرکت کی خبریں دے چکے تھے لہٰذا اس نے بھی سیدھا صحرائے بروج کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

موسمِ سرما اپنے زوروں پر تھا۔ زہیر بن قیس رات ایک محفوظ جگہ بسر کرنے کے بعد ایک روز سورج طلوع ہونے سے تھوڑی دیر بعد صحرائے بروج میں نمودار ہوا اور دشمن کے سامنے اس نے اپنے لشکر کو خیمہ زن کیا۔

کسیلہ اور برانس نے مسلمانوں کو آرام کرنے کا موقع نہ دیا اور ان کے آتے ہی اپنی صفیں درست کرنا شروع کر دی تھیں۔ زہیر بن قیس نے بھی اپنے آپ کو جنگ کے لیے تیار کرنے میں زیادہ دیر نہ لی۔ اس نے اپنے لشکر کو فوراً تین برابر حصوں میں تقسیم کیا۔ قلب اس نے اپنے پاس رکھا، میمنہ پر اس نے احمد بن حشم کو سالار مقرر کیا اور میسرہ کی کمانداری اس جرنیل کے ہاتھ میں تھی جو عبدالملک بن مروان کی طرف سے آنے والی کمک کا سالار بن کر آیا تھا۔ دوسری طرف لشکر میں رومن اور بربر تھے اور ان کے قیمتی ہتھیاروں کی چمک دُور دُور تک کوند رہی تھی۔

کسیلہ اور برانس دونوں پشت میں رہ کر جنگ کی نگرانی کرتے رہے اور

سب سے پہلے انہوں نے اپنے قلب کو جنگ کی ابتدا کرنے کے لیے آگے بڑھایا۔ زہیر بن قیس بھی اپنا قلب لے کر آگے بڑھا ساتھ ہی اس نے اپنے میمنہ اور میسرہ کو بھی حملہ آور ہونے کا حکم دے دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد صحرائے بروج میں گھمسان کی جنگ چھڑ گئی تھی۔

احمد نے کسیلہ اور برانس کو اپنے لشکر کے پیچھے رہ کر احکام دیتے دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا وہ چھوٹا سا ایک کاوا کاٹتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ راستے میں اس نے دُشمن کے میمنہ پر اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ ہلکے پھلکے حملے کر کے اور پھر پسپائی کی صورت میں پیچھے ہٹ کر اسے اپنے پیچھے پیچھے لگا لیا تھا۔ اب جنگ کی صورتِ حال یہ تھی کہ دونوں لشکروں کے قلب اور میسرہ ایک دوسرے سے گھمسان کی جنگ کر رہے تھے۔ جب کہ مسلمانوں کا میمنہ کسیلہ اور برانس کے میمنہ کے آگے آگے بھاگ رہا تھا۔

آگے آگے بھاگتے ہوئے احمد اس جگہ آیا جہاں کسیلہ اور برانس کھڑے تھے۔ اس نے کسیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے اُسے للکارا۔ شاید وہ اسے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن دشمن کا میمنہ چونکہ اس کے تعاقب میں تھا لہٰذا اس نے فوراً حملہ کر کے کسیلہ اور برانس کے علاوہ ان کے محافظ دستوں کو بھی تہ تیغ کر دیا تھا۔ انولو نے بھی اس کام میں اس کی بھرپور مدد کی تھی۔ آج وہ بھی احمد کے پہلو بہ پہلو زندگی اور موت کی جنگ کر رہا تھا۔

کسیلہ اور برانس کو ختم کرنے کے بعد احمد نے ان خیموں کا رُخ کیا جن کے اندر دشمن کی خوراک اور رسد کے علاوہ ان کی عورتیں بھی تھیں۔ احمد اپنے لشکر کے ساتھ اندھا دُھند ان خیموں کے اندر گھس گیا۔ خرد گاہ کے محافظوں کو آناً فاناً اس نے قتل کر دیا اور بڑی تیزی سے خیموں کو آگ لگانا شروع کر دی تھی۔ اتنی دیر تک دشمن کا میمنہ اس کے سر پر آ پہنچا تھا۔ احمد نے فوراً اپنے لشکر کو سمیٹا اور بڑھ کر انتہائی مہلک اور جان لیوا حملہ دشمن کے میمنہ پر کر دیا تھا۔ یہ ایک ایسا سخت اور بروقت اور طوفانی حملہ تھا کہ دشمن پسپا ہو کر پیچھے ہٹنے لگا تھا۔

دوسری طرف دشمن کے قلب اور میسرہ کو جب کسیلہ اور برانس کے مرنے کی اطلاع ہوئی تو وہ کچھ بد دل ہو گئے اور پھر جب انہوں نے اپنے خیموں کو آگ میں جلتے اور اپنے

میمنہ کو بُری طرح پسپا ہوتے دیکھا تو وہ اور بددل ہو کر پیچھے ہٹنے لگا۔ عین اس موقع پر زہیر بن قیس کی تکبیروں کے جواب میں مسلمانوں نے یکبارگی حملہ کیا اور دشمن کے پاؤں اکھاڑ کر رکھ دیئے۔ دشمن کے لشکر کی اکثریت مسلمانوں کی تلواروں کا شکار ہو گئی اور جو بچے وہ قرطاجنہ کی طرف بھاگ گئے۔

جنگ ختم ہونے پر احمد ادھر اُدھر گھوڑا بھگاتا ہوا انولو کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ فکرمند تھا کہ کہیں وہ جنگ میں کام نہ آگیا ہو۔ ایک جگہ جہاں میمنہ کے زخمی ہونے والے سپاہی جمع کیے گئے تھے اور ان کے زخموں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی، احمد اپنے گھوڑے سے اُتر گیا۔ زخمیوں میں ادھر اُدھر گھومتے ہوئے اچانک ایک جگہ احمد کے پاؤں رُک گئے۔ اس کے سامنے انولو زخمی حالت میں پڑا تھا اور دو سپاہی اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

انولو کی آنکھیں بند تھیں۔ احمد اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے ہلکے ہلکے اس کو پکارا۔ "انولو! انولو!" ——— انولو نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں اور احمد کو اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ پھر اس نے مُردہ سی آواز میں کہا۔ "سمرون! سمرون! میں نے اپنی سُلگتی زندگی میں بہت مار کھائی، کئی زخم کھائے۔ کبھی کسیلہ کے ہاتھوں، کبھی اس کے خدام اور فرلس کے ہاتھوں۔ ان زخموں میں درد کی آگ اور تھکن کی لڑکھڑاہٹ تھی لیکن آج اپنے مذہب کی خاطر اور اپنے رب کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے جو گھاؤ لگے ہیں۔ خدا کی قسم ان کی لذت اور ان کا سرور نرالا ہے۔ قسم مجھے رب عظیم کی جی چاہتا ہے روز اپنے رب کی راہ میں جہاد کروں اور روز زخمی ہو کر میں اپنی شہادت کا انتظار کروں"۔

انولو ذرا رُکا پھر وہ کہہ رہا تھا۔ "احمد! احمد! ان زخموں میں انبساط کی لہر۔ قرب کی ہلچل اور پُرسکون لذت جیسی کیفیت ہے۔ کاش میں ——— انولو کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

احمد نے جب گھبرا کر اس کی نبض پر ہاتھ رکھا تو اس کی گردن جُھک گئی تھی۔ انولو دم توڑ چکا تھا۔ احمد انولو کو وہاں سے اُٹھانے لگا تھا کہ زہیر بن قیس اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں

آگیا۔ احمد فوراً کھڑا ہو گیا۔ زہیر گھوڑے سے اُترا، چند لمحوں تک وہ نہایت دُکھ کے ساتھ انولو کی لاش دیکھتا رہا پھر وہ آگے بڑھا اور احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا "سمرون! سمرون! مجھے تمہارے ساتھی کے مرنے کا دُکھ ہے۔"

احمد نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اس نے ابھی ابھی دم توڑا ہے۔ خدا کی قسم وہ خوش تھا کہ اپنے مذہب و ملّت کی خاطر وہ گھائل ہو کر موت سے بغلگیر ہو رہا ہے"۔

زہیر نے پھر احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے جلیس مہربان! اے انیس سعید! آج سے تُو میرا دست راست اور دمساز ہے۔ میں نے آج پہلی بار تمہارے اصل رنگ میں تمہیں لڑتا دیکھا ہے۔ خدا کی قسم تمہارے حملوں میں سپہ گرانہ قابلیت، بلند ہمتی اور طلسمات فتح و نصرت کی بکھری کئی داستانیں تھیں۔ میں تجھ جیسے بے غرض و جفاکش اور درویش صفت مجاہد کو سلام کرتا ہوں۔ تم نے کسیلہ اور برالس کو قتل کر کے ہمارے لیے نصرت و مسرت کے دروازے کھولے ہیں۔ ہم نے دشمن کو ایک حقارت آمیز ٹھوکر کے ساتھ جو شکست دی ہے وہ اسے نسل در نسل یاد رکھے گا"۔

زہیر بن قیس کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ دو سوار اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے رزم گاہ میں داخل ہوئے اور پھر زہیر بن قیس کے سامنے آرُکے۔ وہ زہیر بن قیس کے جاسوس تھے اور انہیں دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔ "کیا تم کوئی نئی خبر لائے ہو؟"

ان میں سے ایک نے پریشانی میں کہا۔ "ہم ایک بُری خبر لے کر آئے ہیں۔ کہ قسطنطنیہ کے عیسائی شہنشاہ کا ایک جنگی بیڑہ جس میں ان گنت لڑاکے اور جنگجو رومن سوار ہیں۔ ہمارے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ وہ برقہ کی بندرگاہ پر اتریں گے اور پھر ہمارے ساتھ جنگ کرنے کے لیے کسی مناسب جگہ کا انتخاب کریں گے۔ اس کے علاوہ یہاں کے مقامی رومن بھی قرطاجنہ کے حکمران کے تحت جمع ہو کر ہمارے ساتھ فیصلہ کن جنگ کرنے کی تیاریاں مکمل کر چکے ہیں"۔

زہیر نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "سمرون! سمرون! شاید قدرت کو

ہمارا امتحان منظور رہے۔ میں تمہیں اپنے لشکر کے ہراول دستوں کا سالار مقرر کرتا ہوں۔ اے میری قوم کے فرزندِ جلیل! آؤ دونوں مل کر دشمن کے اس امڈتے طوفانوں کا مقابلہ کریں قسطنطنیہ کے بھیڑیوں سے نمٹنے کے بعد ہم مشرق کا رُخ کریں گے اور وہاں کے بے حال انسانوں کو امن کی بشارت مستقبل کی سلامتی کا درس دیں گے۔"

احمد نے جواب میں اپنی چھاتی تانتے ہوئے کہا۔ "اے میرے امیر! میں ہر لمحہ ہر گھڑی آپ کے ساتھ ہوں۔ میں کسی کام میں آپ کو مایوس نہ کروں گا۔ زہیر بن قیس نے فوراً مال غنیمت کو سمیٹا پھر وہ اپنے لشکر کے ساتھ واپس برقہ شہر کی طرف کوچ کر رہا تھا۔



زہیر بن قیس جب اپنے لشکر کے ساتھ برقہ شہر سے ذرا فاصلے پر پہنچا تو اس نے دیکھا شہر سے باہر ایک کھلے اور وسیع میدان میں قسطنطنیہ کا لشکر پہلے ہی خیمہ زن تھا قبل اس کے زہیر اپنے لشکر کے ساتھ ان کے سامنے پڑاؤ کرتا قسطنطنیہ کے لشکر نے آگے بڑھ کر اس پر حملہ کر دیا۔

زہیر بن قیس اور احمد نے اپنے لشکر کے ساتھ پوری جانفشانی سے مقابلہ کیا، اور جب وہ دونوں قسطنطنیہ کے لشکر کو شکست دینے کے قریب تھے۔ قرطاجنہ کے حکمران کے تحت جمع ہونے والے افریقی رومنوں کے ایک بھاری لشکر نے اچانک مسلمانوں کی پشت پر حملہ کر دیا۔ اس طرح مسلمان اس دوطرفہ حملے میں پس کر رہ گئے۔

مسلمانوں کا سارا لشکر تہ تیغ کر دیا گیا۔ زہیر بن قیس بھی اس جنگ میں مارا گیا۔ صرف دس آدمی زندہ گرفتار کر لیے گئے۔ ان میں احمد بھی شامل تھا۔ رومنوں کو خبر ہو گئی تھی کہ احمد مسلمانوں کے لشکر کے ہراول کا سالار ہے لہذا وہ اس کی نگرانی کو بہت اہمیت دے رہے تھے۔

قسطنطنیہ کا لشکر اپنے بحری جہازوں سے واپس لوٹ گیا۔ قرطاجنہ کا لشکر ان دس مسلمان قیدیوں کو اس غرض سے اپنے ساتھ لے کر قرطاجنہ کی طرف روانہ ہو گیا کہ یہ مسلمان

ان کے لشکر کو مسلمانوں کے جنگی قواعد کی تربیت دیں گے۔

قرطاجنہ کا لشکر جس میں بربر، رومن اور فرانسیسی شامل تھے بڑی تیزی سے مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دس مسلمان قیدیوں کو جن میں احمد بھی شامل تھا، دو جنگی رتھوں میں بٹھا رکھا تھا اور ان کے ہاتھ ان کی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

راستے میں پڑنے والے سیدار شہر کے قریب لشکر نے پہلا پڑاؤ کیا۔ یہاں انہوں نے ایک دن اور رات آرام کیا اور کوچ کر گئے۔ دوسرا پڑاؤ انہوں نے بلنس شہر میں کیا۔ یہاں سے قرطاجنہ صرف تیس میل کے فاصلے پر تھا۔

بلنس ایک ساحلی شہر اور بندرگاہ ہے۔ اس کے مشرق کی طرف ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ سیاہ چٹانوں والے کوہستانوں کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ اس کے شمال میں سمندر اور جنوب اور مغرب میں لق و دق صحرا ہے۔ قرطاجنہ کے لشکر نے شہر کے مغرب میں صحرا کے اندر ہی پڑاؤ کیا تھا۔ اس وقت سورج غروب ہو گیا تھا اور رات اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ نزول کر رہی تھی۔

مسلمان قیدیوں کو جنگی رتھوں سے اُتار کر پہلے انہیں پانی پلایا گیا پھر ریت پر بٹھا کر ان پر تین مسلح جوانوں کا پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے آگ کے الاؤ روشن ہو گئے تھے اور لشکر کے لیے کھانا تیار ہونے لگا تھا۔

جنگی رتھ سے اُترنے اور پانی پینے کے بعد احمد ریت پر لیٹ گیا۔ اندھیرے کے اندر اچانک وہ چونک پڑا۔ اُسے اپنے دونوں کندھوں کے درمیان ریت میں دفن ایک پتھر محسوس ہوا تھا۔ اس نے فوراً اپنے آپ کو اوپر کی طرف سمیٹا اور اپنے ہاتھ اس پتھر کی سیدھ میں لایا جو ریت سے باہر ایک نوک کی شکل میں ابھرا ہوا تھا۔

احمد کا ذہن بڑی تیزی کے ساتھ کام کرنے لگا تھا۔ اس نے اس موٹے رسّے کو جس سے اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اس نوکیلے پتھر سے رگڑ رگڑ کر کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ چند ثانیوں کی سخت محنت کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا اور اس نے رسّے کو کاٹ کر اپنے ہاتھوں کو آزاد کرا لیا تھا۔ تاہم پہریداروں کے شک

دشمن سے بچنے کی خاطر وہ اسی طرح چت زمین پر لیٹا رہا تھا۔

جب پہریداروں کا کھانا آیا اور وہ تینوں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھانے لگے، احمد حرکت میں آیا۔ پہلے اس نے اپنے ۹ مسلمان جنگی قیدیوں پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی پھر وہ اوندھے منہ لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ رینگ کر آگے کی طرف بڑھنے لگا۔

تاریکی ہونے اور کھانے میں مصروف ہونے کی وجہ سے پہریداروں کی نگاہ اس پر نہ پڑی تھی لہٰذا وہ رینگتا ہوا دُور نکل گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ادھر نکل آیا جہاں لشکر کے گھوڑے اور اونٹ بندھے ہوئے تھے۔ وہ بلا تامل جانوروں کے اندر گھس گیا۔ اب وہ رینگنے کے بجائے جھک جھک کر بھاگ رہا تھا۔

ایک جگہ وہ ٹھٹھک کر رُک گیا، وہاں اونٹوں کے قریب سامان کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ احمد نے ٹٹول کر دیکھا وہ سب جنگی سامان تھا۔ اس نے جلدی جلدی تیروں سے بھرا ہوا ترکش اپنی پشت پر باندھ لیا۔ ایک تلوار، ڈھال اور کمان بھی اس نے اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور خون آلود تھے۔ اس نے وہاں اپنے لیے کپڑے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ ناچار وہ وہاں سے ہٹا۔ ایک اُونٹ کی نکیل پکڑ کر اسے اٹھایا۔ اس کی گردن پکڑ کر وہ اس پر سوار ہوا اور اُسے مغرب کی طرف اس نے سرپٹ دوڑانا شروع کر دیا تھا۔ گو اس کے لیے مشرق کی طرف بھاگنا سود مند تھا لیکن چونکہ جنگی قیدی لشکر کے مغرب میں تھے اور مشرق میں دُور دُور تک لشکر پھیلا ہوا تھا لہٰذا وہ جان بچانے کی خاطر اونٹ کو مغرب کی طرف ہی دوڑانے لگا تھا۔

صحرا کے اندر چار پانچ میل کا سفر طے کرنے کے بعد اسے اپنے پیچھے گھوڑوں کے ہنہنانے اور نتھنے پھڑپھڑانے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا تعاقب شروع ہو گیا ہے۔ اس نے اونٹ کو ایڑ پر ایڑ لگانا شروع کر دی تھی لیکن تھوڑی دُور آگے جا کر جب اس نے محسوس کیا کہ وہ آوازیں اس سے قریب تر ہوتی جا رہی ہیں تو اس نے کچھ سوچا پھر وہ اونٹ کو ریت کے ایک بلند ٹیلے کے پیچھے لے گیا تھا۔ اپنے کندھے سے لٹکتی ہوئی کمان اس نے اتار کر اس پر تیر چڑھا لیا تھا۔

تعاقب کرنے والے شاید اونٹ کے پاؤں کا تعاقب کرتے آ رہے تھے لہٰذا وہ سیدھے اسی ٹیلے کی طرف آئے جس کی اوٹ میں احمد کھڑا تھا۔ جب نزدیک آئے تو احمد نے اوٹ میں سے دیکھا وہ تین سوار تھے۔ اس نے باری باری ایسی برق رفتاری سے ان پر تیروں کی بوچھاڑ ماری کہ وہ تینوں ریت پر گر کر دم توڑ گئے۔

احمد اپنی تلوار سونت کر نیچے اُترا۔ اس نے دیکھا وہ مر چکے تھے۔ اس نے جلدی جلدی ایک خوب صورت اور خوب توانا گھوڑے کو پکڑ کر اونٹ کی دُم سے باندھ دیا۔ دوسرے دو گھوڑوں کی خرجینیں بھی جن میں سامان بھرا تھا اس نے اُتار کر اس گھوڑے کی زین سے باندھ دیں جسے اُس نے اُونٹ کی دُم سے باندھا تھا۔ دوبارہ وہ اونٹ پر سوار ہوا اور اسے مہمیز پر مہمیز لگا کر وہ صحرا کے اندر سرپٹ دوڑانے لگا تھا۔

آدھی رات کے بعد دُور تاریک آسمان پر اسے ہلکی سی روشنی دکھائی دی۔ ایک تو وہ زخمی تھا دوسرے لباس پھٹا ہوا تھا اور تیز سردی میں وہ ٹھٹھر رہا تھا لہٰذا اونٹ کو اس نے اس روشنی کی طرف اور تیزی سے ہنکانا شروع کر دیا تھا۔

تھوڑی دُور آگے جا کر اس نے دیکھا بائیں ہاتھ صحرا کے اندر کوہستانوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس کے دامن میں دُور دور تک ریگستان کے بجائے زرخیز زمین پھیلی ہوئی تھی۔ اب وہ روشنی کے قریب آ گیا تھا۔ وہ کوہستانوں کے دامن میں ایک بستی تھی جس کے اِرد گرد کھیت اور پھل دار درخت لہرا رہے تھے۔

مکئی کے ایک کھیت کے کنارے وہ رُک گیا اور مڑ کر دُور مشرق میں طلوع ہوتے چاند کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس بستی میں داخل ہو یا کہیں اور سمت نکل جائے۔ اجنبی دیسوں میں کسی ہمدم کی تلاش میں وہ فکر مند تھا۔

چاندنی دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔ ظلمتوں کا سفر تمام ہوا تھا۔ ٹھنڈی چاندنی امرت برساتی، جوان آرزوؤں کا رنگ بکھیرتی اور خوابوں کی بساط بچھاتی ہوئی کائنات کی ہر شے سے لپٹنے لگی تھی۔ ویران لمحے اور اجاڑ اجاڑ راہ گزر، رات، چاندنی اور پودوں کی کچی خوشبو میں دلکش اور پُرفریب ہو گئے تھے

احمد مڑ کر دوبارہ بستی کی طرف دیکھنے لگا۔ سحر کے نشیب و فراز اب واضح ہونے لگے تھے۔ سردی کے مارے اور درختوں کے پتّوں میں چھپ کر رات بسر کرنے والے پرندے اب جاگتے ہوئے اپنے رب کی حمد میں سوز و سلام گانے لگے تھے۔ جیسے وہ کائنات کی ہر شے کو پکار پکار کر کہہ رہے ہوں "لَاتَنَمْ قُمْ (مت سوؤ! اُٹھو)

شاید اس نے کوئی آخری فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے اونٹ کو بستی کی طرف ایڑ لگا دی تھی۔ بستی میں داخل ہو کر وہ پھر رُک گیا اور سوچنے لگا کہ کس گھر کے دروازے پر دستک دے۔ آخر وہ اپنے اُونٹ سے اُترا۔ ایک مکان کے دروازے پر وہ رکا، جھجکا پھر ہلکی سی دستک دی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے دوبارہ ذرا لمبی اور تیز دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد اندھیرے میں مکان کے اندر کسی کے کھانسنے کی آواز آئی پھر کسی ادھیڑ عمر کے مرد کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی "کون ہے؟"

احمد نے مدھم آواز میں کہا "ایک مسافرِ شب ہوں! رات، ہوا اور سردی کی مار سے بچنے کے لیے تھوڑی دیر کی پناہ چاہتا ہوں۔" اندر سے کوئی جواب نہ ملا لیکن چند ہی ثانیوں بعد مکان کا دروازہ کھل گیا اور ایک ناتواں بوڑھا احمد کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی داڑھی ساری سفید تھی اور سر پر اس نے جو عمامہ باندھ رکھا تھا وہ پرانا اور بوسیدہ تھا۔

اس بوڑھے نے چاندنی رات میں غور سے احمد کی طرف دیکھا۔ اس کا جسم خون آلود تھا۔ سر پر رکھے آہنی خود پر بھی خون خشک ہو کر جم گیا تھا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور اس کی زرہ نیچے سے دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی پشت پر تیروں سے بھرا ترکش اور کندھے پر کمان لٹک رہی تھی۔

بوڑھے نے دُکھ اور ہمدردی سے پوچھا "تم کون ہو اور تمہاری ایسی حالت کس نے بنائی ہے؟"

احمد نے سردی سے لرزتی اور کپکپاتی آواز میں کہا "میں اپنے دشمنوں کی قید میں تھا اور بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگا ہوں۔ تھوڑی دیر کی پناہ چاہتا ہوں تاکہ اپنے آپ

کو گرم کرنے کے علاوہ اپنے زخموں کی مرہم پٹی بھی کر لوں۔ میں زیادہ دیر رُک کر آپ کی تکلیف کا باعث نہ بنوں گا، سُورج طلوع ہونے سے قبل ہی یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔"

بوڑھا جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مکان کے اندر سے کسی نوخیز لڑکی کی آواز سُنائی دی۔ "بابا! بابا! کون ہے؟ اور تم سردی میں دروازے پر کیوں کھڑے ہو گئے ہو۔"

بوڑھے نے چونک کر احمد سے کہا "اندر آ جاؤ، تمہیں مرہم، آگ اور آرام کی ضرورت ہے"۔ بوڑھے نے سارا دروازہ کھول دیا اور خود پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

احمد اپنے اونٹ کی نکیل تھامے اندر داخل ہوا۔ صحن میں ایک سولہ سترہ برس کی نوخیز و حسین لڑکی اور ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا کھڑے تھے۔ لڑکی نے آگے بڑھ کر اس بوڑھے سے پوچھا "یہ کون ہے بابا!"

بوڑھے نے ترس کھاتی ہوئی آواز میں کہا "کوئی مسافر ہے بچارہ، زخمی اور بد حال ہے، تھوڑی دیر کی پناہ چاہتا ہے۔"

بوڑھا آگے بڑھا اور احمد سے کہا "لاؤ میں تمہارا اونٹ اور گھوڑا باندھ کر انہیں چارہ ڈالتا ہوں"۔ احمد کچھ کہنا چاہتا تھا کہ لڑکی بھاگ کر آگے بڑھی اور کہا "بابا! بابا! آپ چھوڑ دیں۔ میں خود باندھ آتی ہوں۔"

لڑکی نے فی الفور احمد کے ہاتھ سے اُونٹ کی مہار لے لی۔ لڑکا بھی بھاگ کر آگے بڑھا۔ اس نے گھوڑے کی باگ اونٹ کی دُم سے کھول کر اسے پکڑ لیا اور دونوں اس چھپّر کی طرف چلے گئے جس کے اندر ان کا اپنا ریوڑ بندھا ہوا تھا۔

وہ بوڑھا احمد کو لے کر ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں آتش دان روشن تھا۔ اور دائیں طرف ایک مصلّے نما چٹائی بچھی ہوئی تھی جس پر ایک تسبیح پڑی تھی، ایسا لگتا تھا گویا ابھی ابھی کوئی نماز سے فارغ ہوا ہو۔ بوڑھا بوکھلا گیا۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر تسبیح اُٹھائی اور جیب میں ڈال لی۔ چٹائی لپیٹ کر اس نے ایک طرف رکھ دی تھی۔

احمد کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی جس پر اس نے جلد ہی قابو پا لیا

تھا۔ اتنی دیر تک وہ لڑکی اور لڑکا بھی اس کمرے میں آگئے تھے۔ بوڑھا مڑا اور احمد کا ہاتھ پکڑ کر آتش دان کے سامنے بچھی ہوئی چٹائی پر بٹھلاتے ہوئے کہا "آگ کے پاس بیٹھو۔ شاید تم ساری رات سفر کرتے رہے ہو۔ تمہیں حرارت اور آرام کی ضرورت ہے"۔

احمد نے منہ سے کچھ نہ کہا اور جوتے اُتار کر وہ آگ کے پاس چٹائی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بوڑھا، لڑکی اور لڑکا بھی اس کے قریب آگ کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

بوڑھا چند لمحوں تک غور سے احمد کی طرف دیکھتا رہا پھر ہمدردی سے پوچھا "تم کون ہو بیٹے! تمہارا نام کیا ہے اور تم اپنے کن دشمنوں سے جان بچا کر بھاگے ہو۔ اگر تمہارے زخم گہرے ہوں تو لاؤ میں مرہم پٹی کر دوں"۔

احمد نے ایک سرسری سی نگاہ لڑکی اور لڑکے پر ڈالی۔ لڑکی بلا کی حسین اور پُرکشش تھی اور ان دونوں کے گلوں میں سنہری صلیبیں لٹک رہی تھیں۔ وہ کچھ شش و پنج میں پڑ گیا پھر اس نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری داستان بہت طویل اور دل فگار ہے۔ آپ سنتے سنتے تھک جائیں گے۔ آپ پہلے اپنے متعلق کچھ بتائیں پھر میں اپنی داستان آپ سے کہہ دوں گا"۔

بوڑھا کھسک کر احمد سے ذرا قریب ہوا اور سرگوشی میں کہا۔ "ہمارے متعلق جان کر کیا کرو گے۔ تم اجنبی ہو، اپنے متعلق کہو کہاں سے آئے ہو، کدھر جاؤ گے، کون ہو اور تمہیں کس کی تلاش ہے۔

احمد نے بوڑھے سے پوچھا "کیا اس گھر میں کوئی اور بھی رہتا ہے۔ بوڑھے نے اپنے ہاتھ آگ پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں ہم تین ہی اس گھر کے فرد ہیں"۔ احمد نے اس بار پریشانی کے عالم میں پوچھا "کیا تم تینوں دو مختلف مذاہب کے پیروکار ہو"۔ بوڑھے نے فکرمند ہو کر پوچھا۔ "یہ اندازہ تم نے کیسے اور کیونکر لگایا ہے۔

احمد نے گہری نگاہوں سے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں جب اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو یہاں ایک مصلے بچھا تھا اور اس پر تسبیح رکھی تھی۔ جو آپ نے فوراً اُٹھا کر جیب میں ڈال لی اور مصلے تہہ کر دیا تھا۔ یہ دونوں چیزیں اس امر کا انکشاف

کرتی ہیں کہ اس گھر میں کوئی مسلمان ہے لیکن دوسری طرف اس لڑکی اور لڑکے کے گلوں میں سنہری صلیبیں لٹک رہی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس گھر کے مکین عیسائی ہیں"۔

بوڑھے نے احمد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "ان دونوں عوامل میں آپ کی وارفتگی کس طرف تھی"۔

احمد نے بلا تامل کہہ دیا۔ "مصلے اور تسبیح دیکھ کر میں اس امر پر خوش ہوا تھا کہ میں نے صحیح دروازے پر دستک دی ہے"۔

بوڑھے نے کھل کر کہا۔ "تو پھر مطمئن رہیے آپ نے صحیح دروازے پر دستک دی ہے۔ ہم آپ کے ہم مذہب ہیں"۔

احمد نے لڑکی اور لڑکے کے گلے میں لٹکتی ہوئی صلیبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "لیکن یہ صلیبیں؟"

بوڑھے نے کہا۔ "یہ ایک طویل اور دکھ بھری داستان ہے"۔

احمد نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "میں اسے ضرور سنوں گا"۔

بوڑھے نے ایک بار لڑکی اور لڑکے کی طرف غور سے دیکھا پھر اس نے احمد کو مخاطب کرکے کہا۔ "تو پھر سنو!" بوڑھا کہہ رہا تھا۔

"میرا نام زیوس ہے۔ یہ لڑکی میری بیٹی ہے اس کا نام ارتمیس اور لڑکا میرا بیٹا ہے اس کا نام ہرمس ہے۔ ہم یونانی ہیں۔ یہ ہجری ۵۰ کی بات ہے جب عقبہ بن نافع پہلی بار ان علاقوں پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس وقت ہم قیروان کے قریب ایک بستی میں رہتے تھے۔ عقبہ بن نافع کے لشکر کے ایک مبلغ کے ہاتھوں ہم نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہماری طرح اور بے شمار لوگ مسلمان ہو گئے لیکن افسوس عقبہ بن نافع ہجری ۵۵ میں واپس چلا گیا اور ان لوگوں پر مظالم شروع ہو گئے، جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ عیسائی اور مقامی بُت پرست لوگ ایسے مسلمانوں کو اذیتیں دے دے کر یا تو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور یا ہلاک کر دیتے تھے۔

ہم نے بھی ان مظالم کے خوف سے اپنی بستی چھوڑ دی اور دور دراز کے ان پہاڑوں

ہیں آکر آباد ہو گئے ۔ یہاں پہلے جنگل تھا ' اب ایک خوب صورت بستی آباد ہو چکی ہے ۔ اس بستی کے سب لوگ مسلمان ہیں لیکن کسی پر ظاہر نہیں کرتے کہ وہ مسلمان ہیں ۔ اسی لیے ظاہری طور پر وہ اپنے گلوں میں صلیبیں ڈالے رکھتے ہیں تاکہ کسی کو شک نہ ہو اور کوئی ان سے باز پرس نہ کرے ۔

یہاں دور دور تک کوئی اور بستی نہیں ہے ۔ قرطاجنہ شہر یہاں سے دس میل کے فاصلہ پر ہے ۔ اس بستی کے لوگ برسات کے موسم میں پہاڑوں سے اُترنے والا پانی بڑے بڑے تالابوں میں جمع کر لیتے ہیں اور پھر سال بھر اسی پانی سے اپنی فصلوں کو سیراب کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ لوگوں نے اپنے ریوڑ پال رکھے ہیں ۔ کچھ لوگ تالابوں میں مچھلی پالتے ہیں اور پوری بستی کو ان کی خوراک مہیا کرتے ہیں ۔ یہاں کوئی بھوکا نہیں سوتا اس لیے کہ بستی کے سب لوگ مسلمان ہیں ۔ یہاں ایک بھائی چارہ ہے اور سب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں ۔ ہم نے بھی ایک ریوڑ پال رکھا ہے اس کے علاوہ ہم غلہ بھی اُگاتے ہیں ۔

کسی کو خبر نہیں کہ اس بستی کے لوگ مسلمان ہیں ۔ سب لوگ انفرادی طور پر اپنے گھروں میں عبادت کرتے ہیں بستی کے وسط میں ایک کلیسا بھی بنا رکھا ہے جس کی خوب دیکھ بھال کی جاتی ہے تاکہ یہاں سے گزرنے والے لوگ یہی تصور لیں کہ ہم عیسائی ہیں"۔

بوڑھا خاموش ہُوا ' پھر استفہامیہ انداز میں اس نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" اب تم اپنے بارے میں کچھ کہو "۔

احمد کہہ رہا تھا ۔" میرا اصل نام تو احمد ہے لیکن حالات نے مجھے احمد سے سمرون بنا دیا اور اب سمرون کے نام سے مجھے زیادہ لوگ جانتے ہیں"۔

اس کے بعد احمد' زیوس' ارتمیس اور ہرمس کو وادی شعیب سے اپنے اغوا ' غلام کی حیثیت سے کسیلہ بادشاہ کے ہاتھ بکنے ' وہاں کے مظالم ، کرداموانولو کے خلوص اور وہاں سے بھاگنے کے واقعات سنا رہا تھا ۔

وہ تینوں اس کے سامنے خاموش بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو گئے تھے ۔ احمد نے جب انہیں رومنوں کے ہاتھوں اپنی شکست ' زہیر بن قیس کے قتل

اور اپنے فرار ہو کر ان کی بستی کی طرف آنے کے واقعات سنائے تو ارتمیس ہچکیاں اور سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی ۔ زیوس اور ہرمس کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے ۔

بوڑھے زیوس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔" آہ ! پہلے عقبہ بن نافع مارا گیا ۔ اب زہیر بن قیس بھی جنگ میں کام آگیا ہے اور مسلمانوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا ہے نہ جانے اب ان صحراؤں کے اندر نو مسلموں کا مستقبل کیا ہو گا ۔ نہ جانے کب تک ہمیں ایسی ہی پابند اور اجاڑ زندگی بسر کرنی پڑے گی "۔

احمد نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا ۔" آپ فکر مند نہ ہوں میں یہاں سے نکل کر سیدھا دمشق میں خلیفہ عبدالملک کے پاس جاؤں گا اور اس سے ان صحراؤں میں اپنا وقار بحال کرنے کی درخواست کروں گا ۔ اُمید ہے میں مایوس نہ لوٹوں گا اور جن صحراؤں نے ہماری بے بسی اور جن ستاروں نے ہماری شکستگی اور ہزیمت کا منظر دیکھا ہے ۔ آنے والے دور میں وہ ہماری مشق و ریاضت اور ہماری عزیمت پر مسکرائیں گے ۔ دوری کے اس اجاڑ جنگل میں اس وقت ہم بے بس ضرور ہوں لیکن آنے والا دور اپنی شمشیر کی نوک سے ہماری تاریخ کے سنہری اوراق کی کتابت کرے گا "۔

احمد جب خاموش ہُوا تو ارتمیس نے پہلی بار اپنے آنسو پونچھ کر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ۔" آپ کے کپڑے خون آلود ہیں ۔ شاید آپ زخمی ہیں ۔ آپ کو مرہم پٹی کی ضرورت ہو گی "۔

احمد نے آگ پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا ۔" مجھے جنگ کے دوران کوئی زخم نہ آیا تھا ۔ جنگ کے بعد جب انہوں نے مجھے نہتا کر کے گرفتار کیا تو اس وقت میں نے مزاحمت کی تھی اور انہوں نے مجھے ڈھالوں سے مارا تھا ۔ میرے یہ کپڑے جنگ کے دوران خون آلود ہوئے تھے ۔ تاہم یہ ان کی ڈھالوں کی مار سے پھٹ گئے ہیں جسم پر زرہ ہونے کی وجہ سے مجھے کوئی گہرا زخم نہیں لگا ۔ دائیں شانے پر معمولی سا ایک زخم ہے ۔ جو آپ ہی مندمل ہو جائے گا "۔

زیوس نے ارتمیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم اٹھو بیٹی! مرہم پٹی کے سامان کے علاوہ میرے کپڑوں کا ایک نیا جوڑا اور کھانا بھی لے آؤ۔"

ارتمیس فوراً اُٹھی اور تیز تیز چلتی ہوئی دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔

زیوس نے ہرمس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جاؤ بیٹے! تم بھی اپنی بہن کی مدد کرو۔" ہرمس بھی اُٹھا اور بھاگتا ہوا ارتمیس کے پیچھے چلا گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بہن بھائی لوٹے۔ ارتمیس نے کھانے کے برتن اُٹھا رکھے تھے اور کندھے پر اس نے اپنے باپ کے کپڑوں کا ایک جوڑا رکھا تھا۔ ہرمس نے مرہم پٹی کا سامان اُٹھایا ہوا تھا۔ ساری چیزیں جب انہوں نے چٹائی پر رکھ دیں تو زیوس نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنا شانہ دکھاؤ بیٹے! میں مرہم لگا کر پٹی باندھ دیتا ہوں۔"

احمد نے ٹالتے ہوئے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں۔ زخم کوئی گہرا نہیں کہ مرہم کی ضرورت درپیش ہو، ذرا گہری سی رگڑ ہوگی جس سے خون بہہ نکلا ہوگا۔" زیوس اپنی جگہ سے اُٹھتا ہوا بولا "تم اپنا شانہ اِدھر کرو، میں دیکھتا ہوں۔" زیوس نے خود شانے سے پھٹی ہوئی عبا ہٹائی اور دوبارہ احمد سے کہا۔ "ذرا اپنی زرہ اُتارو۔"

احمد نے فوراً زرہ اُتار کر اپنے سامنے رکھ دی۔ زرہ سے نیچے شانے پر قمیض پھٹی ہوئی تھی اور وہاں تین گہری خراشیں تھیں۔ ارتمیس بھی آگے بڑھ کر زخم پر جھک گئی تھی زیوس نے پانی منگوایا۔ ہرمس اُٹھا اور بھاگ کر مٹی کے پیالے میں پانی لے آیا۔ زیوس نے زخموں کو پہلے دھو کر خوب صاف کیا۔ پھر روئی سے اچھی طرح زخم خشک کرنے کے بعد اس نے مرہم لگائی اور کس کر پٹی باندھ دی تھی۔

ارتمیس احمد کے سامنے آئی اور اپنے کندھے پر رکھے ہوئے کپڑے احمد کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ ساتھ والے کمرے میں جا کر کپڑے بدل لیں پھر آ کر کھانا کھائیں۔"

احمد نے پہلی بار غور سے ارتمیس کی طرف دیکھا۔ وہ یونانی دیوی وینس کی طرح حسین اور دلکش تھی جیسے جھیل میں اترا ہوا کوئی ستارہ، جیسے بیکراں سمندر میں پگھلی ہوئی چاندنی

جیسے آسمان کی جبیں پر چاند کا جھومر۔ احمد اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کی آبشاروں کی سی نغمگی اور کسی آب جو کی گنگناہٹ جیسی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

احمد ابھی تک ارتمیس کے حسن و دلکشی کے طلسم اور اس کی حدی خواں کی حلاوت اور مغنی کی نوا جیسی آواز کے سحر میں کھویا ہوا تھا کہ ارتمیس کی اجنبیت کی دیواریں توڑتی آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "آپ کہاں کھو گئے ہیں۔"

احمد فوراً سنبھل گیا اور کپڑے لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس لوٹا۔ ارتمیس نے اس کے سامنے کھانے کے برتن لگا دیئے اور وہ آگ کے پاس بیٹھ کر چپ چاپ کھانا کھا رہا تھا۔

احمد جب کھانا کھا چکا اور ارتمیس برتن اُٹھانے لگی تو احمد نے پوچھا۔ میں اپنے ساتھ جو گھوڑا لایا ہوں اس کی زین سے میں نے اپنا تعاقب کرنے والے سپاہیوں کو ختم کر کے ان کے گھوڑوں کی خرجینیں بھی باندھی تھیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان میں کیا ہے تاکہ ——

ارتمیس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ میں وہ خرجینیں اُتار کر ساتھ والے کمرے میں رکھ آئی ہوں۔ برتن رکھ کر میں وہ اُٹھا لاتی ہوں۔" ارتمیس برتن رکھ کر لوٹی تو اس نے تین خرجینیں اٹھا رکھی تھیں۔

احمد ان سے سامان نکال نکال کر باہر رکھنے لگا۔ ان میں رومن سپاہیوں کے فالتو کپڑے، کھانے کا سامان اور جنگ میں ہاتھ لگنے والے سنہری سکّوں کی تھیلیاں تھیں۔ احمد نے سارا سامان زیوس کی طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ "یہ سب آپ سنبھال لیں اور اپنے کام میں لائیں۔"

زیوس نے ہمدردی سے کہا۔ "یہ تم اپنے پاس رکھو۔ اس وقت تم زیادہ ضرورتمند ہو۔" احمد نے کہا۔ "مجھے اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو آپ سے مانگ لوں گا۔"

زیوس نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ "اب تمہارا لائحہ عمل کیا ہوگا۔" احمد

کہہ رہا تھا ۔" مَیں پہلے اپنے نو ساتھیوں کی رہائی کا سامان کروں گا جو اس وقت دُشمن کی قید میں ہیں ۔ مَیں انہیں ظلم کی بھٹی میں چھوڑ کر اکیلا فرار نہیں ہونا چاہتا ۔ میرے رب نے مجھے توفیق دی تو مَیں انہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا ۔ ان میں سے دو میرے ہراول دستوں کے اور باقی قلب اور میمنہ کے سپاہی ہیں ۔ مَیں کل رات قرطاجنہ شہر میں داخل ہو کر ان کا پتہ کروں گا اور ان کی رہائی کے لیے کچھ کرنے کی کوشش کروں گا ۔"

زیوس نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا ۔" اگر تم انہیں رہائی دلانے میں کامیاب ہو گئے تو تم فی الفور تو انہیں ساتھ لے کر یہاں سے بھاگ نہ سکو گے ۔ اس طرح دشمن تعاقب کر کے تم پر قابو پالے گا ۔ اس کے لیے کوئی محفوظ ٹھکانہ چاہئیے جہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ چند روز چھپ کر تم گزار سکو اور جب تمہاری تلاش کا سلسلہ مدھم پڑ جائے تو تم اپنے اس ٹھکانے سے اپنی منزل کی طرف بھاگنے میں کامیاب ہو جاؤ ۔"

ہرمس نے فوراً درمیان میں بولتے ہوئے کہا ۔" ایسا ایک ٹھکانہ میرے ذہن میں ہے ۔ جس کوہستان پر مَیں اپنا ریوڑ چراتا ہوں وہاں تین چار ایسی غاریں ہیں جن کا منہ بالکل تنگ ہے اور صرف ایک آدمی اس کے اندر داخل ہو سکتا ہے لیکن اندر سے وہ کافی کھلی ہیں اور بیک وقت کئی آدمی اس میں ٹھہر سکتے ہیں ۔ آپ اپنے ساتھیوں کو ان غاروں کے اندر ٹھہرائیے جب دُشمن کی طرف سے خطرہ نہ رہے تو پھر وہاں سے بھاگ جائیے ۔" احمد نے تحسین آمیز نگاہوں سے ہرمس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔" تمہاری تجویز درست ہے ۔ اگر مَیں اپنے ساتھیوں کو رہا کرانے میں کامیاب ہو گیا تو ایسا ہی کروں گا ۔"

احمد نے ذرا رُک کر کہا ۔" میرے ذمے اس کے علاوہ دو اور کام بھی ہیں ۔ ایک تو بستی سے لے کر صحرا تک اس گھوڑے اور اُونٹ کے قدموں کے نشانات مٹانے ہیں ۔ جنہیں مَیں اپنے ساتھ لایا ہوں ۔ ان کی مدد سے دُشمن مجھے تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے ۔" ——— " صحرا کے اندر یہ نشانات ہوا سے آپ ہی آپ مٹ جائیں گے ۔"

ہرمس نے پھر کہا ۔" آپ فکر نہ کریں ۔ مَیں کل اپنے ریوڑ کو صحرا تک لے جانے کے بعد دائیں طرف مڑ کر کوہستانوں پر چرنے کے لیے چھوڑ دوں گا ۔ اس طرح یہ نشانات خود ہی مٹ جائیں گے ۔"

احمد نے پھر کہا ۔" مَیں یہ اونٹ اور گھوڑا بھی بیچ ڈالنا چاہتا ہوں ۔ ان کی پہچان سے بھی میرے پکڑے جانے کا خطرہ ہے ۔"

زیوس نے فوراً کہا ۔" مَیں صبح سویرے ہی گھوڑے اور اونٹ کو قرطاجنہ شہر لے جاؤں گا اور انہیں بیچ آؤں گا ۔ اس کے علاوہ مَیں قرطاجنہ کے لشکر کی آمد اور اس کے پڑاؤ کے متعلق بھی معلومات فراہم کر کے آؤں گا ۔"

ارتمیس اب تک ان تینوں کی باتیں خاموشی سے سُن رہی تھی ۔ شاید اس نے بھی اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا ۔ اسی لیے اس نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ۔" اغوا ہونے سے اب تک کیا آپ کی ملاقات اپنے ماں باپ سے نہیں ہوئی ؟"

احمد کی گردن جُھک گئی ۔ ارتمیس ، زیوس اور ہرمس اسے غور ، ہمدردی اور پیار سے دیکھ رہے تھے ۔ احمد چند ثانیوں تک گردن جھکائے خاموش رہا پھر اس نے ارتمیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔" مَیں ابھی تک ان سے نہیں مِل سکا ہوں ۔ نہ جانے وہ کہاں ہیں خبر نہیں کس حال میں ہوں گے ۔ اَب تو میرے دونوں چھوٹے بھائی بھی جوان ہو چکے ہوں گے ۔ کاش مَیں انہیں مِل سکتا ۔ کاش مَیں اپنے ماں باپ کی خدمت کر سکتا ۔" احمد غمزدہ ہو گیا اور اس کی گردن دوبارہ جُھک گئی تھی ۔

ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے مجروح اور شکستہ سی آواز میں ارتمیس نے پھر پوچھا ۔" اگر آپ کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے تو پھر یہاں سے نکلنے کے بعد آپ کہاں جائیں گے ؟"

احمد نے اس بار اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا ۔" مجھے اب کسی ٹھکانے کی ضرورت نہیں ۔ یہاں سے نِکلنے کے بعد مَیں سیدھا خلیفہ عبدالملک بن مروان کا رُخ کروں گا ۔ اُمید ہے اسے افریقہ پر لشکر کشی پر آمادہ کر کے مَیں یہاں مسلمانوں کا وقار بحال کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا ۔ ابھی میرے پاس اِتنا وقت ہی نہیں کہ مَیں اپنا ذاتی ٹھکانہ اور گھر بنانے کے متعلق سوچوں " ۔

زیوس نے اپنی جگہ پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ آؤ نماز پڑھ لیں۔ پھر احمد کو آرام کرنے دیں۔" سب نے اُٹھ کر فجر کی نماز ادا کی۔ ارتمیس نے آتش دان کے پاس ہی چٹائی پہ توشک ڈال کر احمد کے لیے بستر لگا دیا تھا تھوڑی دیر بعد وہ اس گرم، آرام دہ اور نرم بستر میں گہری نیند سو رہا تھا۔

احمد کو کچھ خبر نہ تھی وہ کب تک سویا رہا ہے۔ وہ اس وقت اُٹھا جب کوئی اس کا پاؤں پکڑ کر ہلا رہا تھا۔ آنکھیں ملتا ہوا جب وہ اُٹھا تو اس نے دیکھا کہ حسین و نوخیز ارتمیس اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اور اسی نے اس کا پاؤں پکڑ کر ہلایا تھا۔

احمد نے بستر سے نکلتے ہوئے کہا۔ "کیا وقت ہوا ہو گا۔ میں کتنی دیر سویا ہوں"۔
ارتمیس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ بالکل یوں جیسے برسات کی رات میں کسی کوئل کی آواز گونجی ہو۔ اس لمحے اس کے عارض پر اس کی جوانی کا نکھار کسی گلِ احمر جیسا ہو گیا تھا

احمد نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "ارتمیس! ارتمیس! تم ہنس کیوں رہی ہو"۔
ارتمیس نے اپنی امرت برساتی آواز میں کہا۔ "آپ بدحواس کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ کیوں پوچھتے ہیں، میں کتنی دیر سویا ہوں، اس وقت تو شام ہو رہی ہے۔ بابا قرطاجنہ سے لوٹ آئے ہیں۔ ہرمس بھی دن بھر کوہستانوں میں اپنا ریوڑ چرا کر واپس آ چکا ہے"۔

احمد بستر سے نکلتا ہوا بولا۔ "میں نے کچھ زیادہ ہی نیند کر لی ہے۔ دراصل زندگی میں پہلی بار ایسے نرم بستر میں سکون سے نیند کرنے کا موقع ملا ہے"۔
ارتمیس کچھ کہنا چاہتی تھی کہ زیوس اور ہرمس اندر داخل ہوئے۔ زیوس نے کہا۔ "احمد! احمد! میں تمہارا گھوڑا اور اُونٹ بیچ آیا ہوں۔ اچھی رقم مل گئی ہے"۔

احمد نے سر پہ عمامہ درست کرتے ہوئے کہا۔ "رقم اپنے پاس ہی رکھیں۔ جس وقت مجھے ضرورت ہو گی آپ سے مانگ لوں گا"۔
زیوس نے پھر کہا۔ "قرطاجنہ کا لشکر لوٹ آیا ہے۔ میں اسے خود دیکھ کر آیا ہوں۔ اس نے بندرگاہ کے قریب کھلے میدان میں پڑاؤ کر رکھا ہے۔ ہاں سنو! مسلمان

جنگی قیدیوں کو بندرگاہ کے قریب اس کھلے میدان کی عمارتوں میں منتقل کر دیا گیا ہے جہاں لشکر میں شامل ہونے والے نئے سپاہیوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ شام ہو گئی ہے آؤ مغرب کی نماز پڑھ لیں پھر کوئی لائحہ عمل مرتب کریں گے"۔

سب نے وضو کیا پھر وہ اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے مغرب کی نماز ادا کر رہے تھے۔





احمد سمندر کے کنارے مچھیروں کی خیمہ نما جھونپڑیوں کی طرف سے بندرگاہ کے کھلے میدانوں کی طرف آیا تھا۔ اس کے پیچھے حدِ نگاہ تک رات کے سناٹے میں سمندری لہریں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں اور سامنے قرطاجنہ شہر پھیلا ہوا تھا۔

سمندری ہوائیں بے ارادہ جنوب کی طرف اُڑی جا رہی تھیں۔ وقت کا نامہربان آنچل خوب پھیل گیا تھا اور شام رات میں ڈھل کر گہری ہو گئی تھی۔ آسمان پر ٹمٹماتے ستارے اپنی تمناؤں کے جال بُنتے ہوئے اپنے قرب کے لمحات سے قریب تر ہونے کو بھاگ رہے تھے۔

احمد رومن سپاہیوں کا وہ لباس پہنے ہوئے تھا جو گھوڑوں کے ساتھ اس کے ہاتھ لگا تھا۔ اس لیے شہر میں گھومتے ہوئے کوئی اس پر شک نہ کر رہا تھا۔ تیز تیز چلتا ہوا وہ اس میدان میں داخل ہوا جس میں لشکر کے سپاہی تربیت حاصل کرتے تھے۔ اس میدان کے ایک طرف رہائشی عمارتیں تھیں جب کہ تین اطراف میں میدان خالی اور

کھُلا پڑا تھا۔

میدان کے کنارے کنارے درختوں کے سائے میں چلتا ہوا احمد ایک عمارت کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ رہائشی عمارتوں میں شمعیں گل ہونا شروع ہو گئی تھیں اور روشن طاقچے افسردہ اور تاریک ہونے لگے تھے۔ رات کی تاریکی میں ہر سمت اجنبیت کا زہر پھیل رہا تھا۔ احمد جب اس عمارت کی سیڑھیوں کے پاس گیا تو کسی نے کڑک دار آواز میں پوچھا "کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

احمد نزدیک ہوتا ہوا بولا۔ "مجھے افسوس ہے میں نے تمہیں پریشان کیا۔ میں بے خیالی میں سیدھا چلا آیا، مجھے آواز دے کر آنا چاہیے تھا۔ بہرحال مطمئن رہو، میں مسلمان قیدیوں کے لیے اہم احکامات لے کر آیا ہوں۔"

اس پہریدار نے پھر کڑک کر پوچھا "کس کی طرف سے؟" جواب میں احمد نے اس نے اُس پر لمبی جست لی اور اسے اپنے نیچے دبوچ لیا تھا۔ اسے بے بس کرنے کے بعد احمد نے اپنا خنجر نکالا اور اسے اس کی گردن پر آہستہ آہستہ پھیرتے ہوئے پوچھا "بتاؤ مسلمان قیدی کس طرف ہیں۔ اگر تم نے جھوٹ کہا یا دھوکہ دیا تو یاد رکھو یہ خنجر میں تمہاری گردن پر چلا کر تمہیں مینڈھے کی طرح ذبح کر دوں گا۔"

سپاہی ہکلانے لگا۔ احمد نے غضب ناک ہو کر کہا "بولو ورنہ میں تمہاری گردن کاٹنے لگا ہوں"۔ کپکپاتی آواز میں اس سپاہی نے کہا "یہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد دائیں ہاتھ آخری کمرہ ان کا ہے۔ لیکن تم کون ہو، اور مجھ پر جبر کر کے کیوں تم مسلمان قیدیوں کے متعلق پوچھ رہے ہو؟"

احمد نے پہریدار کا گلا گھونٹ کر اسے ختم کر دیا اور اس کی لاش اُٹھا کر ایک تاریک کونے میں ڈال دی تھی اور اس کی تلوار چھین کر اپنے تیروں کے ترکش میں ڈال لی تھی۔

عمارت کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ اُوپر گیا اور دائیں طرف گھوم کر وہ لمبی راہداری میں آگے بڑھنے لگا تھا۔ راہداری میں اس وقت تین پہریدار ٹہل رہے تھے۔ احمد اندھیرے میں ایک جگہ بیٹھ گیا اپنے ترکش سے اس نے تیر نکالے پھر اس نے ... کمال تیزی سے تیر

مارے کہ ان تینوں کو اس نے ڈھیر کر کے رکھ دیا تھا۔

راہ داری میں کھٹکا ہونے کی وجہ سے ایک کمرے کے اندر سے چار پہریدار نکل آئے اور جب وہ اپنے مرنے والے ساتھیوں کی طرف بڑھے تو احمد نے اندھیرے کی اوٹ سے ان پر بھی تیروں کی تیز بوچھاڑ ماری اور وہ چاروں بھی زمین پر گر کر دم توڑ گئے تھے۔

احمد بھاگ کر آگے بڑھا اور اس کمرے میں جھانک کر دیکھا جس کے اندر سے وہ چاروں سپاہی نکلے تھے۔ اس نے دیکھا اس کمرے میں دس بارہ سپاہی اور لیٹے آرام کر رہے تھے احمد نے کھٹکا کیے بغیر اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ اب وہ آخری کمرے کی طرف بڑھا جسے باہر سے زنجیر لگی ہوئی تھی۔ احمد نے دروازہ کھولا اور جب وہ اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا سارے مسلمان قیدی جاگ رہے تھے اور اپنے ایک ساتھی کے گرد جمع تھے۔ شاید وہ بیمار تھا۔

ایک سپاہی احمد کو پہچان گیا اور خوشی و حیرت کے ملے جُلے جذبات میں اس نے پوچھا۔" اے امیر! آپ یہاں ؛ آپ تو تیس میل پیچھے صحرا کے اندر سے بھاگ گئے تھے۔ دشمن نے آپ کو بہت تلاش کیا لیکن ناکام لوٹ آئے"۔

وہ شاید احمد کے ہراول لشکر کا سپاہی تھا تبھی احمد کو اس انداز میں مخاطب کر رہا تھا۔ احمد نے کہا" میں تم سب کو چھوڑ کر اکیلا کیسے بھاگ سکتا تھا۔ میں نے پہریداروں کو قتل کر دیا ہے۔ آؤ یہاں سے بھاگ چلیں پھر ایسا موقع کبھی ہاتھ نہ لگے گا"۔

اسی سپاہی نے جواب میں کہا" اے امیر! ہمارا ایک ساتھی سخت بیمار ہے۔ یہ کیسے جا سکے گا"۔ احمد نے رازداری سے کہا" اس کو اٹھا لو اور میرے ساتھ آؤ"۔

دو جوان جب اپنے بیمار ساتھی کو اُٹھانے لگے تو احمد نے کہا۔ یہاں سے نکل بھاگنے سے قبل میری بات غور سے سنو! ہو سکتا ہے راستے میں ہماری کسی سے مڈبھیڑ ہو جائے اور ہم سب کو اِدھر اُدھر بکھر جانا پڑے لیکن سب میری ایک بات ذہن میں رکھو۔ بندرگاہ کے بائیں حصّے میں جہاں ماہی گیروں کی خیمہ نما جھونپڑیاں ختم ہوتی ہیں۔ وہاں سمندر کے کنارے ایک بوڑھا اپنی کشتی میں ہمارا منتظر ہے۔ اگر میں تم سے علیحدہ بھی ہو جاؤں تو یاد رکھو تم سب کو اس

بوڑھے کے پاس جانا ہے۔ وہ تم سب کو تین اونٹ مہیا کر دے گا۔ وہ میرا پُرانا جاننے والا ہے۔ شہر سے نکل کر تم سب سیدھے جنوب مشرق کے رُخ پر بھاگنا۔ قرطاجنہ سے دس میل جنوب میں پہاڑوں کے دامن میں تمہیں ایک بستی ملے گی۔ وہاں تم لوگ کسی محفوظ جگہ رُک جانا اور اپنے ایک ساتھی کو بھیجنا کہ وہ بستی کے ایک شخص زیوس کے گھر جائے۔ جو بھی وہاں جائے وہ میرے حوالے سے اسے پوری داستان سُنائے وہ تم سب کی حفاظت اور آرام کا بندوبست کر دے گا۔ اب آؤ چلیں"۔

دو جوانوں نے اپنے بیمار ساتھی کو اُٹھا لیا اور احمد کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر آئے۔ احمد کے کہنے پر انہوں نے مرنے والے سپاہیوں کے ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب وہ عمارت سے باہر نکلے تو اچانک دائیں طرف سے ایک اور پہریدار نکل آیا۔ شاید وہ عمارت کے اِرد گرد چکر لگا رہا تھا۔ اُنہیں دیکھتے ہی وہ شور کرنے لگا۔" مسلمان قیدی بھاگ گئے"۔" مسلمان قیدی بھاگ گئے"۔

اندر کمرے میں سوئے ہوئے پہریدار کھڑکی کے راستے باہر پھلانگنا شروع ہو گئے تھے۔ احمد نے فوراً تیر چلا پر چڑھایا اور تاک کر اس پہریدار کو مارا جس نے شور کیا تھا۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو سرگوشی اور سختی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا" تم سب اپنے بیمار ساتھی کو لے کر بندرگاہ کی طرف بھاگ جاؤ۔ جس طرح میں نے تمہیں کہا ہے اس کے مطابق عمل کرو۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔ وقت بہت کم ہے۔ پہریدار کھڑکی کے راستے کودنا شروع ہو گئے ہیں۔ میں جنوب کی طرف بھاگ کر ان سب کو اپنے پیچھے لگاتا ہوں۔ اس طرح تم سب کو حفاظت کے ساتھ بھاگنے کا موقع مِل جائے گا۔ تم میرے متعلق فکرمند نہ ہونا۔ میں تم سے آ ملوں گا۔ جاؤ اب دیر نہ کرو، بھاگ جاؤ"۔ احمد کے کہنے پر وہ اپنے بیمار ساتھی کو لے کر درختوں کے سایوں کی آڑ میں بندرگاہ کی طرف بھاگ گئے تھے۔

احمد شور کرتا ہوا جنوب کی طرف بھاگ نکلا۔ کمرے سے کھڑکی کے راستے کود کر باہر آنے والے سارے سپاہی اس کے تعاقب میں لگ گئے تھے۔ وہ تعداد میں دس بارہ کے قریب تھے۔ میدان کی حدود سے نکل کر احمد ایک مکان کی دیوار کے پیچھے اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔

اور جلدی جلدی کمان سنبھال کر اس نے تعاقب کرنے والوں پر چند تیر برسائے جن سے تعاقب کرنے والوں میں سے تین کی کھوپڑیاں چھد گئیں اور وہ زمین پر گر گئے ۔ احمد پھر جنوب کی طرف اندھا دھند بھاگ نکلا تھا ۔

اپنے تین ساتھیوں کے مرنے پر تعاقب کرنے والوں کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور وہ دُور دُور رہ کر پیچھا کرنے کی کوشش کرنے لگے تھے ۔ اب وہ شور بھی نہیں کر رہے تھے شاید اس خیال سے کہ جو شور کرے گا بھاگنے والے کا تیر اُسے ہی آ کر لگے گا ۔ لہٰذا وہ خاموش رہ کر اور اندھیرے کی آڑ میں تعاقب کرنے لگے تھے ۔

اب وہ شہر میں داخل ہو گئے ۔ اہلِ شہر سکون کی نیند سوئے ہوئے تھے جب کہ پہریداروں اور احمد کے درمیان زندگی اور موت کا کھیل جاری تھا ۔ احمد تیزی سے بھاگتا ہُوا جنوب کی طرف بڑھ رہا تھا ۔

بھاگتے بھاگتے احمد اس گلی کی طرف جا نکلا تھا جس میں ایمن کے ماموں کا گھر تھا ابھی وہ گلی میں داخل ہُوا ہی تھا کہ اسے اپنے سامنے سے دو پہریدار آتے دکھائی دیئے ۔ وہ شاید کسی مختصر راستے سے اِدھر نکل آئے تھے ۔ وہ اندھیرے کی آڑ لے کر اور مکانوں کی دیواروں سے چپک چپک کر آ رہے تھے ۔ شاید وہ سامنے کی طرف سے احمد کا راستہ روک کر اپنے تعاقب کرنے والے ساتھیوں کو موقع دینا چاہتے تھے کہ وہ پیچھے سے آ کر اس پر قابو پالیں ۔

احمد فوراً خود بھی اوٹ میں ہو گیا پھر وہ اپنے کندھے سے اپنی کمان اتار چکا تھا ۔ تاک کر یکے بعد دیگرے اس نے کئی تیر ان پر برسائے ۔ دونوں پہریدار جو دیوار سے چپکے ہوئے تھے تیروں سے چھد کر گلی میں گر گئے تھے اور ان کی چیخیں گلی میں بلند ہو کر ڈوب گئی تھیں ۔ احمد بھاگ کر آگے گیا لیکن فوراً ہی اس کے پاؤں رُک گئے ۔ اس نے دیکھا ایمن کے ماموں کے گھر میں روشنی ہو رہی تھی ۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا کہ اس غیر آباد مکان میں کون آ کر آباد ہو گیا ہے ۔

احمد آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دینا ہی چاہتا تھا کہ تعاقب کرنے والے اس گلی کی نکڑ پر نمودار ہوئے ۔ احمد نے بغل میں دبائی ہوئی اپنی ننگی تلوار تھام لی اور دروازے

کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا لیکن جلد ہی وہ چونک کر پیچھے ہٹ گیا اور اپنا دفاع کرنے کے لیے اس نے اپنی تلوار سونت لی تھی کیونکہ مکان کا دروازہ آہستہ آہستہ اندر کی طرف کھسکنا شروع ہو گیا تھا ۔ لگتا تھا کوئی دروازے کو بڑی آہستگی اور رازداری سے کھول رہا ہو ۔ پھر دروازہ کھلا اور اندھیرے میں کسی کی انتظار کی لذّت اور تغزل کے رچاؤ سے بھرپور پُر رازدارانہ آواز سنائی دی ۔ " اندر آ جائیے ، باہر خطرہ ہے " ۔

احمد کے سینے میں سنسناہٹ اور دل میں گدگداہٹ بکھر گئی تھی ۔ وہ آواز ایمن کی تھی ۔ ایمن جو اس کے ماضی کے طویل و تلخ لمحوں کی ساتھی اور یادوں کا ڈوبا ہُوا چاند تھی ایمن کی نشاط انگیز آواز نے اس کی دُنیا میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی ۔

پہریدار نزدیک آ رہے تھے لہٰذا احمد فوراً اندر چلا گیا اور ایمن نے کوئی کھٹکا کیے بغیر دروازہ بند کر دیا تھا ۔ پھر ایمن کسی آزاد اور جنگلی ہرنی کی طرح پھلانگتی اس روشن کمرے میں داخل ہوئی جس میں اس کی ماں عزیان بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی ۔ ایمن بھاگ کر اس سے لپٹ گئی اور کسی کوہی ندی کی طرح گنگناتے اور خوش ہوتے ہوئے اس نے کہا ۔ " وہ آ گئے ماں ! وہ آ گئے " ۔

عزیان کچھ کہنا چاہتی تھی کہ احمد کمرے میں داخل ہُوا ۔ وہ فوراً اُٹھی اور آگے بڑھ کر احمد کی پیشانی چُومتے ہوئے کہا " تم رات کے اس وقت یہاں کیا کر رہے تھے بیٹا اور کیا یہ سپاہی تمہارا پیچھا کر رہے تھے " ۔

احمد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا " ہاں ! یہ میرا ہی پیچھا کر رہے ہیں ۔ یہ ایک لمبی داستان ہے ۔ آپ بیٹھیں میں آپ سناتا ہوں " ۔

باہر گلی میں سپاہیوں کا شور بلند ہو رہا تھا ۔ عزیان باہر نکلتی ہوئی بولی ۔ " تم دونوں یہیں ٹھہرو میں ان سپاہیوں کو بھگا کر آتی ہوں " ۔ عزیان باہر آئی اور سیڑھیاں چڑھ کر اس نے دیوار کے اُوپر سے جھانکتے ہوئے گلی میں اپنے مرنے والے ساتھیوں کے پاس کھڑے پہریداروں کو مخاطب کر کے پوچھا ۔ " میرے بچو ! تم رات کے اس وقت کسے تلاش کر رہے تھے ۔ وہ کون تھا جس کا تم پیچھا کر رہے ہو اور جو تمہارے ان دو ساتھیوں کو ختم کر کے

آگے بھاگ گیا ہے"۔

ایک سپاہی نے چونک کر پوچھا۔" وہ کس سمت بھاگا ہے" عزیان نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" وہ سامنے مشرق کی طرف بھاگا ہے۔ میں ان مرنے والوں کی چیخیں سن کر باہر آئی تو وہ بھاگتا ہوا میری نگاہوں سے اندھیرے میں اوجھل ہو گیا تھا"۔ پہرے دار فوراً حرکت میں آئے۔ ان میں سے دو اپنے مرنے والے ساتھیوں کی لاشیں اٹھا کر لے گئے باقی بھاگتے ہوئے مشرق کی طرف بڑھ گئے تھے۔

عزیان دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ احمد اور امین آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ عزیان نے پرسکون آواز میں کہا۔" میں انہیں بھگا آئی ہوں۔ اب تم بتاؤ بیٹے! تم کہاں کہاں سے ہو کر یہاں آئے ہو اور کس جرم میں قرطاجنہ کے سپاہی تمہارا پیچھا کر رہے تھے"۔

جواب میں احمد ان کو سیلہ کے ہاں سے بھاگنے اور قرطاجنہ میں داخل ہونے کے درمیانی واقعات پوری تفصیل سے سنا رہا تھا۔ امین بچاری احمد کی داستان سن کر ایسی غمزدہ ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ کمرے میں چند ثانیوں تک خاموشی طاری رہی پھر احمد نے امین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔" اندھیرا ہونے کے باوجود تم نے کیسے مجھے پہچان کر دروازہ کھول دیا تھا"۔

امین نے کہا۔" ہم دونوں ماں بیٹی ابھی جاگ رہی تھیں کہ باہر گلی میں کھٹکا ہوا۔ میں بھاگ کر گئی اور چند سیڑھیاں چڑھ کر دیوار کے اوپر سے دیکھا۔ دو سپاہی اندھیرے کی آڑ میں ہماری دیوار کے ساتھ چپکے ہوئے مغرب کی طرف جا رہے تھے۔ وہ کسی کے خلاف ایک دوسرے سے سرگوشیاں بھی کر رہے تھے۔ اتنے میں سامنے کی طرف سے آپ آ گئے۔ اس وقت میں نے آپ کو نہ پہچانا تھا۔ آپ بھی اندھیرے میں ہو گئے اور ان دونوں پر تیر برسا کر ختم کر دیا تھا"۔

ذرا دم لے کر امین نے کہا۔" میں نے آپ کو اس وقت پہچانا جب آپ ان مرنے والے دونوں سپاہیوں کے پاس سے گزر کر مشرق کی طرف بھاگے تھے۔ مجھے آپ کا چہرہ نظر نہ آیا تھا۔ میں نے آپ کو آپ کے بھاگنے کے انداز سے پہچانا تھا۔ میں آپ کو آواز دے کر

بلانا چاہتی تھی لیکن مجھے ساتھ والی گلی میں سپاہیوں کے بھاگنے کی آوازیں سنائی دی تھیں لہذا میں خاموش رہی۔ ناچار میں دروازے کی طرف بھاگی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں دروازہ کھول کر آپ کے پیچھے بھاگوں گی اور آپ کو خاموشی سے پکڑ کر اندر لے آؤں گی لیکن دروازہ کھولتے ہوئے مجھے آپ روزن میں سے دروازے پر کھڑے دکھائی دیئے۔ لہذا میں مطمئن ہو گئی تھی"۔

احمد نے مسکرا کر کہا۔" آگے بھاگتے ہوئے میری نظر مکان پر پڑی، مکان میں روشنی ہو رہی تھی لہذا میں جستجو میں پڑ گیا کہ آپ لوگوں کے جانے کے بعد یہاں کون آ کر آباد ہو گیا ہے۔ مجھے امید نہ تھی آپ یہاں ہوں گی۔ میں تو اس ارادے کے ساتھ دروازے پر آیا تھا کہ دیکھوں اب اس مکان میں کون ہے۔ آپ لوگ کیسے یہاں آ گئے؟ عبدہ اور اس کی ماں کہاں ہیں؟"

احمد کے اس سوال پر عزیان کی گردن جھک گئی تھی۔ امین اس پھول کی طرح اداس ہو گئی تھی جو چپکے سے تنہائیوں میں کھل کر مرجھا گیا ہو۔ اس کے چہرے پر تازہ خیالات کا ہجوم تھا اور اس کی بکھری زلفیں۔ آہ جیسے فراق کی لمبی رات۔ احمد نے اس بار زور دے کر پوچھا۔

"امین! امین! کیا بات ہے، تم دونوں ماں بیٹی خاموش کیوں ہو؟"

امین نے چند لمحوں تک ایسے انداز میں احمد کی طرف دیکھا جیسے اس کی سوچوں کا جسم دکھنے لگا ہو اور اس کی طاقتِ سخن جواب دے گئی ہو۔ پھر وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ آپ کے وہاں سے بھاگنے کے بعد کسیلہ کو خبر ہو گئی کہ آپ نے آسترو اور نرلیس کو قتل کر دیا ہے۔ انہیں یہ بھی خبر ہو گئی کہ ہم نے بھاگ جانے میں آپ کی مدد کی ہے لہذا کسیلہ نے میرے بابا اور عبدہ کو قتل کرا دیا۔ عبدہ کی ماں بیٹے کا غم برداشت نہ کر سکی اور وہ بھی فوت ہو گئی۔ میں اور ماں اردیہ شہر سے نکل کر مصر میں اسکندریہ شہر کی طرف چلے گئے۔ وہاں میرا دوسرا ماموں ہے۔ اس کا نام قطام ہے۔ وہ مسلمان ہے اور وہ آہن گروں کے بازار میں رہتا ہے اور خود بھی آہن گری کا پیشہ کرتا ہے۔ جب ہم چند روز ہی وہاں رہے کہ قرطاجنہ سے وہ شخص اسکندریہ پہنچ گیا جو یہاں میرے ماموں کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہے۔ میرے دوسرے ماموں اور عبدہ کے باپ یہاں زرگر تھے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ طبرق ایک جنگ میں مارا گیا ہے اور اب قرطاجنہ میں ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں

لہٰذا ہم دونوں ماں بیٹی یہاں آ گئی ہیں ۔ جو آدمی یہاں ماموں کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہے ۔ وہ بھی ہمارا دُور کا رشتہ دار ہے ۔ وہ گو بُوڑھا ہے لیکن ہم دونوں ماں بیٹی کا بہت خیال رکھتا ہے ”۔

احمد نے اپنی گردن جُھکاتے ہوئے دُکھ سے کہا ۔ “مجھے افسوس ہے میری وجہ سے آپ لوگوں پر یہ ابتلا کا دَور شروع ہُوا ہے ۔ مَیں شرمندہ ہوں ”۔

عزیان نے گردن اُٹھائی اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے شفقت و مہربانی سے کہا ۔ “نہیں بیٹے ! تم شرمندہ مت ہو ۔ ہمیں تمہاری ذات پر فخر ہے ”۔

عزیان ذرا رُکی پھر اس نے کہا ۔ “احمد ! احمد ! اب تمہارا کیا لائحہ عمل ہے بیٹے ! اس کے بعد میں تمہارے ساتھ تفصیل سے گفتگو کرتی ہوں ”۔

احمد نے کہا “اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں سے نکل کر مَیں سیدھا دمشق جاؤں گا اور خلیفہ عبدالملک بن مروان سے افریقہ میں مسلمانوں کا وقار بحال کرنے کی التماس کروں گا ۔ مَیں وہاں سے کمک حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور اگر مَیں کامیاب رہا ، تو افریقہ کے اندر بربروں ، رومنوں ، فرانسیسیوں اور اندلسیوں کو مَیں ایک عبرت خیز درس دوں گا ”۔

عزیان نے پھر پوچھا ۔ “تم کب یہاں سے رخصت ہوگے ”۔ احمد نے دُکھ سے کہا “کاش حالات ایسے ہوتے کہ مَیں چند روز آپ کے پاس قیام کر سکتا ۔ اب پہریدار دُور نکل گئے ہوں گے مجھے ابھی یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیئے ”۔

احمد کے جانے کا سُن کر ایمن کی حالت عجیب ہو گئی تھی ۔ اس کے ہونٹوں پر احمد کے لیے عقیدتوں کے پھُول تھے لیکن اس کی آنکھوں میں عذابِ جان اور دُکھ کے گیت تھے ۔ وہ شوخ اور سحر فن لڑکی اس سمے ایسی اُداس ہو گئی تھی جیسے اس کی زندگی بھر کا ثمرِ ریاضت چھین لیا جا رہا ہو ۔ جہاں احمد کی آمد پر محبّت کی ترجمانی کے لیے اس کے ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم اور قربِ لالہ و گُل کی کیفیّت تھی ، وہاں اب کھوکھلا پن اور ایک تکلیف دہ احساس تھا ۔

عزیان نے پھر دُکھ کے سے احساس میں کہا ۔ “احمد ! احمد ! جس مقصد کا تم نے تہیہ کر لیا ہے وہ ایسا اہم ہے کہ مَیں تمہیں اس سے روک نہیں سکتی ۔ بیٹے ! مَیں جانتی ہوں تم اور ایمن ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو ۔ ہم دونوں ماں بیٹی دِن رات تمہاری سلامتی اور تم سے ملاقات کی دعائیں مانگتی رہی ہیں ۔ مَیں سمجھتی ہوں خدا کے حضور ہماری دعائیں مستجاب ہوئی ہیں ۔ بیٹے ! میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مَیں تم دونوں کی شادی کرا دوں گی اور تم دونوں اس گھر میں ہمیشہ میرے سامنے رہو گے لیکن تمہارا مقصد ارفع اور تمہاری سوچیں مقدّس ہیں اس لیے ہم دونوں ماں بیٹی تمہاری راہ نہ روکیں گی ۔ اس کے باوجود مَیں کہوں گی ایمن تمہاری ہے ۔ میرے پاس یہ تمہاری امانت ہے ۔ جب چاہو لے جاؤ ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ”۔

شرم کے مارے ایمن کی گردن جُھک گئی تھی اور وہ احمد کے پیچھے ہو کر کھڑی ہو گئی تھی ۔ احمد نے بھی گردن جُھکاتے ہوئے کہا ۔ “ایمن کا ساتھ میرے لیے ایک سعادت ابدی ہوگا ۔ مَیں آپ کے اعتماد اور بھروسے کو دھوکہ نہ دوں گا ۔ کاش مَیں اپنے باپ کے پاس ہوتا تو وہ ایمن کو دیکھ کر خوش ہوتے اور میرے انتخاب کی داد دیتے لیکن آہ ! مَیں تو ایک ایسا مسافر ہوں جس کا کوئی گھر ، کوئی ٹھکانہ اور منزل نہیں ۔ مَیں آپ کے ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ مَیں بہت جلد لوٹوں گا اور ایمن کو آپ سے ہمیشہ کے لیے مانگ لوں گا ۔ اب مجھے اجازت دیجیئے مَیں رخصت ہوتا ہوں ۔ کاش مَیں کچھ دیر یہاں رُک سکتا ”۔

عزیان نے احمد کا ہاتھ تھام لیا ۔ “کھانا تو کھا کر جاؤ بیٹے ! اپنے عمامے کے نیچے اپنا آہنی خود درست کرتے ہوئے احمد نے کہا ۔ “مَیں کھانا کھا چکا ہوں ”۔

ایمن نے پہلی بار مخاطب کر کے پوچھا ۔ “آپ کو نقدی یا کسی اور شے کی ضرورت ہو تو بتائیے ”۔

احمد کمرے سے باہر نکلتا ہُوا بولا ۔ “فی الوقت مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں جب ہو گی مَیں خود مانگ لوں گا ”۔ ایمن اور عزیان بھی اس کے ساتھ باہر آئیں ۔

بیرونی دروازے پر آ کر ایمن نے ہلکے سے دروازہ کھولا اور احمد باہر نکل گیا ۔ وہ دونوں ماں بیٹی دروازے پر کھڑی رہیں ۔ احمد دیواروں کے سائے میں

ہوتا جب دُور چلا گیا اور ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ دونوں ماں بیٹی اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی تھیں۔

احمد دیواروں اور درختوں کے سایوں کی اوٹ میں بندرگاہ کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ایک خیمہ نما جھونپڑی کے پاس وہ رُک گیا اور اس کے چوبی دروازے پر اس نے ہلکی سی دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھے نے دروازہ کھولا اور احمد کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

یہ وہی بوڑھا تھا جس کی مدد سے ایک بار احمد نے ایمن، عزیان، عبدہ اور اس کی ماں کو قرطاجنہ سے نکالا تھا۔ احمد نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”میرے ساتھی؟“

بوڑھے نے اور قریب ہو کر کہا۔ ”وہ یہاں سے جا چکے ہیں اور اب تک قرطاجنہ سے کافی دُور نکل گئے ہوں گے“۔ احمد نے نقدی کی ایک تھیلی اُسے تھماتے ہوئے کہا۔ ”میرا گھوڑا لا دو۔“

بوڑھا باہر نکل کر اپنی جھونپڑی کی پچھلی طرف نکل گیا۔ دوبارہ جب وہ لوٹا، تو اس کے ساتھ سیاہ رنگ کا گھوڑا تھا جو تاریکی میں ایک دھندلا سا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ احمد نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ بوڑھے سے مصافحہ کیا پھر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا چکا تھا۔ پانچ میل تک وہ سمندر کے کنارے مغرب کی طرف بڑھتا رہا پھر وہ اپنے گھوڑے کو بائیں طرف موڑ کر ارتمیس کی بستی کی طرف سرپٹ دوڑا رہا تھا۔



کافی رات گئے احمد زیوس کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور زیوس سامنے کھڑا تھا۔ احمد کو دیکھتے ہی زیوس نے اطمینان بخش آواز میں کہا۔ ”تم کہاں رہ گئے تھے بیٹے! تمہارے ساتھی یہاں پہنچ چکے ہیں۔“
احمد جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ارتمیس بھاگتی ہوئی آئی۔
احمد کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر نکہت و فرحت کے سارے رنگ

بکھر گئے تھے اس نے چہکتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے اتنی دیر کیوں کر دی ہم تو آپ کے متعلق اس قدر فکرمند تھے۔ اگر آپ تھوڑی دیر تک اور نہ آتے تو میں آپ کے متعلق جاننے کے لیے بابا کو قرطاجنہ بھیجنے والی تھی“۔

احمد گھوڑے کی باگ تھامے اندر داخل ہوتا ہوا بولا۔ ”میرے پیچھے رہنے میں ہی مصلحت تھی۔ اس طرح میرے ساتھیوں کو شہر سے نکل بھاگنے کا موقع ملا ہے“۔

ارتمیس فوراً آگے بڑھی اور احمد سے گھوڑے کی باگ پکڑ لی پھر اس نے گھوڑے کی ایالوں سے بھری گردن پر تھپکی دیتے ہوئے پوچھا۔ ”اس سیاہ گھوڑے نے آپ کا ساتھ کیسا دیا ہے؟“ احمد نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ میرے اندازوں پر پورا اترا ہے۔ کم ہنہناتا ہے اور صحرا میں تیز بھاگتا ہے“۔

ارتمیس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ دو سال قبل میرے بابا نے مجھے لے کر دیا تھا اس وقت یہ چھوٹا سا بچھیرا تھا۔ میں نے خود اس کی پرورش کی۔ اسی پر بابا نے مجھے جنگی تربیت دی ہے۔ یہ بہت اچھا گھوڑا ہے اپنے مالک کا کہا مانتا ہے اور ضرورت کے وقت آندھی اور طوفان بن کر بھاگتا ہے اس کی ایک اور ادا مجھے پسند ہے۔ یہ اگر کھلا چھوڑ دیا جائے، تو اپنے مالک کے پیچھے پیچھے آتا ہے۔ ایک مصری تاجر ادھر آیا تھا۔ میرے بابا نے یہ مجھے اس تاجر سے خرید کر دیا تھا۔“

ارتمیس گھوڑے کی گردن تھپتھپاتی ہوئی اصطبل کی طرف لے گئی۔ زیوس نے گھر کا دروازہ بند کر دیا اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر ارتمیس کا انتظار کرنے لگے تھے۔

ارتمیس جب واپس لوٹی تو وہ تینوں اس کمرے میں آئے جس میں آتش دان روشن تھا۔ آگ کے پاس وہ تینوں ایک چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ان کے قریب ہی ایک چٹائی پر ہرمس گہری نیند سویا ہوا تھا۔ احمد نے زیوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھی کہاں ہیں؟“

زیوس نے آتش دان کے پاس سے ایک لکڑی اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ”وہ بہت دانشمند ہیں۔ ان میں سے ایک نے گھر کے دروازے پر دستک دی تھی باقی بستی سے باہر ہی بیٹھے رہے تھے۔ میں اُنہیں ساتھ لے کر کوہستانی غاروں کی طرف گیا تھا۔ تمہارے جانے کے بعد میں

نے اپنی بستی کے سردار سے بھی بات کی تھی۔ وہ تمہاری داستان سن کر بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ تم سے ملنا بھی چاہتا ہے۔ اس نے کچھ بستر، کھانے کا سامان اور پانچ گھوڑے بھی مہیا کیے ہیں۔ بستی کے چند اور لوگوں نے بھی گھوڑے، خوراک اور دوسرا سامان دیا ہے۔

بستی کے سردار نے میرے ساتھ چند آدمی بھی روانہ کیے تھے جنہوں نے غار کی صفائی کر کے وہاں بستر لگا دیئے تھے۔ میرا خیال ہے اب تک تمہارے ساتھی سکون کی گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ اب ان میں سے ہر ایک کے پاس اپنا اپنا گھوڑا ہے۔ سردار نے ان سب کے لیے ہتھیار بھی مہیا کر دیئے ہیں۔ ہاں ان میں سے ایک سخت بیمار تھا اور بخار سے جھلس رہا تھا بستی کے طبیب کو بھی ہم اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس نے اسے دیکھ کر دوا دی تھی۔ میرا خیال ہے وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔"

احمد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "میرا جی چاہتا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ابھی یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ ابھی تک قرطاجنہ کے حکمرانوں نے ہمارے تعاقب میں کسی کو نہ بھیجا ہو گا۔"

زیوس سے پہلے ہی ارتمیس نے بولتے ہوئے کہا "نہیں آپ اس وقت نہیں جا سکتے ایک تو سخت سردی ہے دوسرے آپ کے ساتھی اس وقت آرام کر رہے ہوں گے۔ تیسرے قرطاجنہ کے سپاہی ابھی تک اگر تلاش کرنے نہیں نکلے تو ایسا کرنے میں وہ تاخیر نہیں کریں گے بہتر ہے آپ چند روز ٹھہریں اس کے بعد حالات کو دیکھ کر یہاں سے کوچ کریں اور پھر آپ کو خود بھی آرام کی ضرورت ہے۔"

زیوس نے فوراً تائید کرتے ہوئے کہا "ارتمیس ٹھیک کہتی ہیں۔"

احمد نے ارتمیس کی طرف دیکھا اور کچھ کہنے کی بجائے وہ صرف مسکرا کر رہ گیا تھا ارتمیس کے ہونٹوں پر بھی گہری اور ستاروں کی طرح جھلمل کرتی مسکراہٹ پھیل گئی پھر ارتمیس اٹھی اور چٹائیوں پر اس نے بستر لگا دیئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد آتش دان کے پاس وہ تینوں گہری نیند سو رہے تھے۔

دوسرے روز ہرمس جب اپنے ریوڑ کو چرانے کوہستانوں کی طرف لے جانے لگا تو اپنے ساتھیوں سے ملنے احمد بھی اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ وہ ارتمیس کے اسی سیاہ گھوڑے پر سوار تھا جسے وہ رات اپنے ساتھ قرطاجنہ لے کر گیا تھا۔ پہاڑ کے اوپر آ کر ہرمس نے ایک غار کی نشاندہی کی اور احمد اس میں داخل ہو گیا۔

ہرمس ریوڑ کو چرانے کے علاوہ ارد گرد نگاہ بھی رکھنے لگا تھا۔ احمد کا گھوڑا ریوڑ کے اندر چرنے لگا تھا۔ احمد غار میں داخل ہوا۔ اندر اس کے آٹھ ساتھی فرش پر بچھے بستروں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب کہ ایک جو رات کے وقت بیمار تھا گہری نیند سویا ہوا تھا۔ احمد کو دیکھتے ہی سب خاموش ہو گئے اور تشکر و مہربانی کی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

احمد نے انہیں سلام کیا اور آگے بڑھ کر ایک بستر پر بیٹھ گیا پھر اس نے ان سے پوچھا "کیا تم نے کھانا کھا لیا ہے اور تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے"۔ ان میں سے ایک نے بڑی احسان مندی سے کہا "ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ہم سب آپ کے مشکور ہیں کہ آپ نے ہمارے لیے اس قدر اہتمام کیا ورنہ آپ اکیلے بھی دشمن کی قید سے نکل کر فرار ہو سکتے تھے۔"

احمد نے اس جوان کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا "ایسا مت کہو، یہ میرا فرض تھا۔ میں تم سب کو حالات کے جہنم میں چھوڑ کر کیسے بھاگ سکتا تھا"۔ سب ساتھی بڑی ہمدردی سے احمد کی طرف دیکھ رہے تھے۔

احمد نے سوئے ہوئے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ شاید وہی ہے، جو رات کو بیمار تھا۔ اب یہ کیسا ہے"۔ اسی ساتھی نے جواب دیا "رات اس کی حالت سخت خراب تھی لیکن ہمارے میزبان نے اس کے لیے جس طبیب کا انتظام کیا تھا اس نے رات اسے ایسی دوا دی کہ اس کا بخار فوراً اتر گیا۔ اب یہ ٹھیک ہے، گہری نیند سویا ہوا ہے۔ یہ بیچارہ بہت دکھی انسان ہے۔" احمد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "کیا دکھ ہے اسے"۔
اس نے ایک بار اپنے سوئے ہوئے ساتھی کی طرف دیکھا پھر احمد کو مخاطب کر کے

وہ کہہ رہا تھا۔" اس کے واقعات، حالات اور ساعات بڑے دردخیز ہیں۔ دشمن کی قید کے دوران اس نے ہمیں اپنی داستان سنائی تھی۔ یہ کہہ رہا تھا۔ جنگ سے پہلے اس کی بستی سے ایک اس کا جاننے والا لشکر میں شامل ہوا تھا اس نے اسے پیغام دیا تھا کہ اس کے گھر والے اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں کیونکہ اس کے بڑے بھائی کی شادی ہے۔ جو اس کی شمولیت کے بغیر نہ ہوگی۔ اس نے کہا تھا کہ بچپن میں اس کا ایک بڑا بھائی اس سے بچھڑ گیا تھا، جواب تک نہیں ملا اور اس بیٹے کی جدائی میں رو رو کر اس کے ماں باپ کی بینائی کم ہوگئی ہے۔ یہ کہہ رہا تھا جس لڑکی سے اس کے منجھلے بھائی کی شادی ہو رہی ہے وہ اس کی ماموں زاد بہن ہے جو بچپن میں اس کے سب سے بڑے بھائی کی منگیتر تھی۔

اس جوان نے ذرا رُک کر کہا۔ اس کے ماں باپ نے اپنے بڑے بیٹے کی واپسی کا بہت انتظار کیا۔ جب وہ نہ لوٹا تو انہوں نے اس لڑکی کی شادی اس کے منجھلے بھائی سے طے کر دی۔ لڑکی کی منگنی چونکہ اس وقت بڑے بھائی سے طے ہوئی تھی جس وقت اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ تھا لہٰذا وہ بڑی ہو کر اس کے منجھلے بھائی کو پسند کرنے لگی تھی اپنے منگیتر کے گُم ہو جانے اور اس کے واپس نہ لوٹنے پر وہ بچاری ایسا کرنے میں حق بجانب تھی۔

یہ کہہ رہا تھا پہلے اس کا باپ زہیر بن قیس کے لشکر میں شامل تھا وہ اس نیت سے لشکر میں شامل ہوا تھا کہ جہاد کا فرض ادا کرنے کے علاوہ وہ اپنے گمشدہ بیٹے کو بھی تلاش کرے گا لیکن اس کی بینائی کم ہوگئی اور اپنے باپ کی جگہ اب یہ لشکر میں شامل ہوا تھا۔"

احمد نے چونک کر پوچھا۔" اس کا نام کیا ہے؟"

اس ساتھی نے کہا۔" اس کا نام خصیب ہے۔ خصیب بن حشتم اور اس کا بڑا بھائی جس کی شادی ہو رہی ہے اس کا نام اس نے شیبان بن حشتم بتایا تھا۔"

احمد کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اس نے بوکھلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔" کیا اس نے اپنے اس بھائی کا نام بھی بتایا تھا جو گم ہوگیا تھا" ——— " ہاں اس کا نام اس نے احمد بتایا تھا۔"

احمد کا جی چاہا کہ فوراً آگے بڑھ کر اپنے چھوٹے بھائی سے لپٹ جائے۔ خصیب جسے وہ کبھی اپنے کندھوں پر اُٹھا کر کھلایا کرتا تھا اس کے سامنے معصومیّت کی گہری نیند سویا ہوا تھا احمد اُٹھ کر آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ اس کے ضمیر اور اس کی سوچوں نے اس کے ذہن پر ایک بھرپور ضرب لگائی۔

" دُور رہو۔ اپنے بھائی پر اپنا آپ ظاہر نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو شیبان اور طرب کی شادی رُک جائے گی جب کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ تمہارے گمنام رہنے میں ہی تمہاری اور دوسروں کی بہتری ہے۔"

احمد کا جگر اس موقع پر لہولہو ہوگیا تھا۔ وہ بُجھ گیا تھا، بے نور شمع کی مانند ——— بکھر گیا تھا چُور چُور آئینے کی طرح۔ اس کے چہرے کا رنگ خاک ہوگیا تھا اور آنکھ میں دُکھ کی دُھول اور شام کی سی پرچھائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

چند لمحوں تک وہ پُرانی یادوں کی چھاؤں میں جلتا ہوا، ٹوٹی ہوئی دہلیز کی طرح اداس اور ملول رہا۔ اس کی حالت کارواں سے بچھڑ کر نگر نگر بھٹکنے والے اس برہنہ پا مسافر کی سی تھی جو منزل سامنے ہونے کے باوجود اس تک نہ پہنچ سکتا ہو۔ بچارے کا دل تک سُلگ اُٹھا تھا لیکن جلد ہی اس نے اپنی اس کیفیّت پر قابو پا لیا تھا کیونکہ خصیب نیند سے بیدار ہو کر اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ احمد نے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔" تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے غور سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" میرا نام خصیب بن حشتم ہے۔" ایک ساتھی نے خصیب کو مخاطب کر کے کہا۔

" یہ وہی ہیں جنہوں نے ہمیں دشمن کی قید سے نجات دلائی ہے۔ رات تم بیمار تھے اس لیے ہم تمہیں تفصیل نہ بتا سکے۔ ان کا نام سمرون ہے اور یہ ہمارے ہراول لشکر کے سالار تھے۔"

خصیب نے ہاتھ آگے بڑھا کر احمد سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔" آپ کی ہمت قابلِ تعریف، آپ کی شجاعت قابلِ تقلید ہے۔ آپ نے تنہا ہمیں اس جہنم سے نکالا جہاں سے ہمارا فرار اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔"

احمد نے دل کی گہرائی سے کہا "آپ لوگوں سے میرا ایک رشتہ ہے۔ اس کام میں اگر میری جان بھی چلی جاتی تو واللہ میں کبھی دریغ اور تاسف نہ کرتا۔"

خصیب کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ احمد چونک کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ غار سے باہر کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس نے غار سے باہر بھاگتے ہوئے کہا "خدا کی قسم میں اس غار سے باہر خطرے کی بو پاتا ہوں۔" اس کے سب ساتھی بھی اپنے ہتھیار سنبھال کر اپنے بستروں سے اٹھ گئے تھے۔

احمد جب غار سے باہر آیا تو اس نے دیکھا بستی کی طرف سے دس بارہ سوار کوہستان کی طرف اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے اور دھول اڑاتے آ رہے تھے۔ احمد ایک پتھر کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ساتھی بھی اپنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر احمد کے آس پاس پتھروں کی اوٹ میں بیٹھ گئے تھے۔ ہرمس بھی چونکنا ہو کر آنے والے ان سواروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جب وہ کوہستانوں کے اوپر چڑھ کر اس طرف آنے لگے جہاں ہرمس بکریاں چرا رہا تھا تو ہرمس بھاگ کر اپنے قریب چرتے احمد کے سیاہ گھوڑے کی طرف گیا۔ وہ اس کی زین اتارنے لگا تھا کہ احمد نے پتھر کے پیچھے سے اسے آواز دی "ہرمس! ہرمس! گھوڑے کی زین مت اتارو۔ اسے اسی طرح چرنے دو۔ تم بالکل خاموش اور بے پرواہ ہو کر اپنی جگہ کھڑے رہو۔ ان سواروں کو اوپر آنے دو۔ پہلے دیکھتے ہیں یہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ اگر یہ ہماری تلاش میں ہوئے تو اندیشہ نہ کرو یہ بچ کر نہ جا سکیں گے۔"

ہرمس خاموش رہا اور پرسکون ہو کر وہ ایک پتھر پہ بیٹھ گیا۔ وہ گھوڑ سوار جو پوری طرح مسلح تھے اور تعداد میں دس تھے وہ سیدھے ہرمس کے پاس آئے اور ان میں سے ایک سوار نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کیا تم نے کچھ ایسے لوگ ادھر سے بھاگتے دیکھے ہیں جو اپنے حلیے اور لباس سے قیدی لگتے ہوں اور اپنی جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کر رہے ہوں؟"

ہرمس کھڑا ہو گیا اور اپنے گلے میں لٹکتی صلیب کو چھوتے کے بعد اس نے اپنی

چھاتی پہ صلیب کا نشان بنایا اور پرخلوص لہجے میں کہا "میں نے ایسے لوگ نہیں دیکھے، اگر دیکھتا تو آپ کو ضرور اطلاع کر دیتا۔"

ہرمس سے گفتگو کرنے والا چند لمحوں تک ہرمس کو دیکھتا رہا پھر وہ اپنے گھوڑے کو واپس موڑنا ہی چاہتا تھا کہ احمد کی طرف سے سنسناتا ہوا ایک تیر آیا اور اس کے دل کو چیرتا ہوا نکل گیا تھا اور وہ اپنے گھوڑے سے گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے دوسرے ساتھی اپنے گھوڑوں کو موڑ کر وہاں سے بھاگنا چاہتے تھے کہ احمد اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ ہرمس بھاگ کر ایک پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گیا تھا۔ سارے مسلح سپاہی تیروں کی تیز بوچھاڑ میں چھد کر ختم ہو گئے تھے۔

احمد اپنے ساتھیوں کے ساتھ اٹھ کر وہاں آیا جہاں ان مسلح سپاہیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہرمس بھی پتھر کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور احمد نے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا احمد نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آؤ ان کے لباس اتار کر خود پہن لیں۔ اور ان کی لاشوں کو یہاں دفن کر دیں۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ ہم چند یوم تک اس غار کے اندر قیام کریں گے اور جب ہماری تلاش کا سلسلہ مدھم پڑ گیا تو ہم یہاں سے بھاگ جائیں گے لیکن میرے غریب الوطن ساتھیو! میں اپنا فیصلہ بدلنے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ ہم ان سپاہیوں کے لباس میں انہی کے گھوڑوں پہ بیٹھ کر ابھی یہاں سے کوچ کر جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں قدرت ہماری مدد اور راہنمائی کر رہی ہے۔ ہمارے ہاتھوں مرنے والے یہ سپاہی یقیناً جنوبی حصے میں ہمیں تلاش کرنے پر مقرر ہوئے ہیں۔ ان کے پاس اپنے بستر بھی ہیں جو اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا ارادہ دور دور تک ہمیں تلاش کرنے کو تھا۔ میں ایک بار بستی میں جا کر اپنے محسن سے مل آتا ہوں تاکہ میں اسے اپنی اس فی الفور روانگی کی اطلاع کر سکوں۔ ساتھ ہی اس کا شکریہ بھی ادا کر دوں کہ اس نے اس قدر دقت ہماری آسائش اور آرام کی خاطر اٹھائی۔ اس کے بعد ہم یہاں سے جنوب کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ مرنے والے سپاہی چونکہ جنوبی حصے میں ہمیں تلاش کرنے پر مقرر ہوئے تھے۔ لہٰذا کسی دوسرے ایسے ہی گروہ سے ہماری مٹھ بھیڑ ہونے کی توقع نہیں جو ہماری تلاش

یں نکلے ہوں - آؤ! آؤ! میرے ساتھیو! ان کے لباس اُتار کر ان کی لاشوں کو یہا دفن کر کے اپنے کوچ کی تیاری کر لیں"۔

احمد کے کہنے پر اس کے ساتھی آناً فاناً حرکت میں آئے - ہرمس بھی ان کی م کرنے لگا تھا - انہوں نے اُن کے لباس اُتار لیے اور لاشوں کو ایک گڑھے میں ڈال مٹی اور پتھروں سے ڈھانپ دیا تھا -

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد احمد نے پھر اپنے ساتھیوں سے کہا - "تم اپنے محسن سے مِل کر ابھی آتا ہوں - میرے آنے تک تم اپنے لباس تبدیل کر لو - میں بھ ہی ایک رومن سپاہی کا لباس پہنے ہوئے ہوں"۔

اس کے ساتھی لباس اُٹھا کر اپنی غار کے اندر چلے گئے تھے - احمد اپنے اس گھوڑے پر سوار ہوا جو حسین ارتمیس نے اسے دے رکھا تھا - کوہستانوں سے اُتر کر گھوڑے کو بستی کی طرف سرپٹ دوڑا رہا تھا -

زیوس کے گھر داخل ہو کر احمد نے گھوڑے کو صحن کے اندر کھلا چھوڑ دیا جب وہ آگے بڑھنے لگا تو ارتمیس ایک کمرے سے بھاگتی ہوئی نکلی اور بدحواسی میں پوچھا "خیریت تو ہے؟ بستی میں تھوڑی دیر قبل کچھ سپاہی آئے تھے - وہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کے متعلق پوچھ رہے تھے پھر وہ جنوب کی طرف چلے گئے تھے۔ آپ کو انہوں نے دیکھا تو نہیں"۔

اتنی دیر تک زیوس بھی اندر سے نکل آیا تھا - اس نے بھی احمد کی طرف دیکھ ہوئے پوچھا - "احمد! احمد! خیریت تو ہے میرے بیٹے!"

احمد نے کہا "آپ دونوں باپ بیٹی فکر مند نہ ہوں جو سپاہی ہمیں تلاش کر ہوئے کچھ دیر قبل بستی میں داخل ہوئے تھے وہ سیدھے اُدھر گئے تھے جہاں ہرمس اپنا ر چرا رہا تھا - انہوں نے ہرمس سے ہمارا پوچھا لیکن اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا - جب وہ وہاں سے ہٹنے لگے تو ہم نے ان پر تیروں کی بوچھاڑ کر کے انہیں ختم کر دیا - ان لاشوں کو ہم نے ایک گہرے گڑھے میں ڈال کر دفن کر دیا اور اب میرے ساتھی ان

لباس پہن کر تیار کھڑے ہوں گے - میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ابھی اور اسی وقت یہاں سے کوچ کر رہا ہوں - یہاں سے بھاگ نکلنے کا اس سے بہتر موقع ہمیں کبھی نہ ملے گا"۔

ارتمیس، احمد کے رخصت ہونے کا سُن کر برگِ خزاں کی مانند اداس اور شبستان کی بجھی ہوئی شمع کی طرح افسردہ ہو گئی تھی - چند لمحوں تک وہ مجبور و نڈھال اور زخم خوردہ سی احمد کو دیکھتی رہی - اس کی حالت سے لگتا تھا جیسے اس کے لیے روانِ نبضِ دوراں رُک گئی ہو یا آسمان فی الفور گردش میں آئیں گے اور قیامت برپا کر دیں گے - پھر اس کی گردن جھک گئی اور اس کی دِل شکستگی کی غماز آواز سنائی دی بالکل یوں جیسے چاندنی رات میں کسی ویران اور اُجاڑ جنگل میں کسی قمری کی غمزدہ آواز فضاؤں میں بکھر گئی ہو -

"آپ نے اس قدر عجلت میں کوچ کرنے کا فیصلہ کیوں کر لیا - کیا چند روز اور یہاں قیام کرنے میں آپ کی سلامتی اور بہتری پنہاں نہیں ہے"۔

زیوس نے بھی بڑی بے کل آواز میں کہا - "بیٹے! تم کچھ روز اور رُک جاتے تو مجھے خوشی ہوتی - اگر تم کوچ کا فیصلہ کر ہی چکے ہو تو میں اسے بدل نہیں سکتا - میں جانتا ہوں تمہارا فیصلہ مناسب اور سُود مند ہو گا"۔

احمد نے کہا - "میں جا رہا ہوں - میں صرف آپ دونوں سے ملنے آیا تھا" پھر اس نے ارتمیس کو مخاطب کر کے کہا - "ارتمیس! ارتمیس! میں تمہارا انتہا کا شکر گزار ہوں تم نے جو میری خدمت کی ہے میں اُسے بھول نہ سکوں گا - میں تمہارا گھوڑا ہرمس کو دے جاؤں گا - وہ اس کو ریوڑ کے ساتھ واپس لے آئے گا"۔

ارتمیس نے اپنی گردن سیدھی کی اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے ہرے بید کی شاخ کی طرح لرزتے، کانپتے ہوئے کہا "یہ گھوڑا میں نے آپ کو دیا - میرے لیے یہ ایک ابدی سعادت ہو گی کہ میں نے اپنا گھوڑا قوم کے ایک ایسے مجاہد کو دیا جو اپنی قوم کی سطوت کا امین اور اپنی ملت کی عزت و وقار کا پاسبان ہے - کاش! میں اس سے بھی بڑھ کر آپ کی خدمت کر سکتی"۔

ارتمیس جب خاموش ہوئی تو زیوس نے کہا۔ "بیٹے! اگر تم کوچ کا فیصلہ کر ہی چکے ہو تو چلو میں کوہستانوں تک تمہیں رخصت کرنے جاؤں گا۔"

ارتمیس نے فوراً بولتے ہوئے کہا۔ "بابا! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔" زیوس نے پیار سے کہا۔ "چلو بیٹی! میں تمہیں کیوں روکوں گا۔" ارتمیس نے بھاگ کر کمروں کے دروازے بند کیے پھر وہ دونوں باپ بیٹی احمد کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئے تھے۔

تینوں ایک ہی گھوڑے پر سوار ہو گئے تھے۔ آگے احمد اس کے پیچھے زیوس اور اپنے باپ کے پیچھے ارتمیس بیٹھ گئی تھی۔ سیاہ رنگ کا وہ طویل، قدآور، توانا اور سرکش گھوڑا جب ہنہناتا ہوا کوہستانوں کے اوپر اس جگہ آیا جہاں ہرمس اپنا ریوڑ چرا رہا تھا تو احمد نے گھوڑے کو روک لیا۔ ہرمس بھاگ کر آگے بڑھا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ احمد ایک جست لگا کر نیچے اُترا پہلے سہارا دے کر اس نے ارتمیس کو نیچے اُتارا پھر وہ زیوس کو بھی گھوڑے سے اُتار چکا تھا۔ مرنے والے سپاہیوں کے گھوڑے اسی طرح ریوڑ کے اندر چر رہے تھے۔

زیوس چند لمحوں تک بڑی ہمدردی اور غور سے احمد کو دیکھتا رہا پھر اس نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "احمد! احمد! بیٹے! وقت کی اس ہاؤ ہو میں آشوب کے اس ہجومِ بیکراں اور شب و روز کے اس ہنگامے میں کیا میں اُمید رکھوں کہ ہم پھر بھی آپس میں کبھی مِل سکیں گے۔ بیٹے! گو تمہارا قیام میرے گھر میں نہایت مختصر رہا ہے پھر بھی میں یہی سمجھ رہا ہوں گویا ایک عرصے سے تم میرے گھر کے ایک فرد چلے آ رہے ہو۔ بیٹے! دریا کے بے میل کناروں کی طرح ہمیں بھول نہ جانا۔ خدائے قادر و قدوس کی قسم! میں رات کو شمع کی لَو میں اور دِن کو اپنے قیام و سجود میں تمہاری واپسی کی دُعا کرتا رہوں گا۔ تم کب لوٹو گے بیٹے!"

احمد نے الم گزیدہ سی آواز میں کہا "مجھے ابھی تک اپنی ذات کے متعلق اس قدر خبر نہیں کہ میں کون ہوں اور کِس دیار سے ہوں۔ دُشمن کے ہاتھوں شکست اور ہزیمت اُٹھانے کے بعد آپ جب کہ اس دُور افتادہ دیار میں کوئی میرا انیس و ہمدم کوئی محرم و آشنا نہیں ہے مجھے اپنی تلاش اور ریاضت میں سختی پیدا کرنا ہو گی تاکہ تلخی اور مایوسی کی ان فضاؤں میں میں یہاں ان اجنبی دلیسوں میں اپنی قوم کی سطوت اور اس کا عروج بحال کر سکوں۔ اس

وقت میری حالت ایسی سیّاحِ جہاں گرد جیسی ہے جس کی جھولی میں نہ ستارے نہ قمر نہ کہکشاں ہو۔ اس کے باوجود میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک روز ایسا ضرور آئے گا کہ میں آپ سے مِلتے ہوئے اپنے آپ پر فخر محسوس کر رہا ہوں گا۔

اس وقت میری گردن جھکی ہوئی نہ ہو گی۔ میں مجبور و مایوس نہ ہوں گا اور میری حالت ایسی نہ ہو گی جیسی اب ہے کہ میں چوری چھپے یہاں سے فرار ہونے کا موقع تلاش کر رہا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک روز میں اَن دیکھے اِن دیاروں کے سفر میں آپ کے لیے اُمیدِ سحر اور فتح و نوید کا غیر مبہم اشارہ بن کر لوٹوں گا۔ گو اس وقت ہم پر تاریک شب کی حالت طاری ہے لیکن ہر تاریک رات کی سحر بھی ہوتی ہے۔"

حسین ارتمیس خاموش کھڑی احمد اور اپنے باپ کی گفتگو سُن رہی تھی۔ گل تر بھی خوشرو وہ لڑکی اس سمے بجھی آگ کی طرح دھواں دھواں اور جلی ہوئی ویران بستیوں کی طرح راکھ راکھ ہو گئی تھی۔ وہ گردن جھکائے خاموش کھڑی تھی جیسے اس میں طاقتِ متحمل نہ ہو تابِ گفتگو نہ ہو۔ لگتا تھا وہ یونانی دیویوں جیسی حسین و پُرکشش لڑکی خوابوں کی گھٹاؤں اور اپنے حال قلبِ حزیں میں کھو گئی ہو۔

وہ ساکن کھڑی احمد کی باتیں سنتی رہی اور اس کے سراپے میں سنسنی اور اس کی آنکھوں میں جُدائی کی آگ اور رات کو جاگتے رہنے کی سی جلن ابھرتی ڈوبتی رہی۔ وہ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں طلسماتی کشش رکھنے والی پُرکشش یونانی لڑکی اس وقت چونکی جب احمد اس کے باپ زیوس سے کہہ رہا تھا۔ "مجھے اب اجازت دیجیے، میں رخصت ہوتا ہوں"۔

ارتمیس چونک کر احمد کی طرف دیکھنے لگی تھی قبل اس کے زیوس احمد کی بات کا جواب دیتا احمد نے گھوڑے کی باگ پکڑ کر کھڑے ہرمس کو مخاطب کر کے کہا۔ "ہرمس! ہرمس! میرے بھائی! بھاگ کر جاؤ اور میرے ساتھیوں سے کہو وہ باہر آ کر مرنے والے سپاہیوں کے گھوڑوں پر سوار ہو جائیں تاکہ ہم کوچ کر سکیں۔"

ہرمس بھاگتا ہوا چلا گیا۔ احمد نے پھر زیوس سے کہا "میں اس تعاون کا مشکور

ہوں جو آپ نے ہمارے ساتھ کیا۔ ہمارے کوچ کے بعد آپ غار کے اندر سے بستر اُٹھوا لیجئے گا۔ جن لوگوں نے ہمارے لیے خوراک اور گھوڑے مہیّا کیے تھے ان کا بھی شکریہ ادا کیجئے گا اور انہیں اُن کے گھوڑے واپس کر دیں کیونکہ ہم مرنے والے سپاہیوں کے گھوڑوں پہ بیٹھ کر کوچ کریں گے۔ وہ گھوڑے تعداد میں دس ہیں جب کہ میرے ساتھیوں کی تعداد نو ہے۔ فالتو گھوڑا بھی ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے تاکہ ہمارے بعد وہ یہاں کوئی مسئلہ اور تکلیف وہ حادثہ کھڑا نہ کر دے۔"

زیوس بیچارہ خاموش رہا۔ ہرمس بھاگتا ہوا واپس لوٹ آیا تھا اور احمد کے ساتھی غار سے نکل نکل کر گھوڑوں پر سوار ہونے لگے تھے۔ احمد نے ایک بھرپور نگاہ ارتمیس پہ ڈالی۔ زیوس اور ہرمس سے اس نے مصافحہ کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر اپنے ساتھیوں میں شامل ہو گیا تھا۔ وہاں جا کر اس نے فالتو گھوڑے کو بھی اپنے گھوڑے کے ساتھ باندھ لیا تھا پھر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنوب کی طرف کوچ کر گیا تھا۔

ارتمیس، زیوس اور ہرمس وہاں کھڑے انہیں دور ہوتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وہ جنوب کے کوہستانوں کے اس پار ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو ارتمیس کی گردن جھک گئی اور وہ اپنے باپ کا ہاتھ تھامے پہاڑ سے اُتر کر بستی کی طرف جا رہی تھی۔

کوہستانوں کے اُوپر ہرمس اُداس کھڑا تھا اور وہ کبھی کبھی اس طرف دیکھ لیتا تھا جس طرف احمد اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ ہرمس کا ریوڑ اسی طرح اس کوہستان کے اُوپر چر رہا تھا۔ اس ریوڑ میں وہ گھوڑے بھی شامل تھے جو بستی والوں نے احمد اور اس کے ساتھیوں کو مہیّا کیے تھے۔





احمد اور اس کے ساتھی جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے بروج شہر تک چلے گئے تھے۔ فالتو گھوڑا راستے میں انہوں نے بیچ ڈالا۔ صحرا کے اندر یہ ایک لمبا چکر تھا جو انہوں نے کاٹا تھا۔ چونکہ وہ رومن سپاہیوں کا لباس پہنے ہوئے تھے لہٰذا کسی نے ان سے کوئی باز پُرس اور روک رکاوٹ نہ کی تھی۔

بروج شہر سے باہر ہی باہر انہوں نے اپنا رُخ مشرق کی طرف کر لیا اور راستے میں بہت کم قیام کرتے ہوئے وہ برق رفتاری سے آگے بڑھتے رہے حتّٰی کہ وہ برقہ شہر کے قریب آنکلے۔ یہاں آکر انہوں نے اپنا لباس تبدیل کر لیا۔ یہاں کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ برقہ شہر مستقلاً اسلامی قلمرو میں شامل تھا اور مصر کا والی اس کا نظم و نسق سنبھالتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں مسلمانوں کی آبادی بھی زیادہ تھی۔

برقہ شہر سے باہر جب وہ اپنے لباس تبدیل کر چکے تو ایک ساتھی نے احمد کو مخاطب کر کے پوچھا۔" اے امیر! اب آپ کا کیا لائحہ عمل ہے۔ ہم میں سے خصیب

کے سوا سب برقہ شہر میں مستقل آباد ہیں ۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں ۔ چند روز اپنے گھروں میں قیام کریں پھر کسی نئی جدوجہد میں شامل ہوں ۔ آپ دونوں بھی چند روز یہاں برقہ میں ہمارے ہاں قیام کریں پھر کسی نئی جدوجہد میں شامل ہوں ۔

احمد نے اپنے گھوڑے کی گردن تھپتھپاتے ہوئے کہا ۔ "میں راستے میں کہیں رکوں گا نہیں ۔ میری منزل دمشق ہے ۔ میں وہاں سے کمک حاصل کر کے پھر انہی راہوں کی طرف لوٹوں گا اور اپنی شکست کا داغ دھوؤں گا"۔

اس ساتھی نے کہا ۔ "تو پھر ہم یہیں رک کر آپ کا انتظار کریں گے ۔ جب آپ کمک لے کر یہاں سے گزریں گے تو ہم بھی اس میں شامل ہو جائیں گے"۔

ان سب ساتھیوں نے باری باری احمد اور خصیب سے مصافحہ کیا اور برقہ شہر کی طرف چلے گئے ۔ احمد تھوڑی دور تک انہیں دیکھتا رہا پھر اپنے چھوٹے بھائی خصیب کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کمال اجنبیت میں پوچھا ۔ "اے میرے دوست! تمہاری منزل کیا ہے؟"

خصیب نے اپنے گھوڑے کی باگ اپنے ہاتھوں کے گرد لپیٹتے اور کھولتے ہوئے کہا ۔ "میں ہر حال میں آپ کا ساتھ دوں گا ۔ میری منزل وہی ہے جو آپ کی ہے"۔

احمد نے پھر پوچھا ۔ "کیا تم اپنے گھر نہ جاؤ گے ۔ بیماری کے بعد غار میں جب تم گہری نیند سوئے ہوئے تھے تو ایک ساتھی نے مجھے تمہارے متعلق تفصیل سے بتایا تھا ۔ کیا تم اپنے بڑے بھائی کی شادی میں شرکت نہ کرو گے جب کہ تمہارے گھر والے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے؟"

خصیب نے غور سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ "میں اپنے بھائی کی شادی میں ضرور شرکت کروں لیکن آپ بھی میرے ساتھ میرے گھر چلیں گے ۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں میں زیادہ دن آپ کو وہاں نہ روکوں گا ۔ بھائی کی شادی سے فارغ ہو کر میں آپ کے ساتھ دمشق کی طرف روانہ ہو جاؤں گا"۔

احمد خاموش رہ کر کچھ سوچتا رہا ۔ خصیب نے بڑی ہمدردی سے کہا ۔ "اے امیر! میں نہیں جانتا آپ کا تعلق کس سرزمین سے ہے ۔ میں نے صرف لشکر میں شامل ہو کر سنا تھا کہ آپ کا نام سمرون ہے ۔ اور آپ ہراول لشکر کے سالار ہیں ۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ کا تعلق کس خطۂ ارض سے ہے ۔ اور کیا آپ اپنے احباب سے ملنے اپنے گھر نہ جائیں گے؟" احمد نے اپنی گردن جھکاتے ہوئے دکھ سے کہا ۔

"میرا کوئی نام و عنوان نہیں، کوئی گھر ٹھکانہ نہیں ۔ اسلامی لشکر میں شامل ہونے سے قبل میں افریقہ میں بربروں کے بادشاہ کسیلہ کے پاس غلام تھا ۔ میرا تعلق جنوبی مصر سے ہے ۔ جہاں کچھ لوگوں نے میرے ماں باپ کو قتل کر کے مجھے غلام بنا کر بیچ ڈالا ۔ میرے ساتھ میرے دو بھائی بھی تھے ۔ ایک کا نام کروام اور دوسرے کا انولو تھا ۔ کروام کو انہوں نے قتل کر دیا جن کے ہاں ہم غلام تھے اور انولو میرے ساتھ اسلامی لشکر میں شامل ہو کر ایک جنگ میں شہید ہو گیا تھا ۔

یہ میرے چہرے پر جو تم داغے جانے کے نشان دیکھتے ہو یہ میرے غلامی دور کے ہیں جلا ہوا ایک حصہ ظاہر کرتا ہے کہ میں غلام ہوں جبکہ دوسرا جلا ہوا حصہ ظاہر کرتا ہے کہ میں سرکش ہوں ۔ اس لیے کہ میں نے ان لوگوں سے جھگڑا کیا تھا جنہوں نے مجھے اور میرے بھائیوں کو غلام بنا کر فروخت کیا تھا"۔

احمد ذرا رک کر پھر کہہ رہا تھا ۔ "میری زندگی ندی کے اس بہنے والے پانی جیسی آزاد ہے جس کی منزل اندھیروں کے سوا کچھ نہ ہو ۔ میں نے اپنی زندگی کا ابتدائی دور ظلم و فلاکت کے ایسے دور میں بسر کیا ہے جہاں امن کی لوریوں کے بجائے آتشِ ہجراں جیسے مشاہدات اور شکستوں کے دھوئیں جیسے تجربات تھے ۔ وقت کی اس تند و جولاں یلغار میں مجھے کبھی بھی قرارِ دل نہیں ملا ۔ میں زوالِ شب کا ایسا مسافر ہوں جس کی زندگی اب تک پتھر کی طرح سخت جان حالات اور سیاہ رات کے سایوں کی طرح خوفناک ماحول میں گزری ہے کاش! میں اپنوں سے بچھڑ کر بگولوں کی طرح دشتِ وحشت میں دھکے کھانے پر مجبور نہ کیا جاتا آہ! میرے ماں باپ، میرے بھائی سب مجھ سے بچھڑ گئے ہیں"۔

احمد نے اپنی جھکی ہوئی گردن جب سیدھی کی تو اس نے دیکھا خصیب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بڑی مشکل سے اپنی ہچکیوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

احمد نے بیتاب ہو کر پوچھا۔ "خصیب! خصیب! میرے دوست! تم رو کیوں رہے ہو؟" خصیب نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میرا بڑا بھائی بھی بچپن میں ہم سے جُدا ہو گیا تھا وہ ہمیں بہت عزیز اور دل پسند تھا۔ آپ کی داستان سن کر مجھے اپنا بھائی یاد آ گیا تھا۔"

خصیب ذرا رکا۔ اپنی آنکھیں صاف کیں اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پھر کہا۔ "کیا آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں گے۔"

احمد نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں لیکن میں وہاں ایک رات سے زیادہ قیام نہ کروں گا۔"

خصیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا مشکور ہوں۔ آپ نے میری بات مان لی۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں ایک شب سے زیادہ آپ کو وہاں نہ روکوں گا۔ اور بھائی کی شادی سے فارغ ہو کر میں بھی آپ کے ساتھ دمشق کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔"

احمد نے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

دونوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر ہانک دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اپنے گھوڑوں کو اس شاہراہ پر سرپٹ دوڑا رہے تھے جو برقہ شہر سے مصر کی بندرگاہ اسکندریہ کی طرف جاتی تھی۔



ایک روز غشاء کے قریب دریائے نیل کا چوبی پُل عبور کرنے کے بعد احمد اور خصیب دونوں بھائی فرعون کے تباہ شدہ شہر منف کے کھنڈرات میں داخل ہو رہے تھے۔ اس وقت کرنوں کا سوداگر چاند اپنی پوری آب و تاب سے سر پر چمک رہا تھا۔ فرعون کے شہر منف کے کھنڈرات کرنوں کی مسکراہٹ میں دور دور تک حنوط شدہ لاشوں اور ممیوں کی طرح کھڑے دکھائی دے رہے تھے اور ان کی پشت پر دریائے نیل مستی میں جھاگ اڑاتا

ہُوا بہہ رہا تھا۔

احمد نے خصیب کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کیسا عبرت کا مقام اور خوف و اندیشوں سے بھرپور ویرانہ ہے۔ یہ کون سی جگہ ہے میرے دوست!"

خصیب نے بھی دُکھتی آواز میں کہا۔ "یہ فرعون کے شہر منف کے کھنڈرات ہیں" دونوں دریا کے کنارے کنارے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے تھے۔ اچانک فضا میں احمد کی آواز ابھری، وہ بلند آواز میں کھنڈرات میں آگے بڑھتے ہوئے گانے لگا تھا۔

مَا اَجْمَلُ الضِّیَاء
روشنی کیسی خوب صورت ہے
مَا اَحْسَنَ الْحَیَاء
حیا کیسی نفیس ہے

اچانک خصیب نے اپنے گھوڑے سے چھلانگ دی اور بھاگ کر احمد کے پاؤں پکڑتے ہوئے اس نے کہا۔ "اے امیر! خدا کے لیے بتائیے یہ گیت آپ نے کیسے گایا۔ کس نے اس گیت کے بول آپ کو سکھائے؟ یہ گیت میرے گمشدہ بھائی کی نشاندہی کرتا ہے۔ بچپن میں وہ یہ گیت اکثر گایا کرتا تھا۔ اس گیت میں میرے بھائی کی صورت اور ہمارے دل کی صدا ہے۔ آپ نے یہ گیت گا کر ہماری یادوں کی چتاؤں کو اور بھڑکا دیا ہے۔ خدا کے لیے بتائیے یہ گیت آپ نے کہاں سے اور کس سے سیکھا؟"

احمد نے دُکھ بھری آواز میں کہا۔ "میرے غلامی کے دور میں میرا ایک غلام ساتھی تھا یہ گیت میں نے اس سے سیکھا تھا۔ وہ اکثر یہ گیت گاتا تھا۔ مجھے بھلا لگا، میں نے اس سے سیکھ لیا۔"

خصیب نے احمد کی ٹانگیں پکڑ کر زور زور سے چلاتے ہوئے کہا۔ "خُدا کے لیے بتائیے وہ کون تھا۔ اس کا نام کیا تھا اور اس وقت وہ کہاں ہے؟"

احمد نے بڑی شفقت سے کہا۔ "اے میرے دوست! اس کا نام احمد تھا۔ احمد بن ہشم۔ دس سال تک وہ میرے ساتھ غلامی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اس وقت نہ جانے وہ

کہاں ہوگا۔"

خصیب گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور آہ وزاری کرتے ہوئے اس نے کہا۔" احمد! احمد! آہ میرا بھائی! وہی میرا بھائی ہے جس نے آپ کو یہ گیت سکھایا۔ کاش میں اس کا ٹھکانہ جان سکتا۔ کاش میں اسے تلاش کر کے اپنے ماں باپ کے پاس لا سکتا جن کی بینائی اس کی جدائی میں رو رو کر آدھی رہ گئی ہے۔ آہ میرا عزیز بھائی۔ اگر وہ مل جائے تو ہمارے گھر سے عذاب و کرب اور ذلت و مسکنت مٹ جائے گی۔"

احمد گھوڑے سے نیچے اترا اور خصیب کو اس کے کندھوں سے پکڑ کر سنبھالتے ہوئے کہا۔" میں نہیں جانتا وہ اس وقت کہاں ہے تاہم میں اتنا وثوق اور سچائی سے کہہ سکتا ہوں وہ زندہ ہے۔"

خصیب فوراً کھڑا ہو گیا اور طوفانی انداز میں پوچھا۔" کیا میرا بھائی زندہ ہے؟"

احمد نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔" واللہ وہ زندہ اور خوش ہے۔ غلامی کے دور میں وہ میرے ساتھ ہی پل کر جوان ہوا تھا پھر سلیہ بادشاہ کے شہر ادریہ میں ایک یہودی لڑکی اسے پسند کرنے لگی۔ بعد میں اس نے اس یہودی لڑکی سے شادی کر لی۔ اس یہودی لڑکی کا نام یمین تھا۔ وہ لڑکی اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی لہٰذا وہ بچاری اسے چوری چھپے غلامی کی زندگی سے نکال کر کہیں اور لے گئی۔ اس وقت وہ دونوں کہاں ہیں کسی کو خبر نہیں۔ بہرحال تم فکرمند نہ ہو، میں اپنی اس مہم سے فارغ ہو کر تمہیں تمہارے بھائی کو ضرور تلاش کر کے دوں گا۔ میرے خیال میں وہ دور مغربی صحراؤں کی کسی پرسکون بستی میں جا کر آباد ہو گئے ہوں گے۔" خصیب نے زور سے احمد کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا۔

"آپ نے میرے بھائی کے زندہ ہونے کی خبر سنا کر میرے دل کو سکون اور میرے حواس کو تابندگی بخش دی ہے۔ یہ خبر سنکر میرے ماں باپ بھی بہت خوش ہوں گے اور وہ رونا دھونا ترک کر دیں گے۔"

خصیب ایک دم بدحواس ہو کر احمد سے علیحدہ ہو گیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے اپنی تلوار بے نیام کر لی تھی۔ اس لمحے فرعون کے ان کھنڈرات میں ہولناک چیخیں بلند

ہوئی تھیں جن کی بازگشت سارے کھنڈرات میں پھیل گئی تھی اور بدحواس ہو کر خصیب نے اپنی تلوار بے نیام کر لی تھی۔ تاہم احمد اپنی جگہ پرسکون کھڑا خصیب کی حالت پر مسکرا رہا تھا۔ جہاں وہ کھڑے تھے ان کے ایک طرف فرعون کا تباہ حال محل اور دوسری طرف مصر کی مشہور ساحرہ دلوکا کے مکان کے کھنڈرات تھے۔

احمد کی طرف دیکھتے ہوئے خصیب نے کہا" حیرت ہے آپ پرسکون کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

احمد نے اور زیادہ مسکراتے ہوئے پوچھا۔" کیا ہوا ہے؟"

خصیب نے سنجیدگی سے کہا۔" کیا آپ نے ان کھنڈرات کے اندر یہ وحشتناک چیخیں نہیں سنیں۔"

احمد نے بے پروائی سے کہا۔" تو کیا ہوا' یہ تو گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں تھیں۔"
خصیب نے اپنی تلوار میان میں کرتے ہوئے کہا۔" میں نے سن رکھا ہے گیدڑ اگر زیادہ اور بھوکے ہوں تو انسان پر بھی حملہ کر دیتے ہیں۔"

احمد نے پیار سے خصیب کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" تم نے غلط سنا ہے۔ یہ گیدڑ تو میری اور تمہاری انسانی بو پا کر اپنی جان بچانے کی خاطر دور بھاگ گئے ہیں۔ آؤ چلیں۔" دونوں اپنے گھوڑوں پہ سوار ہوئے اور دوبارہ آگے بڑھنے لگے تھے۔

تھوڑا آگے جا کر احمد نے فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔" مجھے اندیشہ ہے کہیں تمہارے ماں باپ تمہارے بڑے بھائی کے زندہ ہونے کی خبر سن کر تمہارے منجھلے بھائی کی شادی نہ روک دیں کیونکہ مجھے تمہارے ایک ساتھی نے بتایا تھا وہ لڑکی پہلے کبھی تمہارے بڑے بھائی کی منگیتر تھی۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے سخت صدمہ ہوگا اور میں اپنے آپ کو مجرم تصور کروں گا کہ میرے اس انکشاف پر ان دونوں کی شادی نہ ہو سکی جب کہ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔"

ہلکے ہلکے مسکراتے ہوئے خصیب نے کہا۔" اب آپ اپنے آپ کو مجرم نہ گردانیں۔ اگر احمد بھائی کی شادی نہ ہوگئی ہوتی تو یقیناً یہ شادی رک سکتی تھی لیکن جیسا کہ

آپ کہہ چکے ہیں اخی احمد ایک یہودی لڑکی ایمن سے شادی کر چکے ہیں لہٰذا اخی شیبان اور بہن طروب کی شادی رُک جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خدا کی قسم جب میرے ماں باپ یہ سنیں گے کہ اخی احمد زندہ ہیں اور انجانے صحراؤں کے اندر کہیں شادی بھی کر چکے ہیں تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ آپ جانیے آپ کے اس انکشاف پر ہمارے گھر میں پہلی بار مسرتوں اور خوشیوں کا نزول ہوگا۔

دونوں بھائی باتیں کرتے ہوئے عربوں کے قبیلہ بنو کنانہ کی بستی میں داخل ہو گئے تھے۔

ایک مکان کے سامنے خصیب نے اپنے گھوڑے کو روک لیا اور دروازے پر دستک دی۔ احمد بھی گھوڑے کو روک چکا تھا۔ ماں باپ سے ملنے کی خوشی میں اس کا دِل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اُمید و خوشی کے چراغ روشن تھے اور تیز دھڑکنوں میں اس کا دل زیر و بم میں تھا۔ اس کے ہونٹ خرم و خنداں اور اس کے ذہن میں ایسی ہلچل مچ گئی تھی جیسے چاندنی رات میں ابھی کوئی جابر و قاہر ساحر کوئی جادو کا عصا مارے گا اور جدائی و غریب الوطنی میں گزرے ہوئے سارے لمحے سمٹ کر اسے اپنے بچپن میں لے گئے تھے۔ جب وہ بچہ تھا اور ماں باپ کے ساتھ بے فکری کی زندگی بسر کرتا تھا لیکن جلد ہی اس کے خیالات کا تانا ٹوٹ گیا کیونکہ گھر کا دروازہ کھلا اور ایک جوان اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ خصیب بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔

اس جوان نے خصیب کو والہانہ انداز میں اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔

"خصیب! خصیب! میرے بھائی! تم کیسے ہو؟ ہم تو تمہارے متعلق بہت بُری خبریں سنتے رہے ہیں۔

احمد سمجھ گیا کہ دروازہ کھولنے والا اس کا دوسرا بھائی شیبان بن حشم ہے۔ تاہم وہ ایک طرف چپکا کھڑا رہا۔ دونوں چھوٹے بھائیوں کو گلے ملتے دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

شیبان سے علیحدہ ہوتے ہوئے اور احمد کی طرف اشارہ کر کے خصیب نے شیبان سے کہا۔" اخی! ان کا نام سمرون ہے۔ یہ ہمارے ہراول لشکر کے سالار تھے۔ بہت

اچھے انسان ہیں۔ میں ان کی پوری داستان آپ کو سناتا ہوں۔ سردی ہو رہی ہے۔ پہلے آپ دیوان خانے کا دروازہ کھولیں میں پہلے انہیں وہاں بٹھاؤں پھر میں آپ سب کو ایک خوشخبری بھی سناتا ہوں"۔

شیبان نے فوراً اندر جا کر اگلا دروازہ جو دیوان خانے کا تھا کھول دیا خصیب احمد کا ہاتھ پکڑ کر دیوان خانے میں لے گیا۔ جب کہ شیبان دونوں کے گھوڑوں کی باگیں پکڑ کر گھر کے اندر لے جا رہا تھا۔

خصیب نے احمد کو دیوان خانے میں ایک مسہری پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ آپ جُوتے اتاریں میں آپ کے لیے لباس لاتا ہوں تاکہ آپ آرام سے بیٹھ سکیں۔ اپنا آہنی خود اور زرہ اُتار کر رکھ دیں۔ خنجر اور تلوار کی پیٹی بھی کھول دیں۔ اسے آپ اپنا ہی گھر سمجھیں"۔

احمد کچھ کہنا چاہتا تھا کہ شیبان کمرے میں داخل ہوا اور آگے بڑھ کر احمد سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے کہا" میرا نام شیبان ہے، میں خصیب کا بڑا بھائی ہوں"۔

احمد نے پُرجوش مصافحہ کرتے ہوئے کہا" میرے بھی دو بھائی تھے۔ آپ دونوں سے مِل کر میں یہی محسوس کر رہا ہوں جیسے میں اپنے بھائیوں کے اندر ہی آ گیا ہوں"۔

خصیب نے احمد کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا" اندر میرے ماں باپ اور میری بہن طروب میرا انتظار کر رہے ہوں گے، ان سے مِل کر میں ابھی آپ کے پاس لوٹتا ہوں"۔ خصیب اور شیبان دونوں بھائی دیوان خانے سے نِکل کر مکان کے دُوسرے حصّے میں چلے گئے تھے۔

احمد نے سر سے خود اُتار کر مسہری کے پائے پر رکھ دیا تھا۔ زرہ بھی اس نے اتار کر دوسرے پائے سے لٹکا دی۔ پھر جُوتے اتار کر وہ مسہری پر لیٹ گیا تھا۔ کافی دیر تک وہ مسہری پر چت لیٹا چھت کی کڑیوں کو گھورتا رہا پھر وہ اچانک اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ دیوان خانے سے اسے کسی کی باتیں کرنے کی آوازیں سُنائی دی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد خصیب اور شیبان کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے احمد کا باپ حشم اور پھر اس کی ماں بھی کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ احمد فوراً اُٹھ کھڑا

ہُوا۔ آگے بڑھ کر اس نے حشم سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ شیبان اور خصیب کے باپ ہیں"۔

حشم بن ابی بکر نے مصافحہ کرنے کے بعد احمد کا بازو پکڑ کر دوبارہ مسہری پر بٹھاتے ہوئے کہا۔" آپ کا اندازہ درست ہے۔ میں شیبان اور خصیب کا باپ حشم بن ابی بکر ہوں" پھر اس نے احمد کی ماں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔" یہ شیبان اور خصیب کی ماں امیصا ہے۔

حشم بن ابی بکر، احمد کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ سامنے کی چارپائی پر امیصا شیبان اور خصیب بیٹھ چکے تھے۔

امیصا نے بیتاب ہو کر احمد کو مخاطب کر کے کہا۔" سمرون! سمرون! بیٹے! خصیب نے ہمیں تمہاری پوری داستان سنائی ہے۔ تم بھی میرے بیٹے احمد کی طرح حالات کے ستائے ہوئے ہو۔ وہ اس گھر کی روشنی اور میری آنکھوں کا نور تھا۔ آہ! میں اس کی حفاظت نہ کر سکی۔ کاش میں اُسے اغوا ہونے سے بچا سکتی۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ میرا بیٹا زندہ ہے اور ایک روز وہ مجھ سے آن ملے گا"۔

احمد کچھ کہنے والا تھا کہ دروازے سے باہر کھٹکا ہُوا۔ یوں جیسے وہاں کھڑا کوئی ان کی باتیں سُن رہا ہو۔ احمد نے اندازہ لگا لیا کہ وہ طروب ہو گی۔ طروب جو کبھی اس کی منگیتر تھی۔

احمد نے امیصا کو تسلّی دینے کے انداز میں کہا۔" آپ کوئی اندیشہ نہ کریں میں قسمیہ کہتا ہوں کہ وہ زندہ ہے۔ اس کی بیوی بہت اچھی ہے۔ وہ اسے طوفانی اور غلامی کی زندگی سے نکال کر کسی محفوظ جگہ لے گئی ہے۔ رات کے اس وقت میں اپنے رب اور آسمان پر چمکنے والے چاند ستاروں کو گواہ بنا کر آپ سب سے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد میں احمد اور اس کی بیوی کو خود لے کر آپ کے پاس آؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے اور میں نے کسی سے کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ جب تک میں آپ کو آپ کا احمد لا کر نہیں دیتا اس وقت تک آپ لوگ مجھے ہی سمرون کی بجائے احمد پکارا کیا کریں۔ ایسا کر کے میں آپ کے بیٹے کی کمی تو پوری نہ سکوں گا

لیکن اس کا نام پکارنے سے آپ لوگوں کو ایک دلی راحت تو ضرور ہو گی۔ آپ کی اپنے بیٹے سے محبت اور شفقت سے متاثر ہو کر آج سے میں نے بھی اپنا نام سمرون کی بجائے احمد رکھ لیا ہے۔ اب جو بھی میرا نام پوچھے گا میں احمد ہی کہوں گا"۔

امیصا نے پھر کہا" سمرون بیٹے!"____ احمد نے اپنی ماں کو ٹوکتے ہوئے کہا "دیکھیے خاتون! میں ابھی ابھی آپ سب سے کہہ چکا ہوں کہ میرا نام اب سمرون نہیں احمد ہے۔ لہٰذا مجھے میرے نئے نام سے پکارا جائے"۔

امیصا نے کسی قدر مسکراتے ہوئے کہا۔" ہاں مجھ سے بھول ہوئی۔ احمد! احمد! میرے بیٹے! خصیب نے تمہیں بتایا ہو گا کہ کل شیبان کی شادی ہے۔ یہ کہہ رہا تھا کہ تم یہاں ایک رات ہی قیام کرو گے اور دوسرے روز یہ بھی تمہارے ساتھ دمشق کی طرف روانہ ہو جائے گا"۔

احمد نے خصیب کو مخاطب کر کے کہا" خصیب! خصیب! تم چند روز ان کے پاس ہی رہو میں کل اکیلا دمشق کی طرف روانہ ہو جاؤں گا اور پھر اگر مجھے کوئی لشکر ملا تو وہ ادھر سے ہی گزرے گا۔ تم دھیان رکھنا اور اس میں شامل ہو جانا"۔

خصیب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔" جیسا آپ کہتے ہیں میں ویسا ہی کروں گا"۔

حشم بن ابی بکر نے شیبان اور خصیب کی طرف دیکھتے ہوئے سخت آواز میں پوچھا۔" مہمان کو کھانا بھی کھلاؤ گے یا باتوں میں ہی الجھائے رکھو گے۔ باتوں کے لیے رات بہت پڑی ہے"۔

شیبان اور خصیب اُٹھ کر کھانا لے آئے اور سب اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھانے لگے گئے۔ کھانے کے دوران ہی احمد کو کوئی بات یاد آ گئی تھی اور اس نے خصیب سے پوچھا "جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا جس لڑکی سے شیبان کی شادی ہو رہی ہے وہ تمہاری ماموں زاد ہے لیکن تمہارے ماموں کہیں دکھائی نہیں دیئے"۔

امیصا نے دُکھ سے کہا۔" آہ! میرا بھائی فوت ہو چکا ہے۔ کاش وہ زندہ

ہوتا اور اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کرتا۔"

احمد کے چہرے پر مُردنی چھاگئی تھی تاہم وہ خاموشی سے کھانے میں دوسروں کا ساتھ دینے لگا تھا۔

دوسرے روز احمد نے شیبان کی شادی میں بھرپور شرکت کی پھر وہ دمشق کی طرف کوچ کر گیا تھا۔





خلیفہ عبدالملک بن مروان قصرِ خلافت الدار الخضراء[1] میں اپنے لوازمِ سلطنت کے ساتھ ملکی سلامتی کے امور پہ بحث کر رہا تھا۔ اس کا قد[2] میانہ، دراز ریش اور رنگ بھورا گندمی تھا۔

اس کے سامنے دائیں طرف قاضی ابوادریس الخولانی، قاضی عبداللہ بن قیس عبدمناف اور بائیں طرف کاتب قبیصہ بن ذویب الخزاعی۔ ابوالزعیزعہ اور عمرو بن الحارث بیٹھے ہوئے تھے کہ اس دوران عبدالملک کا حاجب یوسف[3] اندر داخل ہوا اور اس نے تمام

---

[1] یہ عمارت حضرت معاویہؓ کے زمانے سے قصرِ خلافت چلی آتی تھی۔ اسی عمارت کے اندر آپ کی قبر بھی ہے۔ بنو امیہ خلفاء کا قصر یہی عمارت رہی۔

[2] مسعودی نے عبدالملک بن مروان کا حلیہ ایسا ہی بیان کیا ہے۔

[3] یہ شخص بلا کا ہوشیار، ذہین اور پرخلوص تھا۔ کبھی یہ عبدالملک بن مروان کا غلام تھا۔

آدابِ خلافت ملحوظ رکھتے ہوئے کہا "سیدی! ایک جوان آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ افریقہ کی سرزمین سے آیا ہے اور اپنا نام احمد بن حشم بتاتا ہے۔"

عبدالملک چند ثانیوں تک حاجب کی طرف دیکھتے ہوئے سوچتا رہا پھر اس نے کہا "اسے اندر بھیج دو۔"

حاجب باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد قصرِ خلافت کے اس کمرے میں احمد داخل ہوا۔ اس کے سر پہ آہنی خود تھا جو دھول سے اَٹا ہوا تھا۔ زرہ کے اوپر اس نے عبا پہن رکھی تھی جو لگاتار سفر کرنے کی وجہ سے میلی ہونے کے علاوہ کئی جگہ سے پھٹ چکی تھی۔

عبدالملک چند لمحوں تک احمد کو دیکھتا رہا پھر بڑی ہمدردی سے اس نے پوچھا "تم کون ہو اور کس غرض سے دمشق میں وارد ہوئے ہو۔" احمد نے بڑی عاجزی سے کہا "سیدی! میں اس تباہ حال لشکر کے ہراول کا سردار تھا جس نے زہیر بن قیس کی سرکردگی میں برقہ شہر سے باہر کھلے صحرا کے اندر اہلِ قسطنطنیہ اور اہلِ افریقہ کے متحدہ لشکر سے اپنی زندگی کی آخری جنگ لڑی تھی۔"

چند ثانیوں تک عبدالملک پھر احمد کو بڑی شفقت اور دردمندی سے دیکھتا رہا پھر کہا "اپنے حالات تفصیل سے بیان کرو۔" جواب میں احمد اپنے بچپن سے لے کر دمشق پہنچنے تک کے سارے حالات تفصیل سے بیان کر رہا تھا۔

احمد کے خاموش ہونے پر عبدالملک نے پوچھا "اب تم ہم سے کیا چاہتے ہو۔" احمد گڑگڑاتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا "میں آپ سے اس التجا کے ساتھ ملنے آیا ہوں کہ افریقہ کی طرف ایک لشکر روانہ کیجئے جو وہاں مسلمانوں کے مجروح وقار کو بحال کرے۔" احمد رکے اور دم لیے بغیر کہتا رہا "سیدی! عقبہ بن نافع اور زہیر بن قیس کی کوششوں کے باعث وہاں لوگوں کی ایک خاصی تعداد اسلام قبول کر چکی ہے۔ ان میں بربر بھی ہیں، رومن، ونڈال، گوتھ،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۷) لیکن عبدالملک جو خود ایک بیدار مغز، دور اندیش اور عالم دین خلیفہ تھا اس کی ذہانت دیکھ کر اسے آزاد کر دیا اور اپنا حاجب مقرر کر دیا۔

یونانی، یہودی اور اندلسی بھی ہیں۔ وہ مقامی آبادی اور ان کے حکمرانوں سے چھپ چھپ کر عبادت کرتے ہیں۔ انہیں کسی ایسے لشکر کا انتظار ہے جو انہیں ان کی حفاظت اور آزادی کی ضمانت دے۔"

احمد ذرا رک کر طوفانی انداز میں کہہ رہا تھا "قسم ہے مجھے صفا و نوس کی وادیوں کی اگر ان مسلمانوں کی دیکھ بھال نہ کی گئی تو انتہا پسند رومن اور تصور پسند نصرانی سانپ اور اژدہے بن کر ان کے لیے عقوبت کا سمندر اور نفرت کا طوفان کھڑا کر دیں گے۔ بچوں کو ماؤں کی چھاتیوں سے نوچ لیں گے۔ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیں گے اور یہ مہیب طاغوتی طاقتیں اپنی نفرت کے طوفان اور ہوس کی یلغار میں ان کی شناختوں کو مٹا کر ان کی آزادی کو بے وقار بنا دے گی اور یہ عالمِ اسلام کے لیے ایک افسوسناک باب ہوگا۔ اگر ہم نے اس معاملے میں تاخیر سے کام لیا تو قدرت ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی اس لیے کہ رحیم و کریم خدا ملتوں اور قوموں کی تباہی کے فیصلے نہیں کرتا بلکہ ان کے گناہوں کی سزا دیتا ہے۔

سیدی! جس طرح دریا میں بہنے والے قطرے کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی اسی طرح میں بھی افریقہ میں بے بس تھا۔ ان صحراؤں میں کوئی دہلیز ایسی نہ تھی جسے میں اپنی کہہ سکتا ورنہ میں وہیں رک کر حالات کو سنوارنے کی کوشش کرتا۔

جس خدا نے بڑا نظامِ کائنات قائم کر رکھا ہے جس خدا نے اجرامِ فلکی کو اپنے قانون کی بندش میں جکڑ رکھا ہے۔ جس نے کائنات کے طبقوں کو غیر مرئی سہاروں پر قائم کر رکھا ہے اسی رب کا نام لے کر اٹھیے اور تادیب وعد وعدِ الٰہی بن کر ملت کی حفاظت کا سامان کیجئے۔"

جوش اور جذبے میں احمد کسی سحر البیان کی طرح کہہ رہا تھا "یاد رکھیے! شر کے خلاف انتہا پسندی خاموشی سے افضل ہے۔ سیدی! زندگی کے دو حصے ہیں۔ انجماد و سکون اور شورش و اضطراب۔ اگر آپ انجماد و سکون میں پڑے رہے تو افریقہ کی طرف سے بدحال نو مسلموں کے قافلے مصر و حجاز کی طرف کوچ کرنا شروع کر دیں گے۔ اس لیے کہ جب وہاں کے دیدہ دہن دشمنوں کو یہ خبر ہو گئی کہ ان کا کوئی پاسبان، کوئی محافظ نہیں ہے تو وہ انبوہ در انبوہ اور ٹھٹ کے ٹھٹ اپنے گھروں، خانقاہوں اور صومعوں سے نکل کر درندگی و سفاکی اور عناد

کی وہ آگ لگائیں گے جو بجھ نہ سکے گی ایسے ایسے مظالم کی ابتدا کریں گے جنہیں دیکھ کر آنکھ لرزے جنہیں سُن کر کان کانپیں"۔

احمد چند ثانیوں تک خاموش رہا اس نے دیکھا عبدالملک متین اور خاموش بیٹھا تھا۔ احمد نے یہ بھی دیکھا عبدالملک پریشان و بے کل تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری نمی تھی اور اس نمی کے پس منظر میں انتقام کی آگ کا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

احمد نے پھر کہا لیکن اس بار اس کے لہجے میں جوش و جذبے کے بجائے متانت و دھیمہ پن تھا۔ "مجھے اُمید ہے آپ افریقہ کے نومسلموں کو درد و کرب کا ایک باب نہ بننے دیں گے۔ اگر آپ نے دشمن کو اجازت دی کہ وہ انہیں خون اور اشکوں میں نہلا دیں تو یاد رکھیے! ان میں کوئی دینی و نسلی یکجہتی نہ رہے گی اور دشمن ان کے عقلی اور ذہنی قوا کو مفلوج کر کے انہیں دوبارہ پُرانی راہوں پر چلنے کے لیے مجبور کر دے گا اور اس وقت آپ کے اس قصرِ اقتدار کی بھی کوئی حیثیت نہ رہے گی۔

سیدی! مدارِ ملت اور عمودِ مذہب بن کر اُٹھیے اور اللہ اکبر کی صدائیں بلند کرتے ہوئے اپنی ملت کی فریاد سنیے۔ اگر آپ اپنے رب کی مستور و ماوراء قوت اور دستِ اجل بن کر اُٹھ کھڑے ہوئے تو دشمن کو اپنے محرک بدی ارادوں اور اپنی سفلی خواہشات کی تکمیل کا موقع نہ ملے گا اور ہم اُسے بروقت اپنی گرفت میں لینے پر کامیاب ہو جائیں گے۔"

احمد رکا پھر اس نے نہایت مدھم آواز میں کہا۔ "سیدی! میں نے جو کہنا تھا کہہ چکا میں تسلیم کرتا ہوں اپنی اس عرضداشت میں کچھ سخت الفاظ بھی میں نے استعمال کیے ہوں گے لیکن میں ان کی سزا اور عقوبت کے لیے بھی تیار ہوں"۔

عبدالملک کا چہرہ خوفزدہ اور آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ پھر اس نے گونجتی گرجتی آواز میں کہا۔ "تمہاری باتیں صاف اور کھری ہیں۔ واللہ ہمیں ہی عبرت کی ضرورت تھی۔ تمہاری باتیں تازیانہ ہیں اور ہم اسی قابل تھے۔ اے مسافرِ جلیل! اطمینان رکھو ہم دشمن کی افواجِ جور و ظلم کو سر بریدہ اور مسلمانوں کے ساتھ آگ اور خون کا وحشت بدوش کھیل کھیلنے والوں کو جگر دریدہ دیکھیں گے۔ ہم افریقہ کے نومسلموں کو بے شرف و بے توقیر

اور بے وقعت و بے نصیب نہ ہونے دیں گے۔ ہم دشمن کی خونی یلغار کے سامنے انہیں موت کی آندھی کا لقمہ نہ بننے دیں گے۔

تمہاری حالت سے ظاہر ہے تم لگاتار سفر کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہو۔ اطمینان رکھو ہم تمہیں مایوس نہ کریں گے۔ آنے والی رات تم اسی قصر کے مہمان خانے میں بسر کرو۔ اس وقت تک ہم کوئی آخری فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوں گے۔ دُعا کرو ہمارا رب ہمیں توفیق دے کہ ہم وقت ضائع کیے بغیر اپنے نومسلم بھائیوں کی مدد کا سامان کر سکیں اب تم جا کر آرام کرو، ہم خود تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کریں گے"۔

عبدالملک کے اشارے پر کاتب عمرو بن الحارث اُٹھا۔ احمد کو باہر لا کر حاجب یوسف کے کان میں کچھ کہا اور دوبارہ اندر چلا گیا۔ یوسف نے فوراً ایک مسلح محافظ کو بلایا۔ اور اسے تاکید کرتے ہوئے اس نے احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انہیں الدار الخضراء کے سرکاری مہمان خانے میں لے جاؤ اور انہیں تاکید کرو کہ ان کے آرام، ان کے کھانے اور ہر آسائش کا خیال رکھیں"۔

احمد نے باہر کھڑے اپنے اس گھوڑے کی باگ پکڑ لی جو حسین ارتمیس نے اسے دیا تھا پھر وہ اس محافظ کے ساتھ ہو لیا تھا۔ قصر کی چار دیواری کے اندر ہی اندر انہوں نے ایک طویل باغ کو طے کیا اور خوب کشادہ راستوں سے ہوتے ہوئے وہ مہمان خانے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

احمد اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے مہمان خانے کے اصطبل کے قریب کھڑا ہو گیا۔ محافظ نے آگے بڑھ کر مہمان خانے کے منتظمین سے کچھ کہا اور وہ فوراً حرکت میں آ گئے۔

محافظ واپس چلا گیا۔ ایک کارکن بھاگ کر آگے بڑھا اور اس سے اس کے گھوڑے کی باگ لے لی۔ احمد نے زین سے خرجین اتار لی جس میں اس کا ضروری سامان تھا۔ وہ کارکن گھوڑے کو اصطبل کی طرف لے گیا تھا۔ ایک دوسرا آدمی احمد کو مہمان خانے کے اندر لے گیا۔ ایک کمرے کا دروازہ اس نے کھولا اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے بڑی ارادتمندی سے کہا۔ "آپ تشریف رکھیں، میں ابھی کھانا لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ شام ہونے

والی ہے۔ سردی بھی خوب تیز ہوگئی ہے۔ مَیں ایک آدمی کو بھیجتا ہوں وہ آتش دان میں آگ روشن کر دیتا ہے۔

احمد اس کمرے میں داخل ہُوا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک بڑی اور خوب چوڑی مسہری پر صاف ستھرا بستر لگا ہُوا تھا۔ دائیں طرف کی دیوار میں آتش دان اور قریب ہی پانی کا چھوٹا سا ایک حوض اور پانی سے بھرے ہوئے کچھ برتن پڑے تھے۔ شام ہونے والی تھی اور تیز ہوائیں کاٹنے کو دوڑ رہی تھیں۔

احمد نے اپنا خود اور زرہ اُتار کر کمر سے تلوار اور خنجر کی چرمی پٹی علیحدہ کی اور جُوتے اُتار کر اپنے آپ کو گرم کرنے کے لیے وہ بستر میں گُھس گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک آدمی نے آ کر آتش دان میں آگ روشن کر دی تھی اور کمرہ اب گرم ہوگیا تھا۔ مغرب کی اذان ہونے پر احمد چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ پانی کے حوض پر آ کر اس نے وضو کیا اور نماز پڑھنے لگا تھا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہو کر اُٹھنے لگا تو وہی شخص اندر آیا جس نے احمد کے لیے کمرہ کھولا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کے برتن تھے۔ جو اس نے پیتل کے ایک بڑے طشت میں اُٹھا رکھے تھے۔ جس چٹائی پر احمد نے نماز ادا کی تھی اسی چٹائی پر اس نے کھانے کے برتن رکھ دیئے اور احمد خاموشی سے کھانا کھانے لگا تھا۔

آتش دان میں آگ اب خوب بھڑک رہی تھی۔ قریب ہی فالتو لکڑیوں کا ایک ڈھیر بھی لگا تھا۔ کھانے کے بعد احمد نے آتش دان میں دو اور لکڑیاں ڈال دیں اور اُٹھ کر باہر آیا۔ تاریکی اب خوب گہری ہوگئی تھی۔ شمال مشرق کی طرف سے آنے والی برفانی ہواؤں نے سردی کو خوب تیز کر دیا تھا۔

احمد اپنے آپ کو کمبل میں لپیٹے تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا اصطبل میں آیا۔ اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر اس نے ہاتھ پھیرا۔ احمد نے دیکھا گھوڑے کو کافی مقدار میں ہرا اور خشک چارہ ملا کر ڈالا گیا تھا اور ایک طرف دانے کا توبڑہ بھی پڑا ہُوا تھا۔

تھوڑی دیر تک احمد اپنے گھوڑے کی گردن سہلاتا رہا پھر وہ اندر جا کر اپنی مسہری پر لیٹ گیا تھا۔ چھت کی کڑیوں کو گھورتے ہوئے وہ تصوّر ہی تصوّر میں قرطاجنہ

پہنچ گیا تھا۔ جہاں سپاہیوں کے آگے آگے بھاگتے ہوئے ایمن نے اس کے لیے دروازہ کھولا تھا اور وہ گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ پھر تصورات کے حاشیے وسیع ہوتے گئے۔ ایمن کی ماں احمد سے کہہ رہی تھی۔ ایمن تمہاری ہے۔ میرے پاس یہ تمہاری امانت ہے۔ جب چاہو لے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں اور اس موقع پر ایمن شرما کر احمد کے پیچھے کھڑی ہوگئی تھی۔ بیساختہ احمد کے منہ سے نکل گیا۔ "ایمن! ایمن! تم کہاں ہو؟"

احمد کے خیالات پھر بکھرنے لگے تھے۔ تصوّرات کی کہر کے غلاف میں اس نے دیکھا وہ زخمی حالت میں ارتمیس کے گھر داخل ہو رہا تھا۔ پھر ارتمیس کا اس کے ساتھ سلوک۔ اسے جگاتے وقت ارتمیس کے ہونٹوں پر جو ہلکا سا تبسم ہُوا کرتا تھا وہ اس کی محبت کی ترجمانی کے لیے نمایاں اور کافی تھا۔

ارتمیس کا اس کے لیے پریشان ہونا۔ ہر وقت اس کا خیال رکھنا اور پھر رخصت ہوتے وقت اس کے چہرے پر غم اور دُکھ کی جو پریشان کن دھول تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جو نمی تھی وہ اس کی گہری اور مضبوط محبّت کا اظہار تھا۔

اس کی روانگی کے وقت گو وہ بے بس لڑکی بچاری کچھ نہ کہہ سکی تھی لیکن رخصت کے وقت جب وہ پہاڑ پر گردن جھکائے کھڑی تھی تو اس کی آنکھوں میں چاہت کا ایک پیغام اور اس کے چہرے پر بکھری ہوئی جذبات کی دھول میں محبت کے انمٹ نقوش تھے۔ گو اس معصوم و نوعمر لڑکی نے منہ سے کچھ نہ کہا تھا تاہم اس کی آنکھوں میں خاموش محبت اور باتوں میں دبی دبی چاہت ضرور تھی۔

احمد کی روانگی کے وقت اس کے چہرے پر کتنا دُکھ، کتنا غم، کتنی محرومی اور اس کی آنکھوں میں تجدیدِ ملاقات کی کیسی کیسی آرزوئیں تھیں۔ ارتمیس کا معصوم اور حسین چہرہ احمد کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ ابھی نوعمر ہی تھی لیکن بلوغت کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی اور نسوانیت کی اوّلین کرنیں اس کے چہرے پر عیاں تھیں۔

احمد کو یوں لگا جیسے ارتمیس اپنے تمام حسن و جمال کے ساتھ صبحِ کاذب کے دھندلکوں میں چمکنے والے ستارے زہرہ کی طرح اس کے سامنے کھڑی کہہ رہی ہو۔

یَں بھی آپ کی محبت کی حق دار ہوں ۔ یَں آپ کی ہوں اور ان اجنبی صحراؤں کے اندر یَں آپ کا انتظار کرتی رہوں گی "۔ احمد کے ہونٹوں پہ گہری مسکراہٹ بکھر گئی اور جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے کہا ۔" ارتمیس ! ارتمیس ! مَیں تمہیں مایوس نہ کروں گا "
تھوڑی دیر بعد احمد گہری نیند سو رہا تھا ۔

آدھی رات کے بعد اس کی نیند اُچاٹ ہوگئی اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔ آتشدان کی آگ مدھم ہو چکی تھی ۔ وہ اُٹھا اور چند لکڑیاں اُٹھا کر آتش دان میں ڈال دیں ۔ باہر گہری تاریکی تھی اور تیز خنک ہوائیں ہر شے کو منجمد کر رہی تھیں ۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ باہر آیا ۔ سخت سردی اور گہرے سیاہ اندھیرے میں دمشق شہر کسی بجھی ہوئی شمع کی طرح اداس اور شہر خاموشاں کی طرح چپ تھا ۔

احمد نے دروازہ بند کر لیا اور اپنے بستر پہ آ کر بیٹھ گیا ۔ آتش دان کی آگ اب خوب بھڑک اُٹھی تھی ۔ اس نے اپنے آپ کو لحاف میں لپیٹ لیا اور گہری سوچوں میں کھو گیا اس کے خیالات بھٹک کر فرعون کے تباہ حال شہر منف کے کھنڈرات کے قریب بنو کنانہ کی بستی کی طرف چلے گئے تھے ۔

اس کے سامنے اپنے ماں باپ کا چہرہ گھوم گیا جو اپنے بیٹے کے زندہ ہونے کی خبر سُن کر کیسے خوش اور مطمئن ہوئے تھے پھر وہ اپنے بھائیوں ، طروب اور مرجانے والے ماموں کے متعلق سوچنے لگا ۔

اپنے بستر کے اندر احمد نہ جانے کتنی دیر تک پُرانی یادوں کی چتا میں جلتا رہا تھا یہاں تک کہ باہر اصطبل کی طرف اسے گھوڑوں کی ٹاپوں کی تیز آوازیں سنائی دیں ۔

احمد نے لحاف ایک طرف پھینک دیا ۔ دروازہ کھول کر وہ باہر آیا ۔ اس نے دیکھا اصطبل میں اپنے گھوڑے باندھنے کے بعد کچھ لوگ اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے ۔ جب وہ نزدیک آئے تو اس نے دیکھا وہ تعداد میں تین تھے ۔ ان میں سے ایک جو آگے آگے چل رہا تھا خوب دراز قد اور کسے ہوئے جسم کا مالک تھا لیکن عمر کچھ ڈھل رہی تھی اس کے پیچھے دو مسلح جوان تھے جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں مشعلیں اٹھا رکھی تھیں ۔ ٹوٹے دلا

کی طرح اداس اس رات کی گہری تاریکی میں وہ تین اجنبی عجیب سے لگ رہے تھے ۔ ان میں سے دو ذرا دور ہی رک گئے جب کہ ایک مشعل بردار آگے بڑھا اور احمد کو دروازے پہ کھڑا دیکھ کر اس نے پریشانی میں پوچھا ۔" اگر مَیں غلطی پہ نہیں تو آپ ہی احمد بن حشم ہیں "۔

اس مشعل بردار کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے احمد نے کہا ۔" تمہارا اندازہ درست ہے ۔ مَیں ہی احمد بن حشم ہوں "۔ مشعل بردار نے کہا ۔" مَیں اس لشکر کا ایک سپاہی ہوں ، جو طلوع ہونے والی صبح کو افریقہ کی مہم پہ روانہ ہوگا "۔

احمد نے چونک کر پوچھا ۔" کیا افریقہ کے لیے کوئی لشکر ترتیب دیا جا چکا ہے "؟

مشعل بردار نے کہا ۔" خلیفہ عبدالملک نے ذاتی طور پہ اس کام کو انجام دیا ہے ۔ آپ افریقہ سے جو کمک کی التجا لے کر آئے تھے وہ اس سے بے انتہا متاثر ہوئے تھے ۔ لہٰذا رات ہی رات وہ ایک لشکر ترتیب دے چکے ہیں اس لشکر کا سپہ سالار عبدالملک نے اپنے ایک پختہ کار اور آزمودہ جنگ جرنیل حسان بن نعمان غسانی کو مقرر کیا ہے ۔ وہ ایک جہاں دیدہ عرب ہیں اور اس وقت آپ سے ملنے آئے ہیں "۔

احمد نے چونک کر پوچھا ۔" حسان بن نعمان مجھ سے ملنے آئے ہیں ؟ یہ میری خوش بختی ہوگی ، کہاں ہیں وہ "۔ مشعل بردار نے اپنے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ وہ میرے دوسرے ساتھی کے پاس کھڑے ہیں "۔ احمد فوراً آگے بڑھا لیکن اس وقت تک ذرا فاصلے پہ کھڑا حسان بن نعمان دوسرے مشعل بردار کے ساتھ فوراً آگے بڑھ چکا تھا ۔

قریب جا کر احمد نے جب مصافحہ کے لیے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر کچھ کہنا چاہا ۔ تو حسان بن نعمان نے اس کے ہاتھ پیچھے ہٹا دیئے اور آگے بڑھ کر احمد کو گلے لگاتے ہوئے کہا ۔" تم سے صرف مصافحہ پہ اکتفا نہیں کیا جا سکتا ۔ مجھے عبدالملک تمہارے متعلق بہت کچھ بتا چکے ہیں ۔ تمہاری حالت عبرت خیز اور تمہاری شجاعت قابلِ ستائش ہے "۔ احمد بھی خوب قوت سے حسان کے ساتھ بغلگیر ہو گیا تھا ۔

علیحدہ ہوتے ہوئے حسان نے مشعل برداروں سے کہا ۔ اب تم جاؤ ۔ مَیں آ جاؤں گا

رات بھی اب اپنے آخری مراحل میں ہے ۔ شاید تھوڑی دیر تک فجر کی اذانیں شروع ہو جائیں گی تم جاؤ میں آجاؤں گا ۔ دونوں مشعل بردار چلے گئے ۔

حسان، احمد کا ہاتھ تھام کر کمرے میں آیا اور دونوں آتش دان کے پاس بیٹھ گئے ۔ حسان نے اپنے لباس کے اندر سے لپٹا ہوا کپڑے کا ایک سفید ٹکڑا نکالا اور احمد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ۔ "اسے پڑھ لو"۔

احمد نے اس کپڑے کو کھولا اور اس پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنے لگا۔ وہ عبدالملک کی طرف سے ایک حکم نامہ تھا جس میں حسان بن نعمان کو لشکر کا سالار اعلیٰ اور احمد کو اس کا نائب مقرر کیا گیا تھا ۔ حکم نامے کے نیچے عبدالملک کی مہر تھی اور اس مہر کے اندر یہ الفاظ تحریر تھے ۔

اٰمَنْتُ بِہٖ مُخْلِصاً[1] (میں اس پر مخلصانہ ایمان لایا ہوں)

احمد نے کاغذ کو دوبارہ لپیٹ کر حسان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اے امیر! قسم مجھے رب دوجہاں کی آپ کا نائب ہونا میرے لیے بہت بڑا انعام اور ایک عظیم سعادت ہے ۔ آپ دیکھیں گے میں آپ کو مایوس نہ کروں گا ۔ میں ہر حال میں ہر بُرے وقت میں آپ کا ساتھ دوں گا ۔ میں آپ کو کبھی یہ احساس نہ ہونے دوں گا کہ میں جنگ میں آگے رہنے سے جی چراتا ہوں ۔

حسان نے احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ہشم کے بیٹے! میں تم پر مکمل بھروسا اور اعتماد کرتا ہوں ۔ افریقہ کے گمنام صحراؤں اور سنگلاخ کوہستانوں میں تم ہی میرے رہبر و راہنما ہوگے کہ تم ان علاقوں سے خوب واقف ہو میں تمہاری ہر تجویز ہر فیصلے کو مقدم جانوں گا ۔"

احمد نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا افریقہ میں داخل ہونے سے قبل بحیرہ احمر کے کنارے وادی طوی میں بھی میں ایک مہم سے نمٹنا چاہتا ہوں" ۔ حسان نے حیرانگی سے

---

[1] عبدالملک بن مروان کی مہر میں یہی الفاظ تھے ۔

پوچھا ۔ "وہ کون سی مہم ہے جسے تم وادی طوی میں سر کرنا چاہتے ہو" ۔

احمد نے جذبات کی شدت میں کہا " یہ ان بردہ فروشوں کی سرکوبی ہوگی جو میرے علاوہ نہ جانے اور کتنے مسلمان بچوں کو ان کے والدین سے علیحدہ کرکے بیچ چکے ہوں گے میں ان سے ان کے مظالم ان کی بربریت کا حساب لوں گا ۔ میں انہیں ان کے گناہوں ان کے اعمالِ بد کی سزا دوں گا ۔"

حسان نے احمد کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا ۔ "میں یہ مہم سر کرنے کے لیے تمہیں پورا موقع دوں گا ۔ میں صرف تمہیں لینے آیا ہوں ۔ جبکہ لشکر نے ہمارے ساتھ روانہ ہونا ہے ۔ وہ اپنے کوچ کی حالت میں ہے اور فجر کی نماز کے بعد یہاں سے روانگی ہوگی ۔ کوچ کے وقت عبدالملک خود موقع پر موجود ہوں گے ۔"

احمد کھڑا ہوتا ہوا بولا ۔ "میں ابھی آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں"۔ حسان بھی کھڑا ہوگیا ۔ احمد نے اپنے گھوڑے کی خرجین اٹھائی اور حسان کے ساتھ ہولیا ۔ اصطبل میں آکر احمد نے جلدی جلدی اپنے گھوڑے پر زین ڈالی ۔ حسان بھی اپنا گھوڑا کھول چکا تھا ۔ دونوں سوار ہوئے اور تاریک اور سنسان پڑے شہر میں اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا رہے تھے ۔

جب وہ مستقر میں داخل ہوئے تو فجر کی اذان سنائی دی ۔ حسان احمد کو اس خیمے میں لے گیا جو اس کے لیے مختص کیا گیا تھا ۔ پھر وہ اس لشکر کے ساتھ فجر کی نماز ادا کر رہے تھے جس کی قسمت میں قدرت فتح کے سنہری حروف لکھ چکی تھی ۔



جب وہ دونوں فجر کی نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے دیکھا ۔ نمازیوں کی صفوں میں خلیفہ عبدالملک شہر کے قاضی، کاتب اور حاجب موجود تھے ۔ حسان اور احمد نے آگے بڑھ کر بڑی ارادتمندی اور ادب سے عبدالملک اور اس کے عمال سے مصافحہ کیا ۔ عبدالملک نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

"اے فرزند دلبند! دیکھ میں نے تیرے کہنے پر افریقہ کے لیے لشکر تیار کرنے میں

تی المقدور کوئی تاخیر نہیں کی۔ اب جنگ کے لیے اس لشکر کو صحیح سمت اور مناسب رُخ پر استعمال کرنا تمہارا اور حسان کا کام ہے۔ میری دعائیں تم دونوں کے ساتھ رہیں گی۔ للہ تم سب پر اپنی خصوصی رحمت کا نزول کرے گا۔ روانگی سے قبل میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں شاید اس پر عمل کر کے تم سب فلاح پاؤ۔

"سنو! تم سب یہاں سے نسلوں کے امین اور سلامتی کے محافظ بن کر روانہ ہو رہے ہو۔ حتی المقدور کوشش کرنا جہاں دشمن حرص و ہوس سے کام لے وہاں اس پر غالب آنے کے بعد تم لوگ عفو و درگذر سے کام لینا۔ جھوٹ دشمن کا دیوتا ہوگا۔ اس کے مقابلے میں تم لوگ سچ کو اپنا آقا بنانا۔ فلاح پاؤ گے۔

یاد رکھو! فطرت ایک معمہ ہے۔ اس کی بھول بھلیوں میں کھو نہ جانا۔ زندگی ایک مکتب ہے اس سے عبرت اور سبق حاصل کرنا۔ اپنے رب کی ضروریات کے اسیر اور اپنے ارادوں کے شہید بن کر دشمن کے سامنے نبرد آزما ہونا۔ اگر دشمن خلوصِ دل سے صلح پر آمادہ ہو تو اسے امان دو۔ اگر وہ دھوکا دے، تمہارے ساتھ جنگ کرے اور اپنے خونخوار کردار کا اظہار کرے تو تم بھی فنا کے آنچل بن کر ان کے جسموں کو ریزہ ریزہ اور ان کی روحوں کو لخت لخت کر دو۔

یاد رکھو! زندگی کے اس قفس میں اگر تمہیں کبھی موت کا منتظر ہونا پڑے تو جی نہ چھوڑنا۔ ادبار کی لامتناہی تاریکیوں میں ہمت نہ ہارنا ہمیشہ اپنے رب کو خلوص کے ساتھ پکارنا۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ دشمن اگر صلح کا ہاتھ بڑھائے تو اس کے لیے زندگی سے عجیب تر اور اگر وہ تلوار کی چمک سے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کرنا چاہے تو اس کے لیے موت سے عمیق تر بن جاؤ۔ کبھی بھی دشمن کی دانش اور اس کی طاقت کے غلام بن کر نہ رہنا۔

یاد رکھو! جو لوگ اپنے دشمن کے سامنے گہری نیند سوتے ہیں وہ ابدی نیند سو جاتے ہیں اور ان کی روحیں ان کے جسموں کو پھر تازگی نہیں بخشتیں میں تمہیں اس امید پر رخصت کر رہا ہوں کہ تم لوگوں کی طرف سے مجھے اچھی خبریں ملیں اور میں پہلے سے کہیں بڑھ کر مذہب و ملت کی خدمت کرنے کا حوصلہ پا سکوں۔"

پھر عبدالملک نے باری باری حسان اور احمد سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا لشکر اپنے کوچ کی تیاریاں مکمل کر چکا ہے۔ اب تم یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ میرا رب تم سب کو اپنی سلامتی کے گوشے اور اپنے اطمینان کے سائے میں رکھے۔"

حسان اور احمد وہاں سے ہٹ کر اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اپنے لشکر کے ساتھ وہ وہاں سے کوچ کر گئے تھے۔



اسلامی لشکر سرکش آندھی اور طوفان کی طرح سفر کرتا ہوا دمشق سے جنوب مغرب کی طرف بڑھا۔ ارضِ فلسطین کے بائیں بازو کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے لشکر بطراء اور ایلہ شہروں کے درمیان سے گزرتا ہوا مغائرِ شعیب میں آ رکا۔ یہاں لشکر نے آدھی رات سے اگلے روز دوپہر تک قیام کیا پھر دوبارہ آگے بڑھنا شروع کیا۔

بحیرۂ قلزم جہاں ایک طرف نیل کے ڈیلٹا کی طرف جاتے ہوئے سیدھا آگے اور دوسری طرف ایلہ شہر کی طرف دائیں طرف بڑھتے ہوئے کسی پرندے کی کھلی چونچ کی سی شکل بناتا ہے وہاں لشکر نے اپنی رفتار اور تیز کر لی تھی اور لق و دق صحرا کو عبور کرنے کے بعد جبل موسیٰ کے ساتھ ساتھ وادیٔ شعیب سے نکل کر وہ وادیٔ طویٰ میں داخل ہو گیا تھا۔ اس وقت تک شام ہو گئی تھی۔ وادیٔ طویٰ اور کوہستان سینا کے دامن میں لشکر نے اپنے خیمے نصب کر کے قیام کر لیا۔

جس وقت حسان اور احمد کے خیمے نصب ہو رہے تھے اور لشکر کے جوان خوراک اور رسد کے سامان سے لدے اونٹوں کو بٹھا رہے تھے حسان نے اپنا

لاتے ہوئے کہا۔" اس وقت ہم وادی طویٰ میں ہیں۔ تم نے کہا تھا کہ تم بحیرہ قلزم اور وادی طویٰ کے کنارے بسنے والے قزاقوں اور بردہ فروشوں سے نمٹنا چاہتے ہو۔ اب بولو، تمہارا کیا لائحہ عمل ہے۔ اس مہم کے لیے کس قدر لشکر کی ضرورت ہوگی۔"

احمد نے ایک نظر ان جوانوں پر ڈالی جو اس کا خیمہ نصب کر رہے تھے پھر اس نے حسان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" اس مہم کے لیے زیادہ سے زیادہ دو ہزار جوان درکار ہوں گے۔ اگر وہ سمندر کے کنارے نہ ہوتے تو میں ایک ہزار جوانوں پر ہی اکتفا کرتا۔ لیکن ان کا بحری راستہ بھی روکنا ہوگا تاکہ وہ اپنی کشتیوں میں سوار ہو کر بحیرہ قلزم پار کر کے حبشہ کی طرف فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔"

حسان نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔" تو پھر آؤ دو ہزار جوانوں کو ساتھ لے کر اپنی اس مہم پر روانہ ہوں۔"

احمد نے اسے روکتے ہوئے کہا۔" ٹھہریئے! میری بات سنیئے۔" حسان رک گیا۔ احمد اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر اس کے پہلو میں آیا اور حسان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" اے امیر! آپ یہیں رہیں اور لشکر کی دیکھ بھال کریں۔ میں دو ہزار جوانوں کے ساتھ ان قزاقوں سے نمٹ کر جلد لوٹ آؤں گا۔"

حسان نے مسکراتے ہوئے کہا۔" کل کو یہ تو نہ کہو گے کسی نیک کام میں حسان نے میرا ساتھ نہ دیا۔" احمد نے چھاتی نکالتے ہوئے کہا۔" یا امیر! میں ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ واللہ مجھے آپ کی ذات پر فخر ہے۔" حسان نے بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔" تو پھر اپنی پسند کے دو ہزار جوان لو اور اپنی مہم پر روانہ ہو جاؤ۔"

احمد فوراً وہاں سے ہٹا، وقت ضائع کیے بغیر اس نے دو ہزار جوان علیحدہ کیے اور انہیں لے کر وہ جنوب کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

راستے میں احمد نے ان دو ہزار جوانوں کو حملہ آور ہونے کا سارا طریقہ کار سمجھا دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بحری قزاقوں کی بستی کے نزدیک پہنچ گئے۔ احمد وہاں رک گیا۔ سات سو جوانوں کو علیحدہ کر کے اس نے قزاقوں کی بحری ناکہ بندی کو روانہ کر دیا تھا اور یہ جوان

دائیں طرف سے ایک لمبا چکر کاٹ کر قزاقوں کی بستی اور سمندر کے کنارے کھڑی ان کی کشتیوں کے درمیان حائل ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ چار چار سو جوان احمد نے ان قزاقوں کے دائیں بائیں بھی مقرر کر دیئے تاکہ وہ کسی سمت بھاگنے نہ پائیں۔

احمد کو جب یقین ہو گیا کہ اس کے مقرر کیے ہوئے دستے اپنی اپنی گھات میں چلے گئے ہوں گے تو وہ پانچ سو سواروں کے ساتھ بستی کی طرف بڑھا۔

چمڑے کے خیموں پر مشتمل وہ بستی ایک وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ احمد جب اپنے سواروں کے ساتھ بستی میں داخل ہوا تو لوگ سراسیمہ سے ہو کر اپنے اپنے خیموں سے باہر نکل کر انہیں دیکھنے لگے تھے کیونکہ احمد اور اس کے ساتھی پوری طرح مسلح تھے جس سے بستی والوں کو خطرے کی بو آ رہی تھی۔ ایک خیمے کے سامنے احمد رک گیا اور وہاں کھڑے ایک بوڑھے کو مخاطب کر کے اس نے کہا۔" تمہارے سردار کا خیمہ کس طرف ہے۔ وہ میرا پرانا جاننے والا ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اس کے خیمے تک میری راہنمائی کرو گے۔ میں اس کے لیے ایک مفید اور اچھی خبر لے کر آیا ہوں"

احمد کی باتوں سے وہاں جمع ہونے والے لوگ مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں لہٰذا وہ دوبارہ اپنے اپنے خیموں کے اندر چلے گئے تھے۔ وہ بوڑھا چپ چاپ احمد کے گھوڑے کے آگے آگے چلنے لگا تھا۔ تھوڑی دور آگے جا کر احمد نے اس بوڑھے سے پوچھا۔" میں تمہارے سردار کا نام بھول گیا ہوں۔ کیا تم بتا سکو گے اس کا نام کیا ہے۔"

بوڑھے نے رک کر احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" اس کا نام قدیما ہے اور وہ ایک عرصہ سے ہمارا سردار چلا آ رہا ہے۔ اس نے اپنی کوششوں سے ہمیں خوش حال اور غم روزگار سے بے فکر کر دیا ہے۔"

ایک خیمے کے سامنے وہ بوڑھا رک گیا اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" یہی سردار قدیما کا خیمہ ہے۔" اتنی دیر میں ادھیڑ عمر کا ایک آدمی اس خیمے سے نکلا اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔" میرا ایک آدمی پہلے ہی مجھے بتا گیا ہے کہ تم مجھ سے ملنا

چاہتے ہو۔ بولو تم کون ہو اور کس غرض سے ہماری بستی میں داخل ہوئے ہو۔"

اس وقت رات خوب گہری ہو گئی تھی اور شمال کی طرف سے آنے والی تیز سرد ہواؤں سے خیمے کے پردے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ چاند کی چاندنی میں احمد نے دیکھا کہ بوڑھا سردار وہی تھا جس نے اس کے منہ پر کبھی طمانچہ مارا تھا اور اس کا چہرہ داغنے کا حکم دیا تھا۔ اس کی بھوری داڑھی اب سفید ہو گئی تھی اور جوانی بڑھاپے میں ڈھل گئی تھی۔

احمد نے اپنے چہرے سے خود کا نقاب ہٹایا اور اپنے بائیں گال کی طرف اشارہ کر کے اس نے پوچھا "کیا تم اس داغے ہوئے نشان کو پہچانتے ہو۔" قدیما نے بوکھلائی ہوئی آواز میں پوچھا "ایسی باتوں سے تمہارا کیا مطلب ہے۔" احمد نے کہا "کیا تمہیں خبر نہیں تم نے اپنے قزاق ساتھیوں کے ساتھ اس وقت ہم پر شب خون مارا جب میرا قبیلہ بنو کندہ یمن سے مصر کی طرف سفر کرتے ہوئے وادی شعیب میں خیمہ زن تھا۔ مجھے پہچانو، میں وہی ہوں جسے تو نے سرکش اور خونخوار جان کر اردبیہ شہر کے بادشاہ کسیلہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ میں مسلمان ہوں اور ایک جنگ میں کسیلہ کو بھی میں قتل کر چکا ہوں۔ اب تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی باری ہے۔ میں تم سے تمہارے گناہوں کا پورا پورا حساب لوں گا۔"

قدیما نے ایک طنزیہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اے اجنبی! یہ تیری بھول ہے تم صرف ان چند مٹھی بھر جوانوں کے ساتھ مجھ سے ٹکرانے چلے آئے ہو۔ اب بھی وقت ہے واپس لوٹ جاؤ۔ ورنہ میرے جنگجو تمہارے ان ساتھیوں کو لمحوں کے اندر زمین میں دفن کر کے ان کے کفن کی حرارت تک کو بجھا دیں گے۔"

احمد نے اپنی تلوار بے نیام کر لی اور اس کے ساتھ ہی اس کے جوان بھی اپنی تلواریں سونت چکے تھے۔ اپنے گھوڑے کو ذرا آگے بڑھاتے ہوئے احمد نے کہا۔ "اے بد اندیش! میرے ساتھ ایسے رفیقانِ سفر ہیں جو جلالِ حق کے مظہر اور رموزِ رب کے محرم بن کر تمہاری بستی پر نزول کریں گے اور ہمارا خوف اور تمہارے ساتھیوں کی چیخیں تمہارے کانوں میں اس طرح داخل ہوں گی جیسے سنسان راہوں پر ٹاپوں کی آوازیں گونجتی ہیں۔

قسم مجھے صاحبِ یٰسین وطٰہٰ کی تمہاری بستی کے چاروں طرف پھیلا ہوا میرا لشکر جب تمہاری بستی پر حملہ آور ہو گا تو تم ایسا محسوس کرو گے گویا ستاروں کی گردش رک گئی ہو۔ تمہارے ذہن کے دریچے بند ہو گئے ہوں اور زمین کی راہیں بے نشان اور دھندلی ہو گئی ہوں۔ جس طرح کبھی تو نے میرے قبیلے پر شب خون مارا تھا ایسے ہی، ہاں قدیما! ایسے ہی آج میں تیری بستی پر بھی لہو کی بارش کر دوں گا اور ان خیموں کے ہر طاق وطرم کو خون آلود کر دوں گا۔"

قدیما نے پھر ڈھٹائی سے کہا "میں تمہارے ان ہتھکنڈوں میں آنے والا نہیں۔ میں اس قدر جانتا ہوں جس طرح شجر بار آور تیز آندھی میں اپنے پھل گرا دیتا ہے ایسے ہی تیرے جوان بھی اس وقت زمین پر گر رہے ہوں گے جب میں اپنے جوانوں کو حملہ آور ہونے کا حکم دوں گا۔"

احمد نے فوراً اپنے پیچھے کھڑے دو سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے فوراً جلتی ہوئی ایک مشعل سے دو تیروں کو آگ دکھائی اور انہیں مشرق اور مغرب کے رخ پر ہوا میں چلا دیا۔ ان جلتے تیروں کا فضا میں بلند ہونا تھا کہ بستی کے تین اطراف میں اللہ اکبر کی گونج دار آوازیں بلند ہوئیں اور احمد کے ساتھی قزاقوں پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ احمد نے پلک جھپکنے میں تلوار مار کر قدیما کی گردن کاٹ دی اور پھر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بستی کے وسطی حصے پر حملہ آور ہو گیا تھا۔

قزاقوں نے اپنا دفاع کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ احمد کے طوفانی حملوں کے سامنے ناکام رہا۔ انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن مسلمان ان کا ایسا محاصرہ کر چکے تھے کہ وہ بھاگ بھی نہ سکے یہاں تک کہ احمد نے قزاقوں کے ہر فرد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ احمد نے ان کے خیمے اکھڑوا لیے اور ان کے اندر جمع شدہ اور کارآمد سامان ان ہی کے جانوروں پر لاد کر وہ شمال کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ جہاں جبلِ سینا کے دامن میں اس کا لشکر خیمہ زن تھا۔

احمد جب اپنے دو ہزار ساتھیوں اور سامان سے لدے ان گنت جانوروں کے ساتھ وادیٔ سینا میں پڑاؤ کیے اپنے لشکر میں داخل ہوا، اس وقت سردی سے بچنے کے لیے جگہ جگہ آگ کے الاؤ روشن تھے اور لشکر کے لیے کھانا بھی تیار ہو چکا تھا۔

آگ کے ایک الاؤ کے قریب لشکر کا سپہ سالار حسان بن نعمان کھڑا سامان سے لدے ان جانوروں کو خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات میں دیکھ رہا تھا جو احمد ان قزاقوں کو شکست دینے کے بعد اپنے ساتھ لایا تھا۔ اسی الاؤ کے پاس آکر احمد اپنے گھوڑے سے اُتر گیا جس کے پاس حسان کھڑا تھا۔

ایک سپاہی بھاگ کر آگے بڑھا اور احمد کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اسے ایک طرف لے گیا۔ لشکر کے سپاہیوں کی ایک خاصی تعداد فوراً حرکت میں آگئی اور وہ سامان کو جانوروں سے اُتار کر چمڑے کے خیموں میں منتقل کرنے لگے تھے۔ احمد جونہی الاؤ کے پاس آیا حسان نے فوراً آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اُمید نہ تھی تم اس قدر جلدی اس مہم سے لوٹ آؤ گے۔ میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔ تم مالِ غنیمت کے یہ جو جانور لے کر آئے ہو یہ بھی میری امیدوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ قزاقوں پر فتح ہماری ایک اچھی ابتدا ہے۔ احمد! احمد! یہ وہی وادیِ طویٰ ہے جس میں بنی اسرائیل پر من[1] وسلویٰ کا نزول ہوا تھا۔ اس وادی میں ہاتھ آنے والا یہ مالِ غنیمت ہم بھی اپنے رب کی طرف سے من وسلویٰ ہی سمجھیں گے۔"

احمد نے آگ سے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے ان سب رہزنوں اور قزاقوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ اس مالِ غنیمت میں کھانے کی اشیاء کے علاوہ نقدی اور دیگر قیمتی سامان بھی ہے۔ میں نے اپنے جوانوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ سارا سامان

---

[1] من سفید رنگ کے دھنیئے کے برابر دانے تھے جو وادی طویٰ میں اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل پر نازل کیے۔ بنی اسرائیل انہیں اکٹھا کر کے پیستے اور اس کی روٹیاں پکا کر کھاتے۔ بعد میں انہوں نے سلویٰ کی خواہش کی۔ سلویٰ ایک قسم کے پرندے تھے جو پانی کی طرف سے آتے تھے اور بنی اسرائیل انہیں پکڑ کر پکا لیتے تھے۔ بعد میں اس وادی کے اندر حضرت موسےٰ علیہ السلام نے اپنا عصا مارا اور بحکمِ ربی جس چٹان پر انہوں نے عصا مارا اس کے اندر سے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ نکلے تھے۔

علیحدہ علیحدہ کر کے رکھیں۔"

حسان نے مسکرا کر احمد کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "آؤ پہلے کھانا کھا لیں۔"

حسان احمد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے خیمے کی طرف لے جا رہا تھا۔

رات کے پچھلے پہر تک لشکر نے وادی طویٰ کے اندر ہی پڑاؤ کیے رکھا۔ فجر کی نماز سے کچھ دیر قبل حسان کے حکم پر پورا لشکر اُٹھ کھڑا ہوا اور کوچ کی تیاری شروع ہو گئی آناً فاناً خیمے اُکھاڑ کر تہہ کر دیئے گئے۔ سامان اونٹوں پر لاد دیا گیا۔ اس کے بعد لشکر نے فجر کی نماز ادا کی اور صبح کا کھانا کھانے کے بعد وہ وادی طویٰ سے کوچ کر رہا تھا۔

لشکر برق رفتاری سے آگے بڑھتا ہوا جس وقت دریائے نیل کو پار کر رہا تھا۔ کسی نے بلند آواز میں احمد کے قریب آکر کہا۔ "السلام علیکم یا امیر!"

احمد نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اس کا چھوٹا بھائی خصیب تھا جو اپنے گھوڑے کو بھگاتا ہوا احمد کے پہلو میں لے آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی احمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "خصیب! خصیب! تم کیسے ہو۔"

خصیب نے اپنا گھوڑا اور قریب لاتے ہوئے کہا "آپ کے سامنے ہوں دیکھ لیں۔ آپ میری توقعات سے کہیں پہلے لشکر لے کر لوٹ آئے ہیں۔ میں ایک بلند ٹیلے پر کھڑے ہو کر ہر روز لشکر کی راہ دیکھا کرتا تھا۔"

احمد نے پھر پوچھا۔ "تمہارے ماں باپ اور بھائی کیسے ہیں؟" خصیب نے مطمئن انداز میں کہا۔ "اخی احمد کے زندہ ہونے کا سن کر میرے ماں باپ بے حد خوش ہیں۔ کھیتی باڑی کا سارا کام اخی شیبان نے سنبھال رکھا ہے کہ میرے ابی سے اب کام نہیں ہوتا۔ سب گھر والوں کا آپ کے نام یہ پیغام ہے کہ آپ اخی احمد کو ہمیں جلدی تلاش کر کے دیں۔"

احمد جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ حسان نے اشارے سے احمد کو اپنی طرف بلایا۔ احمد نے مسکرا کر خصیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے امیر بلا رہے ہیں میں دیکھوں وہ کیا کہتے ہیں۔" احمد حسان کی طرف چلا گیا جو لشکر سے آگے آگے اس سے ذرا دائیں طرف تھا۔ خصیب

دوسرے سپاہیوں کے اندر گھل مل گیا تھا۔





برقہ شہر کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ آٹھ سپاہی بھی لشکر میں شامل ہو گئے تھے جنہیں احمد نے قرطاجنہ کی اسیری سے رہائی دلائی تھی۔ یہ سپاہی چونکہ پہلی جنگوں میں حصہ لینے کے باعث اکثر افریقی شہروں کے محلِ وقوع سے آشنا تھے۔ لہٰذا ان سے اب دشمن کی جاسوسی کا کام لیا جا رہا تھا۔

افریقی حکمرانوں کو بھی اسلامی لشکر کی آمد سے متعلق اطلاعات مل چکی تھیں اور انہوں نے ایک متحدہ لشکر ترتیب دیا تھا۔ جن میں رومن، فرانسیسی اور بربر شامل تھے۔ اس متحدہ لشکر میں کوہستان اوراس کی ساحرہ ملکہ جرارہ شامل نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کی انفرادی طاقت افریقہ کے اس متحدہ لشکر سے کہیں زیادہ تھی اور وہ کسی سے اتحاد کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے سحر کے زور سے چند ایسے محیّر العقول کام انجام دے چکی تھی کہ بربر اس کے بُت بنا کر اس کی پُوجا کرتے تھے۔ وہ بربروں میں اس قدر ہر دلعزیز اور مقبول تھی کہ اس کے ایک اشارے پر وہ اپنا گلا تک کٹوانے پر رضامند ہو جاتے تھے۔

اسی بنا پر وہ اپنے آپ کو ناقابلِ شکست سمجھتی تھی۔ اوّلاً تو اس کے سحر اور ثانیاً اس کی بے پناہ فوجی قوت کی بنا پر کوئی بھی حکمران اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ نہ ہی کسی نے آج تک اس پر حملہ آور ہونے کی جراُت کی تھی۔

گو وہ اپنی عمر کے اس حصّے میں تھی جہاں سے جوانی نشیب کی طرف بھاگنا شروع ہوتی ہے۔ اس کے باوجود وہ ایک حسین، پُرکشش اور سحر زدہ کر دینے والی عیار خوبصورت جاہ و جلال اور شاہانہ وقار رکھنے والی عورت تھی۔ وہ بربروں میں ایسے ہی ہر دلعزیز اور مقدس سمجھی جاتی تھی جیسے قدیم بُت پرست لوگوں میں عشروت دیوی کی پُوجا کی جاتی تھی۔

قرطاجنہ شہر سے بارہ میل جنوب مشرق میں جب کہ حسان اور احمد اپنے لشکر کے ساتھ برق رفتاری سے قرطاجنہ شہر کی طرف بڑھ رہے تھے ایک دم رُک گئے اور اپنے لشکر کو بھی انہوں نے اپنے پیچھے روک دیا تھا۔ لشکری فوراً حرکت میں آئے اور وہاں پڑاؤ کرنے لگے تھے۔ ان کے سامنے ریت کے ٹیلوں کے اندر دشمن بھی خیمہ زن تھا۔ شاید وہ صحرا کے اس حصّہ کو میدانِ جنگ بنانے کا عزم کر چکے تھے۔

حسان کو بھی اس کے جاسوس دشمن کے پڑاؤ کی خبر دے چکے تھے اسی لیے اس نے سیدھا دشمن کا رُخ کیا اور اس کے سامنے پڑاؤ کر لیا تھا۔ اس وقت شام ہونے کو تھی اور سورج مغرب میں خوب نیچے جُھک گیا تھا۔ دشمن کے لشکر میں آگ کے الاؤ روشن ہو گئے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ رات کے وقت جنگ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

مسلمانوں نے بھی خیمے نصب کرنے کے بعد اپنے لشکر میں الاؤ روشن کر لیے تھے اور کھانے کا انتظام ہونے لگا تھا۔ تاہم ہنگامی حالت سے نمٹنے کے لیے لشکر کے قلب اور میمنہ جنگ کرنے کے لیے پوری طرح مسلح اور تیار کھڑے تھے۔

حسان اور احمد کے خیمے جو بالکل قریب قریب تھے جب ان کے سامنے بھی آگ کا الاؤ روشن ہو گیا تو وہ دونوں بھی اپنے آپ کو گرم کرنے کے لیے اس الاؤ کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ ان کے دائیں بائیں قلب اور میمنہ جنگ کرنے کی حالت میں تیار کھڑے تھے۔ آگ پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے احمد نے حسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یا امیر! میر

ذہن میں تین ایسی ترکیبیں ہیں اگر ہم ان پر عمل کریں تو رات کے وقت ہم دشمن کے اچانک حملہ آور ہونے کے خطرے سے بھی بچ سکتے ہیں اور اگلے روز جنگ میں دشمن کو شکست کے آثار بھی پیدا ہو سکتے ہیں"۔

حسان نے بھی احمد سے قریب ہو کر آگ پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا "کہو اگر وہ قابلِ عمل ہوئیں تو میں انہیں اپنی تجویز پر ترجیح دوں گا"۔ احمد نے سرگوشی میں کہا "اولاً لشکر کے سامنے جگہ جگہ لمبی لمبی لکڑیاں نصب کی جائیں اور ان پر مشعلیں باندھ کر انہیں روشن کر دیا جائے تاکہ رات کے وقت اگر دشمن ہمیں دھوکہ دے کر ہم پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرے تو وہ پہرہ دینے والوں کو دور سے دکھائی دے سکے اور وہ بروقت ہمیں مطلع کر سکیں"۔

حسان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا "دشمن کے اچانک حملے سے بچنے کا یہ ایک نہایت معقول اور آسان طریقہ ہے۔ میں ابھی اس پر عمل کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ لکڑیاں ہمارے پاس کافی ہیں۔ اس کے علاوہ ہم منجنیقوں کی لکڑیاں بھی اس مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اب اپنی دوسری تجویز کہو"۔

احمد پہلے سے کہیں زیادہ رازداری میں کہہ رہا تھا "یا امیر! کم از کم پانچ سو ایسے تیر انداز چنے جائیں جن کا نشانہ بے خطا ہو۔ ان تیر اندازوں میں سے دو دو سو میدانِ جنگ کے دائیں اور بائیں ریت کے ٹیلوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ جائیں اور جب جنگ زوروں پر ہو تو یہ دشمن پر اندھا دھند تیر برسائیں اور انہیں چھلنی کر کے خوب نقصان پہنچائیں۔ اس وقت دشمن چونکہ سامنے کی سمت ہمارے ساتھ جنگ میں بری طرح مصروف ہو گا اس لیے اس نئی آفت پر وہ بدحواس ہو گا اور تیر اندازوں کے ہاتھوں نقصان اٹھائے گا۔ باقی سو تیر انداز دشمن کی پشت پر جا کر اپنی کمین گاہوں میں بیٹھ جائیں اور جب دائیں بائیں طرف والے تیر انداز اپنا کام شروع کریں وہ فی الفور دشمن کے پڑاؤ کے خیموں پر آتشی تیر برسائیں۔ ایسی صورت میں دشمن کے پڑاؤ میں آگ لگ جائے گی اور اس کے لڑنے کی صلاحیت بری طرح متاثر ہو گی لیکن شرط یہ ہے کہ یہ سب تیر انداز آج رات کے پچھلے پہر

اپنی اپنی مناسب جگہیں جا کر سنبھال لیں۔ حسان نے متاثر ہو کر احمد کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تمہاری دوسری تجویز بھی قابلِ قبول اور عمدہ ہے۔ اب تیسری کہو"۔

احمد پھر کہہ رہا تھا۔ کم از کم تین ہزار سوار اور علیحدہ کر کے رات کے وقت ہی اپنے لشکر کے بہت پیچھے بٹھا دیئے جائیں۔ جب جنگ اپنے عروج پر ہو تو یہ سوار اپنے گھوڑوں کو خوب سرپٹ دوڑاتے اللہ اکبر کی صدائیں بلند کرتے اور صحرا کے اندر دھول اڑاتے ہوئے ایک نیم دائرے کی صورت میں حملہ آور ہوں۔ اس سے دشمن یہ اندازہ لگائے گا کہ ہماری کمک آ رہی ہے اور شاید اس کے پیچھے کوئی اور لشکر بھی ہو اور دشمن کے سپاہی جنگ سے جی چرانے لگیں گے۔ دشمن کے دائیں بائیں اور پشت پر گھات میں بیٹھے ہوئے تیر انداز بھی اپنا کام اس وقت شروع کریں جب یہ تین ہزار سوار حملہ آور ہوں۔ اس کا ایک اور فائدہ بھی ہو گا۔ دشمن بھی اگر ہمارے خلاف ایسا ہی جال پھیلانے کی کوشش کرے تو یہ تین ہزار سوار اسے ناکام بنا دیں گے۔

یا امیر! آپ دیکھ رہے ہیں دشمن تعداد میں ہم سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اس لیے ہمیں ہر حالت میں اسے شکست دینا ہو گی۔ اس کے دور رس نتائج نکلیں گے۔ دونوں، فرانسیسیوں اور بربروں پر ہمارا رعب و خوف طاری ہو جائے گا اور مغرب کی طرف مزید پیش قدمی کرتے ہوئے ہمیں دشمن کی کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا"۔

حسان جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن خاموش رہا۔ کیونکہ ایک سپاہی ان دونوں کا کھانا لا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں وہیں آگ کے الاؤ کے پاس بیٹھے کھا کھا رہے تھے۔



دوسرے روز سورج طلوع ہوتے ہی دشمن کے لشکر میں جنگ کے طبل بجنے لگے تھے۔ جوانوں کا دل بہلانے کے لیے لشکر میں ذہین اور حسین فرانسیسی عورتیں بھی تھیں جو شفقیہ گیت گانے کے علاوہ اپنے سپاہیوں کو اپنی محبت اور قربت کا فریب دے کر جنگ کے لیے ابھار رہی تھیں۔ پڑاؤ کے خیموں کے اندر بھی کافی عورتیں تھیں جو لشکر

کے سپاہیوں کو جنگ کے دوران ہتھیار اور پانی فراہم کرنے پر مامور تھیں۔

ایک جنون اور طوفان تھا جو اس وقت قرطاجنہ کے اس لشکر میں برپا تھا۔ جس میں حسین کنواری لڑکیاں اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھیں۔

اسلامی لشکر میں کچھ جوان دفیں بجا بجا کر رزمیہ گیت گانے لگے تھے۔ دونوں لشکروں میں جنگ کے لیے صفیں درست ہونے لگی تھیں۔

حسان نے اپنے لشکر کے میمنہ اور میسرہ کو اپنے دو عمدہ اور کوہ شکن سالاروں کے حوالے کیا تھا اور احمد کو اس نے اپنے ساتھ قلب میں رکھا تھا۔ احمد کا چھوٹا بھائی خصیب بھی قلب میں تھا۔

تھوڑی دیر بعد میدان میں ایک رومن اُترا وہ ایک عمدہ نسل کے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے جسم پر زرہ، جوشن اور لوہے کے خول چمک رہے تھے اور اس کے سر پر پیتل کا مضبوط قلغی دار خود تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں سیدھے پھل کی تلوار اور بائیں ہاتھ میں ڈھال تھی۔ ایک فالتو ڈھال اس نے اپنی پشت پر لٹکا رکھی تھی۔ شاید ایسا اس نے اپنی پشت کو محفوظ کرنے کے لیے کیا تھا۔ اپنے گھوڑے کو بھگاتا، اسے کلیلیں کراتا اور کوئی قدیم اندلسی گیت گاتا ہوا وہ میدان میں اُترا۔ میدان کے وسط میں آکر اس نے اپنے گھوڑے کو چند ثانیوں تک ایک گول چکر کی صورت میں سرپٹ بھگایا پھر اس نے مقابلے کے لیے للکارا۔

احمد اپنا گھوڑا حسان کے قریب لایا اور وحشیانہ جوش میں اس نے کہا۔ "یا امیر! میدان میں اُترنے والا یہ رومن زیادہ دیر تک میدان میں اپنے گھوڑے سے کلیلیں نہ کرانے پائے۔ مجھے میدان میں اُترنے دیجئے کہ میں ان کے اندر ہی پل کر جوان ہوا ہوں۔ میں ان کے لڑنے کے ہر فریب اور اپنے مقابل پر قابو پانے کے ہر فند سے واقف ہوں۔

یاد رکھیئے امیر! یہ انفرادی مقابلہ دونوں لشکروں پر اثر انداز ہوگا۔ جو لشکر بھی انفرادی جنگ ہارے گا اس کے سپاہیوں کے حوصلوں پر ایک ضرب پڑے گی جب کہ جیتنے والے اور بیباک اور نڈر ہوں گے۔ مجھے میدان میں اُترنے کی اجازت دیجیئے"۔

یا امیر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، میں میدان میں مقابلے کے لیے للکارنے والے

اس رومن کو کسی بُت کی طرح توڑ کر لخت لخت کر دوں گا۔ میں آپ کو مایوس نہ کرونگا"۔

حسان نے اپنا گھوڑا اور قریب لاکر احمد کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے عزیز! میرے دوست! میرے بھائی! میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ تمہارے اس طوفانی جوش کی داد دیتا ہوں۔ جاؤ میں تمہیں اپنے رب کے حوالے کرتا ہوں"۔

احمد کا سر وہیں زین کے ہنے پر جھک گیا اور اس نے نہایت انکساری اور عاجزی سے پُرسوز آواز میں کہا۔ "اے خداوندِ قدوس و مہربان! بارگاہِ یثرب اور سعئ صفا و مروا کے طفیل اس جنگ میں مجھے کامران و سُرخرو رکھنا۔ اے اللہ! دشمن کے شر کے سامنے میرے بازوؤں کو مضبوط و محکم اور میرے جذبوں کو ثابت قدم و پرعزم رکھنا"۔

حسان بڑی عقیدت سے احمد کو دیکھ رہا تھا۔ احمد نے اپنی دُعا ختم کی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر وہ میدان میں اُتر گیا تھا۔

اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا احمد جب اس رومن کے سامنے گیا تو اس نے ایک بھرپور نگاہ احمد کے سراپا پر ڈالی اور پھر طنزاً اس نے کہا۔ "تمہارا لباس کیسا بوسیدہ، تمہارے ہتھیار کیسے منحنی اور تمہارا خود کیسا فرسودہ ہے۔ ہاں تمہارا گھوڑا خوب توانا اور منچلا ہے اور یہی وہ واحد شے ہے جس پر تمہاری موت کے بعد میں قبضہ کرنا پسند کروں گا۔ کیا تم ان ہتھیاروں سے میرے ساتھ جنگ کرنے آئے ہو"۔

احمد نے کھولتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جس طرح تمہارے ہتھیار، تمہاری زرہ اور خود چمکدار ہیں، ایسے ہی میرا جذبہ جنگ آوری روشن اور تاب دار ہے۔ جس طرح میرا لباس فرسودہ اور ہتھیار منحنی ہیں ایسے ہی تمہارا مقصد فرسودہ اور جنگ کرنے کا مدعا منحنی اور بے بنیاد ہے۔

یاد رکھو! میری تلوار وہ تلوار ہے جو کاٹنا جانتی ہے۔ میرے ترکش میں وہ تیر ہیں جو سینے میں پیوست ہونا جانتے ہیں۔ سنو! میری تلوار جب تم پر گھٹا بن کر برسے گی تو تم اپنے سامنے ہفت افلاک کے طوفان کھڑے دیکھو گے۔ اپنے گھوڑے کو آگے بڑھا کر مجھ پر حملہ کرو۔ میں تمہیں پہلے وار کرنے کا موقع دیتا ہوں۔ پھر دیکھنا کون کس کے گھوڑے

پر قابض ہوتا ہے "۔

رومن کسی سرکش گھوڑے کی طرح سیخ پا ہو گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر احمد پر حملہ کر دیا تھا۔ پے در پے کئی وار اس نے احمد پر کر دیئے تھے لیکن احمد اس کے ہر حملے کو اپنی ڈھال پر روک چکا تھا۔ کچھ دیر تک رومن احمد پر چھایا رہا اور احمد نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو صرف اس کے وار روکنے تک محدود کر لیا تھا۔ رومن کا حوصلہ احمد کے اس طرزِ عمل سے بڑھ گیا تھا اور وہ اپنے گھوڑے کو دائیں بائیں لا کر ہر طرف سے حملہ آور ہو رہا تھا۔

رومن کو جہاں ایک طرف یہ اطمینان تھا کہ وہ بدو اور کھلی آستینوں والا عرب حملہ آور ہونے کے بجائے دفاع تک محدود ہے وہاں اسے یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ وہ بڑی مہارت اور سبک دستی کے ساتھ اس کے ہر حملے کا صحیح اور مناسب دفاع کر رہا تھا تاہم وہ مطمئن بھی تھا کہ حالات و واقعات کا دھارا اس کے حق میں تھا۔ لیکن جلد ہی یہ کیفیت بھی بدل گئی۔

کچھ دیر تک رومن کے خطرناک وار اپنی ڈھال پر روکتے روکتے احمد نے ایک موقع پر اپنے گھوڑے کو تھوڑا سا پیچھے ہٹایا۔ چمڑے کی باگ کو ایک سخت جھٹکا دے کر اس نے گھوڑے کو اپنے پاؤں پر کھڑے کھڑے بڑی تیزی کے ساتھ ایک گول چکر میں گھمایا پھر اس رومن کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سمندر کی سرگوشی سے مشابہ آواز میں کہا۔

" اے ہوس کے سوداگر! میں نے تجھے اپنا ہر حربہ آزمانے کا پورا موقع دیا لیکن تو کچھ نہ کر سکا۔ دیکھ اب میں تیرے پگھلنے کا عمل شروع کرتا ہوں۔ اب تو اپنے جہل فکر اور تنگنائے خیال سے باہر نکل کہ میں تیرے ہجر کی سیاہ رات جیسے افسوسناک باب کی ابتدا کرتا ہوں "۔

احمد کی رگیں تن گئی تھیں۔ اس کا چہرہ شرخو اور تلوار کے دستے پر اس کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ ایک دم احمد نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھایا اور

رومن کے سامنے آ کر وہ سرکش آندھی اور وقت کے بے پناہ سیل کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

رومن کے حلق سے ایک اضطراری چیخ سی نکل گئی کیونکہ احمد ایسی تیزی کے ساتھ اور ایسا قہر آلود ہو کر حملہ آور ہوا تھا جیسے وہ صحرا چیخ اٹھے گا۔ پہاڑ چلا اٹھیں گے اور رومن کو وہ وقت کے غبار اور زمانے کی دھول میں دفن کر دے گا۔ رومن کے دفاع کا انداز تاسف انگیز تھا۔ وہ امید بھی نہ کر سکتا تھا کہ کھلی آستینوں اور بوسیدہ ہتھیاروں والا وہ عرب ایسی خطرناک، ایسی وحشت انگیز صورت بھی اختیار کر سکتا تھا۔ وہ اپنے سامنے زمین کو لرزہ بر اندام اور اپنی ہر کوشش اور سعی کو دھول میں بکھرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

رومن اپنے پراگندہ ذہن کے ساتھ سوچوں میں گم تھا کہ احمد کی تلوار اس قدر سختی اور قوت کے ساتھ اس کی ڈھال پر گری کہ وہاں سے پھسل کر اس کے شانے پر لگی اور زرہ کی کتنی کڑیاں کاٹنے کے بعد اسے ایک گہرا گھاؤ لگاتی چلی گئی تھی۔ درد کی شدت کے باعث رومن ذرا سا جھک گیا تھا اور وقت اس کے خلاف فیصلہ دے چکا تھا۔ اتنی دیر تک احمد نے دوسرا وار بھی کر دیا تھا۔ رومن نے اپنا آپ بچانے کی خاطر ڈھال آگے کر کے وار کو روکنا چاہا لیکن وہ ناکام رہا۔ احمد اپنی تلوار کو ایک دم اپنے بائیں شانے پر لے گیا اور وہاں سے لہرا کر اس نے اپنی تلوار رومن کے دوسرے شانے پر گرا دی تھی۔ رومن کے دوسرے شانے سے بھی زرہ کی کڑیاں کٹ گئیں اور احمد کی تلوار اسے ایک گہرا زخم دیتی ہوئی نکل گئی تھی۔

رومن کا تلوار والا ہاتھ لٹک گیا تھا۔ اس کا سر زین کے ہنے پر جھک گیا تھا۔ اور اس کے بائیں ہاتھ سے اس کی ڈھال زمین پر گر گئی تھی۔ احمد نے فوراً اپنے گھوڑے کو اس سے قریب کیا۔ اپنی تلوار اور ڈھال اس نے دونوں بائیں ہاتھ میں لے لیں۔ دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر اس نے رومن کو اس کی چمڑے کی اس پیٹی سے پکڑ لیا جو اس کی تلوار اور خنجر لٹکانے کے لیے تھی۔

ایک جھٹکے کے ساتھ احمد نے رومن کو اٹھایا اور اپنے سر کے اوپر سے گھما کر پوری قوت سے ریت پر پٹخ دیا۔ خود بھی وہ گھوڑے سے کود گیا۔ رومن کے قریب آیا

اور اپنی تلوار لہراتے ہوئے کہا۔ "اے فرزندِ ابلیس! تو اپنے کن اعمال اور کن روایات کی بنا پر میرے ہتھیاروں کو فرسودہ اور منحنی کہہ رہا تھا۔ دیکھ! میری اسی خمدار تلوار نے تیرے غرور میں اکڑے ہوئے سر کو کیسا زمین بوس کر دیا۔ شیطان کے گماشتے! میرا تعلق اس قوم سے ہے جو محبت میں ریشم اور جنگ میں کوہسار ہے۔ جو دوست کے لیے نرم اور دشمن کے لیے رزم ہے۔ اگر تجھ میں سکت ہو، اگر تو میرے سامنے ثابت و محکم رہنے کی استطاعت رکھتا ہو تو اُٹھ، پھر میرا مقابلہ کر کے دیکھ۔ اگر تو اپنے گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا ہے۔ تو میں تجھے اس پر سوار ہونے میں مدد دے سکتا ہوں تاکہ تو یہ نہ کہے کہ مجھے مقابلے کا پورا موقع نہ دیا گیا تھا۔"

رومن بے سُدھ پڑا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ احمد نے تلوار لہرائی اور اس کی گردن کاٹ دی پھر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے لشکر کی طرف جا رہا تھا۔

انفرادی جنگ کے ختم ہوتے ہی قرطاجنہ کے متحدہ لشکر نے آگے بڑھ کر اسلامی لشکر پر حملہ کر دیا تھا۔ خاک و خون کا ایک طوفان تھا جو افریقہ کے اس صحرا میں چاروں طرف اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ گھوڑے ہنہناتے ہوئے اپنے سواروں سمیت ریت پر گر رہے تھے۔ تلواریں برس رہی تھیں۔ ڈھالیں اُبھر ڈوب رہی تھیں۔ مرنے والوں کی دِلدوز چیخیں اور زخمی ہونے والوں کی آہ و پکار۔ تلوار کی جھنکار، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، ڈھالوں کے ٹکرانے کی آوازوں اور اسلامی لشکر سے اُٹھنے والی اللہ اکبر کی صداؤں میں ڈوب کر رہ گئی تھیں۔

قرطاجنہ کا لشکر گو تعداد میں کئی گنا زیادہ تھا اس کے باوجود مسلمانوں نے ان کے حملے کو روک کر انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ رومنوں کی خنجر نما سیدھی تلواریں اور مستطیل ڈھالیں کھلی آستینوں والے عربوں کی خمدار لمبی بھاری تلواروں اور گول ہلکی پھلکی ڈھالوں کے سامنے ناکام اور ناکافی ثابت ہو رہی تھیں۔

مسلمانوں کے میمنہ اور میسرہ نے دشمن کے گرد ایک ہالہ سا بنا لیا تھا جب کہ حسان

اور احمد لشکر کے قلب کے ساتھ دشمن کے اندر تک یُوں گھُس گئے تھے جیسے برف کے کسی ڈھیر میں خنجر گھونپ دیا گیا ہو۔

جنگ جب اپنے شباب اور عروج پر تھی اچانک رات کے وقت گھات میں بیٹھے ہوئے تین ہزار مسلمان سوار اپنے لشکر کی پُشت پر نمودار ہوئے پھر وہ اللہ اکبر کی فلک شگاف آوازیں بلند کرتے اور اپنے گھوڑوں کو ایڑ پر ایڑ لگا کر سرپٹ دوڑاتے ہوئے ایک کھلے اور نیم دائرے کی شکل میں میدان جنگ کی طرف بڑھے تھے۔ وہ اس قدر پھیل کر اور ایسے انداز میں دھول اُڑاتے آ رہے تھے کہ محسوس ہوتا تھا ایک بہت بڑا لشکر مسلمانوں کی کمک کے طور پر پہنچ گیا ہو۔

اپنے ان ساتھیوں کی آمد پر مسلمانوں میں اور زیادہ جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ اور پہلے کی نسبت وہ اور زیادہ برق رفتار ہو کر لڑنے لگے تھے۔ ان تین ہزار جوانوں کی آمد کے ساتھ ہی قرطاجنہ کے لشکر کے دائیں اور بائیں جو دو دو سو مسلمان تیر انداز رات کے وقت ہی بٹھا دیئے گئے تھے اُنہوں نے دشمن پر اپنے زہریلے تیروں کی تیز بوچھاڑیں مارنا شروع کر دی تھیں، اس سے دشمن کے ان گنت سپاہی چھد کر رہ گئے اور ان کے شمالی اور جنوبی حِصّوں میں ان تیراندازوں کے باعث ایک کھلبلی اور ہراس پھیل گیا تھا۔ اور اس وقت دشمن کے اوسان خطا ہو گئے جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے پڑاؤ کے خیموں میں آگ لگ گئی ہے کیونکہ احمد کی تجویز پر حسان نے جو سو تیر انداز اس کام کے لیے منتخب کیے تھے اُنہوں نے آتشی تیر برسا کر دشمن کے پڑاؤ میں آگ لگا دی تھی۔

دشمن کے لشکر میں ہر سو ایک افراتفری کا عالم برپا ہو گیا تھا۔ آگ لگے خیموں کے اندر سے ان کی عورتیں نکل نکل کر واویلا کرتی ہوئی باہر بھاگ رہی تھیں۔ مسلمانوں نے دشمن کی اس گھبراہٹ اور اضطراب سے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی پوری قوت و رفتار کے ساتھ انہوں نے رومنوں، فرانسیسیوں، اندلسیوں اور بربروں کا قتلِ عام شروع کر دیا تھا۔ اس حالت میں دشمن زیادہ دیر تک میدانِ جنگ میں جم کر نہ لڑ سکے لہٰذا ان کا لشکر پسپا ہونا شروع ہو گیا۔ مسلمانوں نے جب اور زیادہ زور ڈالا تو وہ متحدہ لشکر قرطاجنہ شہر کی طرف بھاگ کھڑا

نوا۔ مسلمان انہیں مارتے کاٹتے ہوئے تعاقب میں لگ گئے۔ یہاں تک کہ شہر میں گھس کر قلعہ بند ہو گیا تھا۔

حسان اور احمد لشکر کو واپس اس جگہ لائے جہاں جنگ ہوئی تھی۔ صحرا کے اندر دشمن کی لاشیں دور دور تک بکھری ہوئی تھیں۔ جلے ہوئے خیموں کے قریب اس خوراک کے سامان اور ہتھیاروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جو دشمن چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔

لشکر کے سپاہی ریت پر بیٹھ کر اپنے ہتھیار صاف کرنے لگے تھے جب کہ حسان اور احمد دشمن کے سامان کا جائزہ لے رہے تھے۔ سامان کے اندر ایک جگہ حسان رک گیا اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا "حشم کے بیٹے! تو نے دیکھا ہمارے رب کی برکتیں اور سماوی نعمتیں کس طرح ہمارا ساتھ دے رہی ہیں اور وہ دشمن جو اس بیابان کے صحرا میں آگ اور خون کا وحشت بدوش کھیل کھیلنے آیا تھا اپنے ظلم و جور کی فوج سیاہ بخت کے ساتھ بھاگ کر اب قلعہ بند ہو گیا ہے۔

احمد! احمد! قسم مجھے بدر کے مقدس میدان اور احد کی متبرک چٹانوں کی، خدا کو تعصب، گھمنڈ، عجب و استکبار اور غرور و فخر پسند نہیں ہے۔ اگر ہم اسی طرح نسلی تفاخر اور گروہی عصبیت سے پاک ہو کر دل سلیم، اتحاد و عمل اور عزم صمیم کے ساتھ اپنے رب کی راہ میں جہاد کرتے رہیں تو وہ ہر میدان میں ہمیں اسی طرح تابناکی و درخشندگی بخشتا رہے گا۔

حسان چند ثانیے رکا پھر اپنے سامنے بکھرے ہوئے دشمن کے شراب کے برتنوں میں سے ایک کو اپنے پاؤں کی سخت ٹھوکر مارتے ہوئے اس نے پھر کہا "احمد! احمد! یہ مادی لذتیں انسانی زندگی کی معراج نہیں ہیں۔ ایسی سفلی خواہشات اور بدی کی محرک اشیاء انسان کے فکر و کردار کی ترتیب کو منتشر کر دیتی ہیں اور ابن آدم اپنے خمیر کے اصل تشخص اور وجود سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

حسان نے ذرا رک کر پھر کہا "احمد! احمد! میرے دوست! میرے عزیز! آؤ دونوں مل کر عہد کریں کہ ہم اپنے مذہب اور ملت کی خدمت کرتے ہوئے اپنی

عزیمت کو کمزور اور اپنی ہمتوں کو پست نہ ہونے دیں گے۔"

احمد نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یا امیر! میں اپنی منزل اور سمت کا احساس کیے بغیر ان صحراؤں کے اندر اپنی پوری استقامت کے ساتھ آپ کا ساتھ دیتا رہوں گا۔"

حسان نے احمد کا بڑھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پر جوش مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "لاریب تم ایک لانہایت دور اندیش دوست اور ایک بے کراں پرخلوص بھائی ہو میں ہمیشہ تمہاری تجویزوں کی قدر اور شجاعت کی تعریف کرتا رہوں گا۔"

دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پھر سامان کا جائزہ لینے لگے تھے۔ سورج اب غروب ہو چکا تھا اور فضاؤں میں گمبھیر سناٹے کی ابتدا ہونے لگی تھی۔ لشکر کے خیموں میں آگ کے الاؤ روشن ہو گئے تھے اور کھانا تیار ہونے لگا تھا۔ اتنے میں لشکر کے اندر مغرب کی اذان کی آواز سنائی دی۔ لہٰذا وہ دونوں بھی دشمن کے جلے ہوئے خیموں کے شہر سے نکل کر اپنے لشکر کی طرف جا رہے تھے۔ میمنہ اور میسرہ کے دونوں سالاروں کے علاوہ وہ چند سپاہی بھی جو ان کے ساتھ تھے اپنے گھوڑوں پر سوار ان کے پیچھے ہو لیے تھے۔



رات اپنے سارے مجروح و حرماں نصیب اور درماندہ و فرو ماندہ جذبوں کے ساتھ نازل ہوئی تھی۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے اور سینہ شب میں ان کی آوازوں کی بازگشت فضاؤں کے اندر سلگتی خوشبوؤں کا سا سماں باندھنے لگی تھیں۔ لحد کی طرح تاریک اور ویران رات میں تھوڑی دیر بعد چاند افق سے جھانکتے ہوئے نمودار ہوا تھا۔ ہر سو چاندنی کا دریا بہہ نکلا تھا اور عمیق راتوں کے ترجمان ستارے نیلے آسمان پر مسکراتے ہوئے گہری رات کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

زیوس، ارتمیس اور ہرمس تینوں چٹائی پر آتش دان کے پاس بیٹھے تھے کہ زیوس نے ارتمیس اور ہرمس کو مخاطب کر کے کہا "میرے بچو! ہم مسلمانوں کا مستقبل ان اندھے صحراؤں کے اندر اب پہلے جیسا تاریک نہیں رہا۔ عنقریب وہ وقت آ رہا

ہے کہ ہم کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کر سکیں اور فخریہ طور پر لوگوں سے برملا یہ کہہ سکیں کہ ہم مسلمان ہیں ۔ حالات کی درشتی اور تلخی اب مٹ جائے گی ۔ صحرا کا یہ حصّہ اب ہمارے لیے غمگسار باپ کی طرح مہربان اور آغوشِ مادر جیسا پُرسکون ہو گا۔"

ارتمیس نے بڑی آس و امید میں پوچھا ۔" بابا ! بابا ! کیا ہمارے اس لشکر میں احمد بھی شریک ہوں گے جس نے قرطاجنہ کے اس متحدہ لشکر کو ذلت آمیز شکست دی ہے "۔

زیوس نے گہری سوچوں میں ڈوبتے ہوئے کہا ۔" ارتمیس ! ارتمیس ! میرا دل کہتا ہے یہ لشکر احمد ہی لے کر آیا ہے ۔" پھر زیوس نے ارتمیس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ۔" میری بچّی ! یہ خیال نہ کرنا کہ میں احمد کے متعلق تمہارے جذبات سے بے خبر ہوں ۔ گو اس نے اس گھر میں صرف دو یوم ہی ایک مسافر بے وطن کی حیثیت سے قیام کیا تھا لیکن جن حالات میں وہ یہاں ٹھہرا ان کے باعث تمہاری اس سے ہمدردی اور تمہارا اس برگزیدہ مسافر کی طرف جھکاؤ کوئی غیر متوقع نہیں ہے ۔ اب کی بار وہ یہاں آیا تو میں اس سے تمہارے متعلق ضرور گفتگو کروں گا ۔"

احمد سے منسوب کیے جانے پر ارتمیس کی حیا آلود پلکیں جھک گئی تھیں ۔ اس کے چہرے پر زندگی کا ایسا بھرپور خمار تھا جیسے کسی برگِ گل پر لہو کی تازہ لکیر ۔ وہ دھڑکتی یادوں اور تصورات کی صبحِ کاذب میں کھو گئی تھی ۔ اس کے گل گوں لب لرزیدہ تھے لیکن وہ خاموش تھی ۔ زیوس کی کسی بات کا اس نے جواب نہ دیا تھا ۔ شاید خوشی کے ایسے سندیس پر وہ اپنی گویائی پر جادہ اور وقت کی لگام پر قابو نہ رکھ سکی تھی ۔

زیوس کی آواز پھر کمرے کے گمبھیر سناٹے میں بلند ہوئی ۔" ارتمیس ! ارتمیس ! میں تمہیں —— زیوس کہتے کہتے رُک گیا ۔ کیوں کہ گھر کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی تھی ۔ ارتمیس نے چونک کر زیوس کی طرف دیکھتے ہوئے ۔" بابا ! رات کے اس وقت ہمارے گھر کے دروازے پر کون دستک دے سکتا ہے ۔ ہرمس نے پہلی بار بولتے ہوئے کہا ۔" کیا ایسا ممکن نہیں کہ احمد بھائی اس لشکر میں شامل ہوں اور اب جنگ سے

فارغ ہو کر ہمیں ملنے آئے ہوں"

زیوس نے کسی قدر مسکراتے ہوئے کہا ۔" تمہارا اندازہ درست ہے بیٹے ! میرا دل کہتا ہے دستک دینے والا احمد کے سوا کوئی اور نہیں ۔ اتنی دیر میں پھر دروازے پر دستک ہوئی ۔ ہرمس اپنی جگہ سے اُچھلتا ہوا بولا " میں دیکھتا ہوں کون ہے "۔ زیوس بھی اُٹھ کھڑا ہوا ۔" چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں"۔

کمرے سے باہر نکلتے نکلتے زیوس نے مڑ کر ارتمیس کی طرف دیکھا پھر پیار سے کہا ۔" ارتمیس ! ارتمیس ! آتش دان میں اور لکڑیاں ڈال دو ۔ باہر تیز خنک ہوائیں چل رہی ہیں وہ سردی محسوس کر رہا ہو گا ۔ زیوس باہر نکل گیا ۔ ارتمیس اپنی خوشیوں کو دباتی ہوئی اُٹھی اور آتش میں اور لکڑیاں ڈال کر وہ آگ کو بھڑکانے کی کوشش کرنے لگی تھی ۔

ہرمس نے جب دروازہ کھولا تو باہر احمد اپنی سیاہ گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا ۔ یہ وہی گھوڑا تھا جو ارتمیس نے اسے دیا تھا ۔ ہرمس بھاگ کر احمد سے لپٹتا ہوا بولا "آپ کیسے ہیں میرے بھائی !"

احمد جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ زیوس آگیا اور وہ بھی مصافحہ کرنے کے بجائے احمد کو اپنے ساتھ لپٹا رہا تھا ۔ ہرمس گھوڑے کی باگ پکڑ کر اپنے چھپّر نما اصطبل کی طرف لے گیا ۔ زیوس نے گھر کا دروازہ بند کیا اور احمد کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ۔" آؤ اندر چلیں ۔ بیٹے ! باہر بہت سردی ہو رہی ہے "۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی احمد کی نگاہ جب آتش دان کے پاس کھڑی ارتمیس پر پڑی تو اس نے محبت اور حلاوت بھرے لہجے میں پوچھا ۔" ارتمیس ! ارتمیس ! تم کیسی ہو۔"

ارتمیس احمد کی اس اچانک آمد پر کوئی جواب نہ دے سکی وہ ساکت و صامت ایستادہ کھڑی تھی ۔ احمد کے آنے پر اس کی رُوح پر ایک غیر فانی نشہ ، ذہن پر ایک وجدانی کیفیت اور دل کے سکون زاروں پر کہکشاں جیسی خوش کُن پرچھائیاں طاری ہو گئی تھیں وہ بچاری منہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکی ۔ اندر ہی اندر کسی طوفانی کوہی ندی اور نغمہ بار آبجو کی طرح خوش ہوتی رہی ۔ وہ اس وقت چونکی جب زیوس نے اس سے کہا ۔ ارتمیس ! ارتمیس !

"بیٹی! بیٹی! تم خاموش ہو۔ جب کہ احمد نے تم سے کچھ پوچھا ہے"۔

ارتمیس فوراً سنبھلی جس طرح عروسِ سحر گھونگھٹ اُٹھا کر روشنی کے استقبال میں مسکراتی ہے۔ ایسے ہی انداز میں پہلے اس نے گردن اُٹھا کر احمد کی طرف دیکھا پھر رُوح کے اندر دِھیرے دھیرے ترنم پیدا کر دینے والی اپنی آواز میں اس نے کہا۔ "میں ٹھیک ہوں"۔

احمد اور زیوس آگے بڑھ کر آتش دان کے پاس چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ارتمیس نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آپ کو بھوک لگی ہوگی۔ میں آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں۔ احمد نے آگ پر ہاتھ گرم کرتے ہوئے کہا۔ "میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ میرا لشکر یہاں سے قریب ہی ہے"۔

ارتمیس باہر نکلتی ہوئی بولی۔ "میں ابھی آتی ہوں"۔ اتنی دیر میں ہرمس کمرے میں داخل ہوا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی خرجین اس نے احمد کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ یہ آپ کے گھوڑے کی خرجین ہے اس میں آپ کا سامان بھرا ہوا ہے۔ زیوس بھی آگے بڑھ کر آتش دان کے پاس چٹائی پر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ فوراً آگ پر پھیلاتے ہوئے اس نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج تو باہر بہت سردی ہو رہی ہے"۔

احمد کچھ کہنے والا تھا کہ ارتمیس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں گرم گرم دودھ سے بھرا ہوا مٹی کا ایک بڑا سا پیالہ تھا۔ قریب آ کر وہ احمد کے اُوپر جھکی اور دودھ کا وہ پیالہ جو اس کے ہاتھوں میں تھا احمد کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ لیجئے"۔ احمد نے دیکھا۔ ارتمیس کی گدرائی کلائیاں کپکپا رہی تھیں اور اس کی سانسوں کی خوشبو احمد کے اندر حلول کر رہی تھی۔

احمد نے چونکتے ہوئے کہا۔ "مجھے اکیلے دُودھ پیتے ہوئے شرم نہ آئے گی۔ بابا اور بھائی کو بھی تو دو"۔ ارتمیس نے اپنا آپ سمیٹتے اور دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بابا اور بھائی دونوں پی چکے ہیں"۔

زیوس نے بھی کہا۔ "تم پیو بیٹے! حقیقت ہے کہ تمہاری آمد سے تھوڑی دیر قبل ہم تینوں آگ کے پاس بیٹھ کر دُودھ پی چکے ہیں"۔ احمد نے پیالہ لے کر دُودھ پی لیا۔

خالی پیالہ ارتمیس نے لے کر ایک طرف رکھ دیا اور وہ بھی اس کے پاس چٹائی پر بیٹھ گئی تھی۔

چند لمحوں تک کمرے میں خاموشی طاری رہی پھر زیوس نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "احمد! احمد! میں تمہیں اسلامی لشکر کی فتح پر مبارک باد دیتا ہوں۔ ہمیں خبر نہ تھی تم بھی اس لشکر میں شامل ہو گے۔ تمہارے آنے سے قبل ارتمیس مجھ سے تمہارے متعلق ہی گفتگو کر رہی تھی۔ اب تم آئے ہو تو کچھ روز یہاں قیام کرو گے نا؟"

احمد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "نہیں، میں اپنے امیر سے تھوڑی دیر کی اجازت لے کر آیا ہوں۔ میرا لشکر میں رہنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کل ہم قرطاجنہ شہر کا محاصرہ بھی کر رہے ہیں اور اس کے لیئے ہمیں اپنی کچھ تیاریاں بھی مکمل کرنا ہوں گی۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک رات یہاں رک سکتا ہوں۔ وہ بھی رات کے پچھلے حصے میں مجھے یہاں سے کوچ کرنا ہوگا اور فجر کی نماز مجھے اپنے لشکر کے اندر ادا کرنا ہوگی"۔

زیوس نے دِلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارے امیر کا کیا نام ہے؟" احمد نے آگے کھسک کر اور زیادہ آگ کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "میرے امیر کا نام حسان بن نعمان غسانی ہے۔ وہ بلا کا جری، ہمدرد اور نیک خُو انسان ہے۔ زیوس نے پھر پوچھا۔ "لشکر میں تمہاری حیثیت کیا ہے بیٹے!"

احمد نے جھٹ کہہ دیا۔ "میں لشکر میں اپنے امیر کا نائب ہوں۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میرے ماں باپ اور بھائی بھی مجھے مل گئے ہیں۔ ارتمیس نے خوشی سے چلاتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں اور کس طرح؟" جواب میں احمد انہیں اپنے چھوٹے بھائی خصیب سے ملاقات اور اپنے گھر جانے کے سارے واقعات تفصیل سے سنا رہا تھا۔

احمد جب خاموش ہُوا تو زیوس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ "چھوٹے بھائی کی شادی تو ہو گئی اب تم اپنی شادی کب کرو گے"۔ احمد نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں نے ابھی اس کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ جب ایسا کوئی وقت آیا تو میں اس سلسلے میں آپ سے ضرور بات کروں گا"۔

"زیوس نے کہا۔ "احمد! احمد! جوانی ایک ایسا سہانا خواب ہے جو جس قدر طویل

ہوگا اسی قدر انسانی فکر و کردار کی ترتیب ۔ قلب و نظر کی تطہیر اور رُوح و ذہن کی عزیمت و استقامت بِکھرتی اور منتشر ہوتی چلی جائے گی ۔ بیٹے ! اگر تم مجھ پر اس قدر ہی بھروسہ کرتے ہو تو جب تم شادی کے متعلق سوچو، تم اپنی ان سوچوں میں میرے اس چھوٹے سے گھر کو بھی ذہن میں رکھنا ۔"

احمد نے زیوس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا ۔" میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا ۔" زیوس ہلکی ہلکی آواز میں کہہ رہا تھا ۔" احمد بیٹے ! میں بھی ایک جوان بیٹی کا باپ ہوں، اگر تم پسند کرو تو میں ارتمیس کو تم سے بیاہ دوں گا ۔" قریب بیٹھی ہوئی ارتمیس کی گردن جھک گئی اور اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی ۔ ہرمس ارتمیس کی طرف دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا ۔

احمد نے گردن جھکائے ہوئے بھاری آواز میں کہا ۔" میں ان بے کنار صحراؤں کے اندر ایک مجبور اسیرِ زنداں اور پابجولاں مجرم کی طرح پل کر جوان ہوا ہوں اگر آپ مجھے اس قابل سمجھیں گے تو میں اسے اپنے لیے ایک سعادت اور نیک فال تصوّر کروں گا ۔ ایں آپ کے اعتماد کو ٹھیس اور بھروسے کو دھوکہ نہ دوں گا ۔"

زیوس نے بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔" گو تم پر میرا کوئی دباؤ اور حق نہ تھا پھر بھی تم نے میرے ساتھ بہترین انصاف کیا ہے ۔ سنو بیٹے ! آج سے ارتمیس تمہاری ہے تم جب چاہو شادی کر سکتے ہو ۔ میں اپنی یہ ذمہ داری پوری کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہوں گا ۔"

احمد نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ گہری سوچوں میں ڈوب گیا تھا ۔ زیوس نے پوچھا ۔" تم کہاں کھو گئے ہو بیٹا ! احمد نے چونکتے ہوئے کہا ۔" میں سوچ رہا ہوں ۔ یہ کوئی پُراسرار خواب ہے یا کربناک بیداری مجھے [illegible] نہ تھی کہ حالات اس قدر جلد میرے حق میں ایک خوشگوار کروٹ لے جائیں گے ۔"

زیوس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ۔" کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عقل کچھ اور چاہتی ہے جب کہ فطرت کسی اور امر کا مطالبہ کر رہی ہوتی ہے ۔ بیٹے !

اب تم ان صحراؤں میں یکتا و تنہا نہیں ہو ۔ یہ گھر تمہارا ہے ۔ جب آؤ اس کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہوں گے ۔"

تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں خاموشی رہی ۔ اس دوران حسین و خوبرو ارتمیس کبھی کبھی اپنی حیا آلود پلکیں اُٹھا کر احمد کو دیکھ لیتی تھی ۔ اس کی گردن ابھی تک جھکی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر ایسی شادمانی تھی جیسے صاف ستھرے آسمان نے نجوم و کہکشاں کا لبادہ اوڑھ لیا ہو ۔

زیوس نے پھر احمد سے پوچھا ۔" تم نے اس صحرا کے اندر ہونے والی جنگ کے متعلق ہمیں کچھ نہیں بتایا ۔" اور جواب میں احمد انہیں شروع سے لے کر آخر تک جنگ کے مشاہدات سنا رہا تھا ۔ جب وہ خاموش ہوا تو زیوس نے پوچھا ۔" تم کس وقت یہاں سے روانہ ہونا پسند کرو گے بیٹے ! احمد نے اپنے سر سے خود اُتار کر اپنے قریب رکھتے ہوئے کہا ۔" میں رات کے پچھلے حصّے میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا فجر کی نماز اپنے لشکر میں جا کر ادا کروں گا ۔"

زیوس نے شفقت سے کہا ۔" تو پھر تم اُٹھ کر آرام کرو بیٹے ! ارتمیس تمہیں جگا دے گی ۔" زیوس نے مڑ کر ارتمیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔" ارتمیس ! ارتمیس ! اٹھو بیٹی ! بستر لگا دو ۔" ارتمیس سنبھل کر اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ جلدی جلدی اس نے بستر لگا دیئے اور تھوڑی دیر بعد وہ چاروں چٹائیوں پر آتش دان کے قریب گہری نیند سو رہے تھے ۔



شب اپنی آخری ساعتوں کی طرف بھاگ رہی تھی ۔ ستارے ریگِ وقت میں کسی قافلۂ بے نوا کی طرح عزم سفر تھے ۔ کہکشاں شامِ غم کی طرح دھواں دھواں سی ہو کر از افق تا افق بکھر گئی تھی ۔ رات چاندنی تھی ۔ سرما کے مارے بے برگ و بار درخت سرنگوں اور خاموش کھڑے تھے ۔ سینۂ مہتاب سے جیسے زمین پر رنگ و نور کی بارش ہونے لگی تھی ۔ ہر چیز پر حسن تھا ہر شے پر خمار تھا ۔ قدرت کے کماشتے سمات

سے ماوراء آوازوں اور بصارت سے بے نیاز وجود کے ساتھ اپنے کام انجام دے رہے تھے ۔ آوارہ آرزوؤں کی طرح سرگرداں رات بڑی تیزی سے اپنے خوش گوار انجام کی طرف بھاگ رہی تھی ۔

احمد ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔ کسی نے اسے جگایا تھا ۔ اس نے دیکھا خوبرو ارتمیس اس کا پاؤں پکڑے کھڑی تھی ۔ وہ دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی جیسے خوشگوار گھٹا بن کر احمد پر برس جائے گی ۔ احمد اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔ اس نے دیکھا اس کے دائیں جانب زیوس اور ہرمس گہری نیند سوئے ہوئے تھے ۔ ارتمیس نے اپنی کھنکتی آواز میں کہا " میں نے پانی گرم کر رکھا ہے ۔ آپ اُٹھ کر وضو کر لیں ۔ میں آپ کے گھوڑے پر زین بھی ڈال چکی ہوں " ۔

احمد اُٹھ کھڑا ہوا ۔ ارتمیس اسے باہر لائی ۔ مٹی کے دو کوزے گرم پانی کے وہ بھر کر لے آئی اور صحن میں پتھروں سے بنی ہوئی پختہ سی شہ نشین پر دونوں کوزے رکھتے ہوئے اس نے کہا " آپ سامنے طہارت خانے میں جا کر وضو کر لیں ۔ اتنی دیر تک میں آپ کے گھوڑے کی زین سے خرجین باندھتی ہوں " ۔

ارتمیس وہاں سے ہٹ کر چھوٹی چھوٹی دیواروں والے بے چھت کے اس چھوٹے سے چبوترے پر آئی جسے باورچی خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا ۔ وہاں سے اس نے احمد کی چرمی خرجین اُٹھائی اور اصطبل کی طرف چلی گئی ۔

احمد وضو کر کے جب اصطبل کی طرف آیا تو اس نے دیکھا ۔ وہاں ارتمیس اس کے گھوڑے کی باگ پکڑے اس کی گردن تھپتھپا رہی تھی ۔ یہ وہی سیاہ گھوڑا تھا جو ارتمیس نے احمد کو دیا تھا ۔ احمد قریب آیا ایک نگاہ ارتمیس پر ڈالی پھر اس نے زین سے لٹکتی ہوئی خرجین کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا " اس میں تم نے کیا بھر دیا ہے " ۔

ارتمیس نے غمزدہ سی آواز میں کہا ۔ میں نے اس میں پنیر ، بھنا ہوا گوشت اور کچھ خشک پھل ڈال دیئے ہیں ۔ یہ آپ کے کام آئیں گے ۔ ٹھہریئے ! میں نے آپ کے لیے کھانا تیار کر رکھا ہے کھا کر جائیے " ۔ احمد کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ارتمیس وہاں

سے نکلی اور ہرنی کی طرح پھلانگتی ہوئی چلی گئی ۔

تھوڑی دیر بعد ارتمیس لوٹی ۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں کچھ اُٹھائے ہوئے تھی ۔ جب وہ نزدیک آئی تو احمد نے دیکھا اس نے مٹی کے دو بڑے بڑے پیالے اُٹھا رکھے تھے ۔ ان میں سے ایک میں گرم گرم دودھ اور دوسرے پیالے میں تازی پکی ہوئی خرما کی کھیر تھی ۔ پتلی کھیر کا پیالہ احمد کی طرف بڑھاتے ہوئے ارتمیس نے کہا " کھائیے " ۔

احمد نے ایک بار گہری نظر سے ارتمیس کی طرف دیکھا پھر پیالہ لے کر اس نے کھیر پی لی ۔ ارتمیس نے دودھ کا پیالہ اس کی طرف بڑھایا اور وہ کسی معصوم اور اطاعت گزار بچے کی طرح دودھ بھی پی گیا ۔ ارتمیس نے دونوں پیالے اصطبل سے باہر رکھتے ہوئے روتی آواز میں احمد سے پوچھا " آپ پھر کب آئیں گے ؟ " احمد سوچوں میں کھڑا رہا ۔ ارتمیس نے پھر کہا " آپ بولتے کیوں نہیں " ۔

احمد نے دھیمی سی آواز میں کہا ۔ ارتمیس ! ارتمیس ! میں تم سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں ۔ میں تمہیں اندھیرے اور تاریکی میں رکھنا نہیں چاہتا " ۔ ارتمیس نے بکھری بکھری آواز میں کہا " آپ کہیں میں آپ کا ہر فیصلہ سننے کو تیار ہوں " ۔ احمد چند ثانیوں تک خاموش رہا پھر وہ ایمن سے ملاقات اور اس کی ماں سے شادی کا وعدہ کرنے کی تفصیل ارتمیس کو سنا رہا تھا ۔

جب وہ خاموش ہوا تو اس نے دیکھا ارتمیس گم صُم گردن جھکائے کھڑی تھی ۔ احمد نے کہا " ارتمیس ! ارتمیس ! میں تمہیں کسی خوش فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا ۔ میرا ماضی بھیانک ہے ۔ حال میرے سامنے بکھرے اوراق کی طرح پڑا ہے اور اپنے مستقبل سے مجھے کوئی سہانی اُمید نہیں ہے ۔ تم اب بھی چاہو تو اپنی راہیں بدل سکتی ہو ۔ ارتمیس ! ارتمیس ! میری زندگی نہایت تلخ ہے ۔ ابھی تک میرا کوئی گھر نہیں ہے ۔ میں وہ پیڑ ہوں جس میں پھول ہو نہ پھل ۔ میں وہ پھول ہوں جس میں مہک نہیں ہے ۔ میں وہ پھل ہوں جس کا کوئی بیج نہیں ہے ۔ میں تمہیں اپنے ساتھ تلخ زندگی کی راہوں پر گھسیٹنا نہیں چاہتا تم پھولوں کے ساتھ مسکرانے ۔ ندیوں کے ساتھ گنگنانے اور چاندنی کے ساتھ گانے کے

لیے پیدا ہوئی ہو تم ایسی حسین ہو۔ تمہاری شخصیت ایسی پُرکشش ہے کہ کوئی بھی رئیس تمہارا ہاتھ تھامتے ہوئے اپنے آپ پر فخر و انبساط محسوس کرے گا۔ میں ایک آتش نشاں ہوں۔ مجھ سے لپٹ کر تمہیں کیا ملے گا۔"

احمد نے دیکھا ارتمیس کی حالت ایسی افسوسناک تھی جیسے کوئی زخمی پرندہ پَل کھا کر زمین پر گر گیا ہو اور موٹے موٹے آنسو اس کی پلکوں سے اس کے دامن پر گر رہے تھے۔ احمد نے بے تاب ہو کر پوچھا۔" ارتمیس! ارتمیس! تم رو رہی ہو۔"

ارتمیس نے فوراً اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔" آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں امین مجھ سے زیادہ آپ کی حق دار ہے۔ اگر وہ مجھے اپنی خوشیوں میں شریک کرنے پر رضامند ہو گئی تو میں اس کے لیے اذیت اور تکلیف کا باعث نہ بنوں گی۔"

احمد نے آگے بڑھ کر ارتمیس کے دونوں ہاتھ پیار سے تھام لیے۔ اس نے محسوس کیا ارتمیس کے کومل ہاتھوں کے لمس میں ایک بے خود کر دینے والی لذت تھی۔ احمد کہہ رہا تھا۔" ارتمیس! ارتمیس! میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ میں بہت جلد تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے لوٹوں گا۔"

اس ایک جملے پر ارتمیس کے چہرے پر بیداری کی سہانی اور دلفریب پرچھائیاں بکھر گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں شادماں و گل فشاں نخل بہار کے سے سائے لہرانے لگے تھے۔ ارتمیس نے مسکراتے ہوئے لذت آمیز آواز میں کہا۔" آج سے آپ ارتمیس کی روح کے امین اور میرے ذہن و دل کے محور ہیں۔ خدا کی قسم اب میں اُمڈتے طوفانوں اور تباہ کن آندھیوں میں بھی تنہا کھڑی ہو کر آپ کا انتظار کر سکتی ہوں۔ میں دن کے اجالے اور رات کی تاریکیوں میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

احمد نے ارتمیس کے ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔" مجھے اب اجازت دو۔ میں جاتا ہوں۔" ارتمیس نے کہا۔" ٹھہریئے! میں بابا کو جگاتی ہوں ان سے مل کر جائیے۔" اپنے گھوڑے کی باگ تھامتے ہوئے احمد نے کہا۔" رہنے دو ارتمیس! وہ سوئے ہوئے ہیں مت جگاؤ انہیں تکلیف ہو گی۔" ارتمیس نے کہا۔" جب میں رات کے پچھلے حصے میں آپ کی

تیاری کرانے کے لیے اُٹھی تھی تو اس وقت بابا بھی میرے ساتھ جاگ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ جب احمد رخصت ہو مجھے بیدار کر دینا۔ لہٰذا ان کا جگانا ضروری ہے۔"

ارتمیس زیوس کو جگانے کے لیے جب واپس جانے لگی تو اچانک احمد نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔" ارتمیس! ارتمیس! پہلے میری بات سنو! بے خیالی میں مجھے یاد ہی نہیں رہا۔" اس کے ساتھ ہی احمد نے اپنے گھوڑے کی خرجین میں ہاتھ ڈالا۔ چمڑے کی ایک تھیلی اس نے نکالی۔ اسے کھول کر دیکھا۔ وہ سُنہری سکوں سے بھری ہوئی تھی۔ احمد نے دوبارہ تھیلی بند کرتے ہوئے کہا۔" یہ کچھ نقدی ہے رکھ لو۔"

ارتمیس نے بدک کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔" نہیں نہیں، ہماری نسبت آپ کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ آپ اپنے لشکر کے ساتھ ابھی نہ جانے کدھر کدھر کا رُخ کریں گے۔ لہٰذا یہ آپ کے کام آئے گی۔"

احمد نے کہا۔" ارتمیس! تم فکر مند نہ ہو، جس قدر میں نقدی تمہیں دے رہا ہوں اس سے چار گنا زیادہ میرے پاس اور ہے۔ ایسی ہی ایک تھیلی میں نے امین کے لیے بھی رکھی ہے۔ دو تھیلیاں اپنے چھوٹے بھائی خصیب کو دوں گا، وہ گھر بھجوا دے گا۔ اور ایک تھیلی میں اپنے پاس رکھوں گا۔ یہ سب مجھے مالِ غنیمت سے ملی ہیں۔ اس کے علاوہ میرے حصے میں کچھ اونٹ اور گھوڑے بھی آئے ہیں۔ انہیں بیچ کر بھی مجھے کافی رقم مل جائے گی۔"

ارتمیس نے پیار سے کہا۔" یہ تھیلی میری طرف سے اپنے پاس رکھ لیں۔" احمد نے آگے بڑھ کر ارتمیس کو اس کے شانے سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔" ارتمیس! اگر تم اپنے آپ پر میرا ذرا سا بھی حق تسلیم کرتی ہو تو یہ تھیلی رکھ لو۔" ارتمیس نے جھجکتے ہوئے کہا۔" آپ نے ذرا سا حق کیوں کہا؟ آپ میری جان، میرے دل کے مالک ہیں۔" اس کے ساتھ ہی ارتمیس نے احمد کے ہاتھ سے نقدی کی تھیلی لے لی۔ پھر وہ غزالِ صحرا کی طرح بھاگتی ہوئی اس کمرے کی طرف چلی گئی جس میں زیوس اور ہرمس سوئے ہوئے تھے۔

احمد اپنا گھوڑا اصطبل سے نکال کر باہر صحن میں کھڑا ہو گیا تھا۔ چاند کسی شب

بیدار چوکیدار کی طرح مغرب کی طرف جھک کر جاگ رہا تھا ۔ ظلمتیں چھٹ گئی تھیں ۔ کہکشاں آسمان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھائی ہوئی تھی ۔ چہار سُو کُو بہ کُو چاندنی رقص کر رہی تھی اور رات اپنی سوچوں میں گم اپنے آخری لمحات کی طرف رینگ رہی تھی تھوڑی دیر بعد ارتمیس اور زیوس کمرے سے نکلے ۔

احمد نے کہا ۔ " ارتمیس نے ناحق آپ کو زحمت دی ۔ میں نے اسے کہا تھا کہ آپ کو نہ جگائے لیکن یہ نہیں مانی ۔" زیوس نے آگے بڑھ کر احمد کو لپٹاتے ہوئے کہا ۔ " میں نے اُسے خود ہی جگانے کو کہا تھا ۔ میں تمہیں خدا حافظ کہتا ہوں بیٹے ۔ میں دن تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا ۔"

زیوس سے علیحدہ ہو کر احمد اپنے گھوڑے کی باگ تھامے باہر آیا ۔ ارتمیس اور زیوس گھر کے بیرونی دروازے پر کھڑے ہو کر اُسے دیکھنے لگے تھے ۔ گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے چاندنی رات میں احمد نے ایک نگاہ ارتمیس پر ڈالی ۔ اس نے دیکھا اس کی حالت دھول میں بکھری کسی عروس شام اور پژمردہ گلاب کی سی تھی ۔ اس کا لرزتا وجود اور دل گرفتہ حالت احمد پر برق بن کر گر گئی تھی ۔

احمد زیادہ دیر تک اس کی دریدہ قلبی اور غم گزیدہ حالت دیکھ نہ سکا ۔ لہٰذا اس نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی ۔ ارتمیس ایسی کربناک حالت میں احمد کو دُور جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی جیسے ندی کنارے بندھی ہوئی پیاسی بھیڑ پانی کی طرف دیکھتی ہے ۔ احمد جب نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو زیوس نے دیکھا ارتمیس کی منتظر آنکھیں ابھی تک ان راستوں پر جمی ہوئی تھیں جہاں احمد اس کی نگاہوں سے اوجھل ہُوا تھا ۔

زیوس نے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا ۔ " ارتمیس ! ارتمیس ! میری بیٹی ! مسافر ہمیشہ دوبارہ ملنے کے لیے بچھڑتے اور زندگی کی نئی نوید لانے کے لیے جدا ہوتے ہیں ۔" زیوس نے گھر کا دروازہ بند کر دیا اور ارتمیس کا ہاتھ تھام کر وہ اپنے کمرے کی طرف واپس جا رہا تھا ۔





دُشمن کے متحدہ لشکر نے قرطاجنہ میں محصور ہو کر یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ قلعہ بند ہو کر مسلمانوں کی یلغار اور ان کی دسترس سے محفوظ ہو گئے ہیں لیکن یہ اُن کی بھول تھی ۔ اگلے روز حسان اور احمد نے شہر کا محاصرہ کر لیا تھا اور جب شہر کے اِردگرد منجنیقیں نصب ہونے لگیں تو اہلِ قرطاجنہ چونکے ۔ پھر شہر میں جگہ جگہ **ہیشا** کی کنواریوں کے نام پر مقدس آگ جلنے لگی اور کلیساؤں میں گجر بجنے لگے تھے اور لوگ شہر کی حفاظت کے لیے دُعائیں مانگنے لگے تھے ۔

حسان اور احمد اپنے لشکر کے قلب کے ساتھ قرطاجنہ شہر کے مشرقی دروازے کے سامنے تھے لشکر کا میمنہ جنوب کی طرف اور میسرہ مغرب کی جانب تھا ۔ صبح سے لے کر دوپہر تک شہر کی فصیل پر منجنیقوں سے پتھراؤ کیا گیا لیکن فصیل اس قدر مضبوط اور پختہ تھی کہ اس پر کچھ اثر نہ ہُوا ۔

سہ پہر کے قریب حسان اور احمد جب ایک منجنیق کے پاس کھڑے تھے تو شہر کی فصیل پر پھیلا ہُوا دُشمن کا لشکر ایک طرف سمٹنے لگا تھا ۔ احمد چونکا اور سانپ کی طرح

بَل کھا کر اس نے حسان کی طرف دیکھا۔ حسان بھی فصیل پر حرکت کرنے والے دشمن کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

احمد نے پریشانی میں پوچھا۔ "یا امیر! آپ نے کچھ دیکھا۔ دُشمن ہمارے ساتھ کیا کرنے والا ہے"۔ حسان نے چِلّاتے ہوئے کہا۔ "احمد! احمد! مغرب اور جنوبی حِصّے سے اپنے میسرہ اور میمنہ کو سمیٹ لو۔ انہیں حُکم دو کہ وہ یہاں ہمارے پاس آکر جمع ہو جائیں" احمد نے پیچھے ہٹ کر اپنے دو چھوٹے سالاروں کو میمنہ اور میسرہ کو مشرق کی طرف آنے کا حکم دیا اور وہ دونوں سالار اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے مغربی اور جنوبی حِصّے کی طرف جا رہے تھے۔

احمد دوبارہ حسان کے پاس آکھڑا ہوا۔ حسان جو ابھی تک فصیل پر حرکت کرتے دشمن کو غور سے دیکھ رہا تھا احمد کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "احمد! احمد! دشمن اپنے سارے لشکر کو مشرقی حِصّے میں سمیٹ کر اور شہر کا دروازہ کھول کر اچانک ہم پر حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن ہم اس کے اس فریب میں نہ آئیں گے۔ ہم اسے بتائیں گے کہ ہم جاگ رہے ہیں اور ان کی ہر نقل و حرکت ہماری نِگاہوں میں ہے۔

دشمن کا سارا لشکر جب مشرق کی طرف سمٹ کر فصیل سے نیچے اُتر رہا تھا اسلامی لشکر کے میسرہ اور میمنہ مغرب اور جنوب کی طرف سے اُٹھ کر مشرق میں اپنے قلب کے ساتھ آکر مِل گئے تھے۔ یہ کارروائی شاید دشمن کے لیے غیر متوقع تھی اس لیے قرطاجنہ کا لشکر مشرق کی طرف نیچے اُترتے اُترتے رُک گیا اور واپس مڑ کر وہ دوبارہ فصیل پر پھیلنے لگا تھا۔

حسان نے ہلکے ہلکے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دشمن کو ہمارے میسرہ اور میمنہ کے آنے سے مایوسی ہوئی ہے اور وہ فصیل کے اُوپر دوبارہ پھیلنا شروع ہو گیا ہے"۔

احمد نے نزدیک ہو کر حسان سے مدھم سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا ایک دوسرا فائدہ بھی ہو گا اور وہ یہ کہ اب جب کہ دشمن کو یقین ہو گیا ہے، ہم نے اپنے لشکر کو ایک جگہ جمع کر لیا ہے تو وہ اپنی توجہ زیادہ تر اسی طرف رکھے گا۔ جب رات آئے گی تو ہم اس طرف سے دشمن پر بھرپور حملے شروع کر دیں گے اور زیادہ سے زیادہ اسے مصروف رکھنے

کی کوشش کریں گے اور اس کی مصروفیت سے فائدہ اُٹھا کر کسی دوسری سمت فصیل کے اُوپر چڑھنے یا اسے توڑنے کی کوشش کریں گے۔

حسان احمد کی باتوں پہ گہری سوچوں میں ڈوبا ہُوا تھا کہ احمد نے پھر اسے مخاطب کر کے کہا۔ یا امیر! شہر میں داخل ہونے کا ایک اور طریقہ بھی ہے لیکن شاید اسے آپ پسند نہ کریں۔ حسان نے چونک کر کہا۔ تم کہو تو اگر وہ قابلِ عمل ہُوا تو مَیں اسے ترجیح دوں گا۔ احمد نے مدھم سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ یا امیر قرطاجنہ شہر کے تین اطراف میں ایسی دوہری فصیل ہے جو کافی مضبوط اور بڑے بڑے پتھر لگا کر خوب پختہ بنائی گئی ہے۔ شہر کے چوتھی اور شمالی جانب سمندر ہے۔ شہر کی فصیلیں سمندر میں تھوڑی دور تک اندر چلی گئی ہیں۔

شہر میں داخل ہونے کے لیے کم از کم سمندر کی دو فرلانگ پٹی کو طے کرنا ہو گا۔ گو ہمارے پاس کشتیاں نہیں ہیں لیکن ہم اگر اس پر عمل کرنا چاہیں تو کشتیوں کا کام ہم اپنے گھوڑوں سے بھی لے سکتے ہیں۔ مَیں شہر کے اس حِصّے کو خوب جانتا ہوں۔ مَیں نے ایک بار ایمن اور اس کی ماں کو دوسری بار اپنے جنگی اسیر ساتھیوں کو ایسے ہی اس شہر کے دوزخ سے رہائی دِلائی تھی۔ شہر میں مَیں نے ایک بوڑھے ملّاح کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اس کا جھونپڑا تو شہر سے باہر سمندر کے کنارے پر ہے لیکن اس نے میرے ساتھیوں کو شہر کے اندر سے اپنی کشتی کے ذریعے سمندر کی وہ دو فرلانگ کی پٹی پار کرا دی تھی اور ہم بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اگر آپ اس تجویز پر غور کریں تو مَیں سمجھتا ہوں یہ اتنی بُری اور مشکل نہیں ہے"۔

حسان نے کسی قدر پُرسکون ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ طریقہ زیادہ آسان رہے گا۔ شہر کی فصیل یا اس کے کسی دروازے کو توڑنے یا رسّوں کی سیڑھیاں ڈال کر شہر کو مسخر کرنے میں کچھ دن لگ سکتے ہیں لیکن سمندر کے راستے ہم ایک ہی رات کے اندر شہر کی قسمت کا فیصلہ کر کے وقت کی لگام اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں۔ جب رات آئے تو جنگ بند کر دی جائے اور دُشمن کو آرام کرنے کا موقع دیا جائے گا اور اپنے لشکر میں بھی بڑے

بڑے الاؤ روشن کر کے یہ ظاہر کیا جائے کہ ہمارا لشکر بھی آرام کر رہا ہے ۔ اس طرح دشمن کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کر ہم وہ سمندری پٹی پار کر کے شہر میں داخل ہو سکتے ہیں"۔

حسان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی ۔ احمد بھی پرسکون ہو گیا تھا اور حسان ہاتھ لہرا لہرا کر اپنے جوانوں کو اور تیزی سے فصیل پر سنگ باری کا حکم دینے لگا تھا ۔ شاید وہ دن بھر دشمن سے تیز اور طوفانی جنگ کر کے اسے تھکا دینا چاہتا تھا ۔



لڑائی دن بھر خناس کے وسوسوں کی طرح اپنے زوروں پر رہی ۔ انفرادیت کے سراغ کا آرزومند سورج جب اپنی پہچان متعین کرنے کی خاطر ڈوب گیا تو حسان کے کہنے پر مسلمانوں نے جنگ بند کر دی اور لشکر میں آگ کے بڑے بڑے الاؤ روشن ہونے لگے ۔

قرطاجنہ شہر میں محصور دشمن خوش تھا کہ مسلمان دن بھر کی جنگ کے بعد ان پر اپنی تسخیر کی مہر ثبت نہیں کر سکے ۔ مسلمان شہر کی فصیل سے دُور ہٹ آگ کے اَن گنت جلتے الاؤ کے پیچھے چلے گئے تھے ۔ اہلِ قرطاجنہ بھی دن بھر کی جنگ کے بعد آرام کرنے لگے تھے ۔

آدھی رات کے قریب حسان اور احمد حرکت میں آئے لشکر کو دو برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا ۔ ایک حصے کو ساتھ لے کر احمد مشرق کی طرف روانہ ہو گیا اور دوسرے حصے کے ساتھ حسان چوکس ہو کر مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا تھا ۔

ایک میل مشرق کی طرف جا کر احمد اپنے لشکر کے ساتھ شمال کی طرف مڑ گیا تھا ۔ اب اس کا رُخ سمندر کی طرف تھا ۔ اہلِ قرطاجنہ بے خبر تھے کہ سنسان رات میں کوئی طوفان ان کے خلاف کروٹیں بدل رہا ہے ۔ سمندر کے کنارے آ کر احمد نے پھر اپنا رُخ بدلا ۔ اب وہ مغرب کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا ۔ اب اس نے اپنی رفتار پہلے سے بھی تیز کر دی تھی ۔ اس لیے کہ سمندر کے کنارے دُور دُور ریت پھیلی ہوئی تھی اور بھاگتے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نہ پیدا ہوتی تھی ۔

اس کڑی رات میں سمندر تاریک خزانوں کے عفریت کی طرح کراہ رہا تھا ۔ سمندر کنارے ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے اندھیری رات میں یوں کھڑے تھے جیسے مردہ ساحروں

کی بے نشان قبریں ۔

شہر کے قریب آ کر احمد نے دیکھا ۔ شہر کی فصیل کا وہ حصہ جو سمندر کے اندر تک چلا گیا تھا سنسان پڑا تھا اور وہاں کوئی ایک محافظ بھی نہ تھا ۔ نہ ہی اس حصے میں دیگر فصیل کی طرح شمعیں یا مشعلیں جلنے کی روشنی ہو رہی تھی ۔ فصیل کے قریب جا کر احمد نے اپنے گھوڑے کو سمندر میں ڈال دیا اور اس کے پیچھے سارے لشکری اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر سمندر میں ڈال چکے تھے ۔ گھوڑے دیوار کے ساتھ ساتھ تیرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے سمندر کے اندر جس جگہ شہر کی فصیل ختم ہوتی تھی وہاں سے احمد اپنے لشکر کے ساتھ بائیں طرف مڑا اب وہ فصیل کے اندرونی حصے کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف بڑھ رہے تھے ۔

کنارا جب قریب آ گیا اور گھوڑوں کے پاؤں زمین پر لگنے لگے تو احمد نے فصیل سے ہٹ کر اپنا رُخ دائیں طرف موڑ لیا ۔ فصیل کے ساتھ ساتھ اب آگے بڑھنا خطرناک تھا ۔ کیونکہ آگے فصیل کا روشن حصہ شروع ہوتا تھا اور وہاں دشمن کے قبل از وقت چوکس ہو جانے کا خطرہ تھا ۔ دائیں طرف ذرا آگے جا کر لشکر کو احمد نے پھر روک دیا کیونکہ کشتیاں اور جہاز ادھر تھے ۔ لہٰذا احمد اپنے لشکر کو لے کر سمندر سے خشکی پر چڑھ گیا ۔

چاروں طرف خاموشی اور ہُو کا عالم تھا اور مسلمان سمندر سے نکل کر موت کے ساحل پر چڑھ گئے تھے ۔ اہلِ قرطاجنہ گہری نیند سوئے ہوئے تھے اور قدرت اندھیری رات میں ان کی تقدیر کے قرطاس پر شکست اور فنا کی مہریں ثبت کر چکی تھی ۔ احمد تاریک رات میں آگے بڑھتا رہا تھا ۔ یہاں تک کہ وہ دشمن کے مستقر کے پاس پہنچ گیا ۔ وہاں دن بھر جنگ کرنے والے سپاہی گہری نیند سو کر آرام کر رہے تھے اور جو سپاہی دن کے وقت آرام کر چکے تھے وہ اب فصیل پر چوکس کھڑے پہرہ دے رہے تھے ۔ سوئے ہوؤں کو یہ تک خبر نہ تھی کہ احمد سانپ اور اژدہے کی طرح تاریکی میں ان کے پاس کھڑا ہے ۔

احمد کے اشارے پر اچانک اس کے لشکر نے اندھیری رات اور گہری خاموشی میں کھلے میدان کے اندر خیموں کے اندر سوئے ہوئے دشمن کے لشکر پر حملہ کر دیا ۔ خیموں کے اندر ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اپنے اچھوتے حملوں اور اپنے انفرادی انداز و کمال کے ساتھ

مسلمانوں نے لمحوں کے اندر سوئے ہوئے لشکر کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا۔

مرنے والوں کی چیخیں اور اچانک حملے سے خوفزدہ ہونے والوں کی چیخیں جب بلند ہونے لگیں تو شہر میں آہستہ آہستہ سرایت کرنے والے زہر کی طرح خوف و ہراس پھیلنا شروع ہو گیا۔ لمحہ بہ لمحہ شہر کے اندر شور و واویلے کی آوازیں زیادہ ہونے لگی تھیں۔ جب سوئے ہوئے لشکر کا زیادہ حصہ کٹ کر زمین بوس ہو گیا تو احمد کے حکم پر اس کے لشکر نے اپنی بارعب نواؤں، توانا آوازوں اور پُرشوکت لہجے میں اللہ اکبر کی فلک شگاف تکبیریں بلند کرنا شروع کر دی تھیں۔

پورے شہر اور فصیل پر پہرہ دینے والے لشکر پر یوں سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ جیسے کسی اچانک بھونچال سے سمندر لرز گیا ہو، یا صحرا کے اندر اُٹھنے والے تیز طوفانی بگولوں نے صحرا کی دہلیز کو اکھیڑ کر رکھ دیا ہو۔ عظمت و شکوہ کی ترجمان اللہ اکبر کی آوازوں نے شہر کے اندر ایک مخصوص صوتی فضا پیدا کر دی تھی اور شہر کے ہر گھر، ہر کوچے اور ہر گلی سے بھاگ دوڑ شور و غل اور خوف و ہراس کی آوازیں یوں بلند ہوتے لگی تھیں جیسے پورے شہر کو کسی نے پرسکون پناہ گاہ سے اُٹھا کر وادیٔ مرگ میں پھینک دیا ہو۔

فصیل سے باہر حسان بن نعمان بھی اپنے لشکر کے ساتھ احمد اور اس کے لشکر کی اللہ اکبر کی صدائیں سن رہا تھا لیکن وہ خاموش اور چُپ تھا اس لیے کہ مناسب وقت پر خود اس نے بھی اپنے کردار کی ابتدا کرنا تھی۔

مسلمانوں کا اچانک شہر میں داخل ہو جانا اہلِ قرطاجنہ کے لیے ایسے ہی تھا جیسے ان کے شہر میں آسیب، چھلاوے، بدرُوح اور غول بیاباں داخل ہو گئے ہوں۔ کیونکہ ان کے وہم و وحشت میں بھی یہ گمان نہ تھا کہ مسلمان شہر کے اندر بھی داخل ہو سکتے ہیں۔

اہلِ قرطاجنہ اپنی ساری آن بان بھول گئے تھے۔ شہر میں ایک کربناک کہرام مچا ہوا تھا۔ اندھیرے میں بے برگ اشجار گم گشتہ و متحیر یوں کھڑے تھے جیسے زخم خوردہ برہنہ لاشیں اور احمد اپنے لشکر کے ساتھ دشمن کے سوئے ہوئے لشکر کے آخری حصے کو تہ تیغ کرنے میں مصروف
فصیل پر کھڑے لشکر نے جب شہر کے اندر شور و کہرام، اپنے سوئے ہوئے لشکر کا قتل عام

اور مسلمانوں کی اللہ اکبر کی تکبیریں سنیں تو ان کے سالار نے لشکر کو فصیل سے نیچے اُتر کر احمد اور اس کے لشکر سے نمٹنے کا حکم دے دیا تھا اور یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی جس کے انتظار میں حسان بن نعمان یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے کوئی شیر گھات میں بیٹھ کر شکار کیے جانے والے جانوروں کو غور سے دیکھتا ہے۔

قرطاجنہ کا لشکر جونہی احمد سے مقابلہ کرنے کے لیے نیچے اُترا حسان حرکت میں آیا۔ اس کے حکم پر آگے بڑھ کر اس کے لشکر نے فصیل پر کمندیں اور رسوں کی سیڑھیاں پھینک دیں اور آن کی آن میں حسان اپنے لشکر کے ساتھ اوپر چڑھ کر فصیل پر قبضہ کر چکا تھا فصیل سے اُتر کر قرطاجنہ کے لشکر نے مسلمانوں پر اندھا دھند حملے شروع کر دیئے تھے لیکن احمد ان کے سامنے یوں جم گیا تھا جیسے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑ کو رائی اور ذرّے کو آفتاب بنانے کا عزم کر چکا ہو۔

اچانک دشمن کے گھوڑ سواروں کا ایک ریلہ آیا اور اس طرف حملہ آور ہوا جہاں احمد اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ دشمن کا صفایا کر رہا تھا۔ شاید ان نئے حملہ آوروں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ احمد ہی شہر میں داخل ہونے والے مسلمان لشکر کا سالار ہے۔ لہٰذا وہ اسے ختم کر کے جنگ کے نتائج کو اپنے حق میں بدلنا چاہتے تھے۔ اسی خاطر انہوں نے آگے بڑھ کر اندھا دھند حملے شروع کر دیئے تھے اور ان میں سے کئی سوار احمد کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ احمد کے ارد گرد لڑنے والے کئی مسلمان کام آ چکے تھے۔ اس لیے ان حملہ آوروں کو احمد پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔

قریب ہی لڑنے والے مسلمان احمد کی مدد کو لپکے تھے لیکن اس وقت تک حملہ آور احمد کو گھیر کر کئی تلواریں اس پر برسا چکے تھے اور احمد اپنے گھوڑے سے نیچے گر گیا تھا۔ ایک رومن نے گھوڑے سے گرے ہوئے احمد پر تلوار برسانا چاہی لیکن احمد اپنی ڈھال پر اس کی تلوار کو روک کر اپنے آپ کو محفوظ کر گیا تھا۔

اس کا بایاں شانہ بُری طرح زخمی ہو گیا تھا تاہم وہ گھوڑے سے گر جانے کے باوجود اپنے حواس میں تھا۔ اتنی دیر تک احمد نے سپاہیوں نے آگے بڑھ کر احمد پر حملہ کرنے

والوں کا صفایا کر دیا تھا۔

احمد کی مدد کو بڑھنے والے سپاہیوں میں اس کا چھوٹا بھائی خصیب بھی تھا۔ وہ اپنے گھوڑے سے اُترا، بھاگ کر آگے بڑھا اور سہارا دے کر احمد کو اُٹھانے کی کوشش کرتے ہُوئے کہا۔ "یا امیر! آپ زیادہ زخمی تو نہیں؟"

احمد نے ایک بار بڑے پیار اور شفقت سے خصیب کی طرف دیکھا پھر اس کے ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ زخم میری مرگ کا باعث نہیں بن سکتے۔ پیچھے ہٹ جاؤ مجھے خود اُٹھ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہونے دو۔"

خصیب نے جلدی جلدی اپنے گھوڑے کی خرجین سے مرہم پٹی کا سامان نکالا اور ایک پٹی خوب کس کر احمد کے شانے پر اس جگہ باندھ دی جہاں زرہ کی چند کڑیاں کٹ جانے سے زخم آگیا تھا۔ خصیب کی طرف دیکھتے ہوئے احمد نے کہا۔ "میں تمہارا سہارا لے کر اپنے ساتھیوں میں ہراس اور بدامنی نہیں پھیلانا چاہتا۔"

گھوڑے کی پیٹھ سے احمد کے گر جانے پر مسلمان سپاہی واقعی کچھ بددل دکھائی دینے لگے تھے جب کہ رومن، فرانسیسی اور بربر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اور بڑھ چڑھ کر حملہ آور ہونے لگے تھے۔

احمد خود اُٹھا اور دوبارہ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اپنی تلوار لہراتے ہوئے وہ اپنے سامنے دشمن پر حملہ آور ہُوا۔ مسلمانوں نے اسے دیکھ کر خوشی میں اللہ اکبر کی کوہ شکن تکبیریں بلند کی تھیں۔ جب کہ احمد کو دوبارہ لڑتے دیکھ کر دشمن کو مایوسی ہوئی تھی۔

خصیب لڑتے لڑتے اپنا گھوڑا احمد کے قریب لایا اور منت کرنے کے انداز میں اس نے کہا۔ "یا امیر! آپ زخمی ہیں آپ کو آرام اور علاج کی ضرورت ہے۔" احمد نے خصیب کی طرف دیکھتے ہوئے چلّا کر کہا۔ "نہیں میرے ساتھیوں کو میری موجودگی کی زیادہ ضرورت ہے۔"

خصیب کچھ کہنے والا تھا کہ فصیل کے اُوپر سے بھی مسلمانوں نے تکبیریں بلند کیں احمد اور خصیب نے جب نگاہیں اُٹھائیں تو اُنہوں نے دیکھا حسان اپنے لشکر کے ایک بڑے

حصے کے ساتھ فصیل سے اُتر کر دشمن پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ رومنوں، فرانسیسیوں اور بربروں نے بوکھلا کر اس منظر کو دیکھا۔ ان کے سالار نے اُنہیں فوراً حسان کے حملے کو روکنے کا حکم دیا۔ اب احمد پر دباؤ کم ہو گیا تھا۔ اس نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ اپنا رُخ اس نے بائیں طرف موڑا اور راستے میں آنے والے دشمن کے سپاہیوں کو وہ اپنے لشکر کے ساتھ صفایا کرتا ہُوا شہر کے مشرقی دروازے کی طرف بڑھا تھا۔

احمد کے تحت لڑنے والا لشکر بھی جان گیا تھا کہ احمد شہر کا دروازہ کھلوانا چاہتا ہے لہٰذا وہ اس کی سرکردگی میں تکبیریں بلند کرتے ہوئے دروازے کے محافظوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ آن کی آن میں اپنے لشکر کے ایک معمولی حصے کے ساتھ احمد نے شرقی دروازے کی حفاظت کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور پھر آگے بڑھ کر اس نے شہر کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اسلامی لشکر کے وہ دستے جو ابھی تک نیچے کھڑے فصیل پر چڑھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ طوفانی انداز میں اور ایک ریلے کی صورت میں قرطاجنہ شہر میں داخل ہوئے اور دشمن پر ٹوٹ پڑے تھے۔

احمد نے اپنے لشکر کو مجتمع کیا اور حسان کے خلاف جنگ میں مصروف دشمن کی پشت پر اس زور، قوت اور جانفشانی سے حملہ کیا کہ قرطاجنہ کے محافظ حسان اور احمد کے درمیان پسنے کے بجائے ایک طرف ہٹ گئے لیکن جونہی انہیں خبر ہوئی کہ شہر کا مشرقی دروازہ کھُل گیا ہے اور مسلمانوں کا پورا لشکر شہر میں داخل ہو چکا ہے تو اُن کے حواس جاتے رہے اور رہی سہی ہمت جواب دے گئی۔

اسی دوران اُنہیں یہ اطلاع بھی مِل گئی کہ ان کا سالار بھی جنگ میں کام آگیا ہے لہٰذا وہ شہر کے مغربی دروازے کی طرف بھاگے اور دروازہ کھول کر وہ اپنے گھوڑوں کو اس شاہراہ پر سرپٹ لگے تھے جو مسطفورا اور تبرزوت شہروں کی طرف جاتی تھی۔ یہ دونوں شہر جنگی نقطہ نِگاہ سے زیادہ مضبوط اور مستحکم تھے۔ اس لیے کہ ان دونوں شہروں میں رومنوں کے مضبوط لشکر مستقل طور پر رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ان دونوں شہروں کو بوقتِ ضرورت صقلیہ اور اندلس سے ہر قسم کی مدد اور کمک بھی مل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ

سارڈینیا، کارسیکا اور مالٹا جزائر سے بھی وہاں جنگجو رومن پہنچ سکتے تھے۔

قرطاجنہ سے بھاگنے والے لشکر کا بھی شاید یہی ارادہ تھا کہ وہ وہاں جاکر پناہ لینے کے علاوہ وہاں کے حکمرانوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر اکسائیں گے۔

حسان اور احمد نے ان کا تعاقب نہ کیا تھا۔ اس لیے کہ انہیں شہر کا نظم و نسق سنبھالنا تھا۔

اپنے لشکر کے بھاگ جانے پر اہلِ قرطاجنہ پریشان تھے اور اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر وہ اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کو بے تاب تھے لیکن شہر میں جب سب کے لیے معافی کا اعلان کر دیا گیا تو اہلِ قرطاجنہ پُرسکون ہو گئے اور جوق در جوق حسان کے پاس آکر اپنی وفاداری اور خلوص کا اظہار کرنے لگے۔

حسان ابھی تک ایسا مصروف تھا کہ اسے یہ خبر بھی نہ ہوئی تھی کہ احمد زخمی ہے اس لیے کہ شہر کے لوگ وفود کی شکل میں اس کے پاس آکر اپنے بے ضرر ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ اچانک حسان کو کوئی خیال گزرا اور اس نے اپنے میمنہ کے سالار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "احمد کہاں ہے؟ اسے کہو شہر کے باہر نصب اپنے خیمے اکھیڑ کر اور سارا سامان سمیٹ کر شہر کے اندر لایا جائے۔ اپنے لشکر کو دشمن کے مستقر میں نصب ان کے خیموں میں ٹھہرا کر آرام کرنے کا موقع دیا جائے اور زخمیوں کی مرہم پٹی مکمل ہو جانے کے بعد ان کی دیکھ بھال کی جائے۔"

وہ سالار پیچھے ہٹنے لگا تھا کہ لشکر کے قلب کا ایک سپاہی اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور بدحواسی میں اس نے حسان سے کہا۔ "میرے آقا! امیر احمد زخمی ہیں اور شہر کے مشرقی دروازے کے پاس ان کی دیکھ بھال کی جا رہی ہے۔"

حسان نے بدحواس ہو کر پوچھا "مجھے پہلے کیوں نہ خبر کی گئی کہ وہ جنگ میں زخمی ہو چکا ہے"۔ آنے والے نے اور قریب ہو کر کہا "وہ زخمی حالت میں ہی جنگ کرتے رہے ہیں۔ ایک بار دشمن کے ان گنت سپاہیوں نے ان پر حملہ کر دیا تھا اور وہ گھوڑے سے گر پڑے تھے لیکن اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بحال رکھنے کی خاطر وہ دوبارہ سوار ہو کر آخر تک جنگ کرتے رہے۔

حسان پریشانی کی حالت میں ایک زقند کے ساتھ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ میمنہ اور میسرہ کے سالار کی طرف اس نے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اپنے لشکر کے خیمے اور دیگر سامان فوراً شہر کے اندر منتقل کر لو۔ میں اس دوران احمد کو دیکھتا ہوں"۔ حسان نے گھوڑے کو موڑا اور ایڑ لگا کر اسے قرطاجنہ کے مشرقی دروازے کی طرف سرپٹ دوڑا تھا۔

دروازے کے پاس جہاں محافظوں کے لیے سیاہ پتھروں کے کمرے بنے ہوئے تھے وہاں حسان نے اپنے گھوڑے کو روکا۔ اس نے دیکھا اس کے لشکر کا ایک حصہ جمگھٹے کی صورت میں وہاں جمع تھا۔ حسان کو دیکھتے ہی لشکری ایک طرف ہٹ کر راستہ دینے لگے تھے۔ ایک سپاہی نے بھاگ کر حسان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی تھی۔ حسان کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ احمد کہاں ہے، سپاہی خود آگے بڑھ کر حسان کو اس کمرے کی طرف لے جا رہے تھے جس کے اندر احمد کو رکھا گیا تھا۔

چند سپاہیوں کے ساتھ حسان جب ایک کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا احمد ایک مسہری پر لیٹا ہوا تھا اور لشکر کے چند طبیب اس کے گرد جمع تھے۔ حسان کے چہرے پر فکر اور تشویش کی سلوٹیں اور گہری ہو گئی تھیں۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ آگے بڑھا اسے دیکھتے ہی طبیب ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

احمد مسہری پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ حسان نے اسے پیار سے پکارا۔ "احمد! احمد! میرے بھائی! میرے دوست!" احمد نے آنکھیں کھولیں اور حسان کو دیکھتے ہی اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن حسان نے پیار سے ایک ہاتھ اس کی گردن کے نیچے اور دوسرا اس کی چھاتی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "لیٹے رہو۔ لیٹے رہو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ زخم تشویشناک تو نہیں ہیں"۔

احمد نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور اپنے بائیں پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "میرے بائیں شانے اور بازو پر زخم آئے ہیں لیکن تشویشناک نہیں ہیں۔ اس آڑے وقت میں میری زرہ اور ڈھال میرے کام آگئی تھیں۔ دشمن کا ایک ریلہ سیلاب کی صورت میں اچانک ہم پر حملہ آور ہو گیا تھا۔ شاید اس طرح وہ جنگ کا پانسہ اپنے حق میں پلٹنا چاہتے

تھے لیکن انہیں ناکامی ہوئی اور اُن میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ جا سکا۔ اگر کئی سپاہی ایک ساتھ مجھ پہ حملہ آور نہ ہوتے تو میں زخمی نہ ہوتا۔ بہر حال یہ زخم بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے اور میں پہلے کی طرح آپ کا ساتھ دے سکوں گا۔"

حسان چند لمحوں تک خاموشی سے احمد کو دیکھتا رہا۔ اس کے دائیں جانب طبیب اور بائیں طرف لشکر کے چار سپاہی کھڑے تھے۔ ان میں احمد کا چھوٹا بھائی خصیب بھی شامل تھا۔ گو اسے علم نہ تھا کہ احمد ہی اس کا بڑا بھائی ہے۔ اس کے باوجود فطری طور پہ وہ پریشان اور غمگین تھا۔ اس کی نگاہیں کبھی احمد کے پریشان حال چہرے اور کبھی اس کے خون آلود کپڑوں پر جم جاتی تھیں۔ جب سے احمد زخمی ہوا تھا وہ اس کے ساتھ ساتھ اور اسے سنبھالے ہوئے تھا۔ اب بھی وہ احمد کے سرہانے گُم صُم کھڑا تھا۔

حسان نے ایک طبیب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تمہارے خیال میں زخم کیسے ہیں؟"

طبیب نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "میرے آقا! ایک زخم جو بازو کے بالائی حصے پر ہے وہ کافی گہرا ہے لیکن اس پہ چونکہ بروقت پٹی باندھ دی گئی تھی اس لیے زیادہ خون نہیں نکلا اور اس نے خطرناک صورت اختیار نہیں کی۔ ہم نے زخم صاف کر کے مرہم لگا دی ہے۔ چند روز تک ہی مندمل ہو جائے گا۔ دوسرا زخم جو شانے پر ہے ذرا ہلکا ہے وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ مجموعی طور پہ ایک ہفتہ تک امیر اپنا بایاں بازو استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

حسان کچھ کہنے والا تھا کہ ایک سپاہی تیزی سے اندر آیا اور حسان کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "سیّدی! باہر ایک خاتون کھڑی ہے۔ اس نے اپنا نام عزیان بتایا ہے اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی ہے۔ وہ دونوں سخت پریشان ہیں اور امیر احمد سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ اسی شہر کی رہنے والی ہیں۔ امیر احمد کو جانتی ہیں اور کہیں سے انہیں ان کے زخمی ہونے کی خبر ہو گئی ہے۔"

حسان کو چونکہ احمد اپنی پوری داستان سُنا چکا تھا اس لیے وہ ارتمیس اور امین کے متعلق بخوبی جانتا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دائیں بائیں کھڑے طبیبوں اور لشکریوں کو مخاطب کر کے اس نے کہا "سب لوگ باہر نکل جاؤ۔ آنے والی خاتون اور

لڑکی کو احمد سے ملنے دو۔"

طبیب اور لشکری جن میں خصیب بھی شامل تھا باہر نکل گئے۔ حسان نے بھی ایک بار گہری نگاہوں سے احمد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ خود بھی کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

احمد اسی طرح بستر پہ چت لیٹا چھت کی طرف دیکھ رہا تھا کہ امین اور عزیان پتھروں سے بنے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئیں۔ امین آگے آگے تھی اور عزیان اس کے پیچھے۔ امین سخت پریشان تھی اور رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ شوخ دیدہ اور گل احمر لڑکی جس کا چہرہ ہمہ وقت آبِ انگور کی طرح نشاط انگیز رہتا تھا اس سے انتہائی کرب کی حالت میں تھی۔ اس کا چہرہ کسی قحط خوردہ اور نزار و حزیں بیمار جیسا لگ رہا تھا۔

بھاگ کر وہ آگے بڑھی اور احمد کی مسہری کے قریب آ کر اُسے دیکھنے لگی۔ اتنی دیر تک عزیان بھی آ گئی اور اس نے احمد کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا میرے بیٹے کو؟" جواب میں احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ دونوں فکر مند نہ ہوں، میں ٹھیک ہوں۔ جنگ میں کسی کا یوں زخمی ہونا کوئی بڑی اور اہم بات نہیں ہے۔"

احمد نے دیکھا۔ امین ابھی تک اس کے پاس کھڑی نہ جانے یادوں کے کن کن بیابانوں اور بے نام امیدوں کے دشت میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی حسین مدا اس آنکھڑیوں میں ابھی تک آنسو لہرا رہے تھے۔ اس کے چہرے پر سوچوں کے جال میں روزنِ زنداں کی سی افسردگی اور آنکھوں کے کرب میں اشکوں کا ایک طوفان اور ان گنت ملول رنجیدہ جذبے تھے۔

احمد نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "امین! امین! تم کہاں کھو گئی ہو واپس لوٹ آؤ۔ میں تمہارے سامنے کذب بیانی سے کام نہیں لے رہا۔ میں سچ کہتا ہوں، میرے زخم تشویشناک نہیں ہیں اور یہ میرے لیے خطرناک ثابت نہیں ہو سکتے۔" امین کی آنکھوں سے

آنسو بہہ نکلے جنہیں اس نے فوراً پونچھ لیا اور احمد کے بستر پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا ”آپ کے کہاں کہاں زخم آئے ہیں ؟“

عزیان کمرے میں پڑی ہوئی ایک اور سہری گھسیٹ کر قریب لائی اور اس پر بیٹھ گئی۔ احمد کہہ رہا تھا ”امین ! امین ! تم نے اداسی اور افسردگی کا جو لبادہ اوڑھ رکھا ہے پہلے یہ اتار دو پھر بتاؤں گا“۔ امین فوراً سنبھل کر بیٹھتی ہوئی بولی ”اب بتائیے۔ میں اب اُداس نہیں ہوں“۔

احمد کہہ رہا تھا ”امین ! امین ! میرے صرف دو جگہ زخم آئے ہیں۔ ایک جو بائیں شانے پر ہے وہ معمولی ہے اور دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔ دوسرا زخم بائیں بازو کے بالائی حصے میں ہے۔ یہ کچھ گہرا ہے تاہم میرے ایک ساتھی نے جنگ کے دوران بروقت اس پر پٹی باندھ دی تھی اس لیے اس میں سے زیادہ خون نہیں نکلا۔ پہلے وہ میرے لیے تکلیف دہ تھا لیکن جب سے لشکر کے طبیبوں نے اسے صاف کر کے اور اس میں مرہم بھر کر پٹی باندھ دی ہے زخم سے اُٹھتی درد جاتی رہی ہے اور اب میں سکون محسوس کر رہا ہوں“۔ امین نے پیار سے کہا ”میں آپ کو یہاں نہ رہنے دوں گی اپنے ساتھ گھر لے جاؤں گی“۔

احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے تمہارے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس کے لیے مجھے اپنے سالار سے اجازت لینا ہوگی“۔ اس بار عزیان نے پوچھا ”وہ کون ہے اور کہاں ہے“۔ احمد نے غور سے امین کے اداس چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس کا نام حسان بن نعمان ہے اور وہ آپ کے آنے پر ہی میرے پاس سے اُٹھ کر گئے ہیں“۔

عزیان کھڑی ہوتی ہوئی بولی ”میں خود اس سے تمہیں گھر لے جانے کی بات کرتی ہوں“۔ احمد نے اسے روکتے ہوئے کہا ”آپ ٹھہریئے ! میں انہیں یہیں بلاتا ہوں“۔ بستر پر لیٹے ہی لیٹے احمد نے کسی کو پکارا اور جواب میں ایک مسلح سپاہی بھاگتا ہوا اندر آیا اور دروازے پر ہی رُک کر اس نے پوچھا ”یا امیر ! کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے“۔ دروازے پر کھڑے اس سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے احمد نے کہا ”آقا حسان سے کہو

احمد آپ کو بلاتا ہے“۔ وہ سپاہی مڑا اور واپس چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کے دروازے پر حسان بن نعمان نمودار ہوا اور وہیں رُک کر اس نے احمد سے پوچھا ”میرے عزیز ! کیا تم کسی شے کی ضرورت محسوس کرتے ہو۔ اگر ایسا ہے تو کہو“۔ احمد نے ممنون سی آواز میں کہا ”یا امیر ! آپ آگے آجائیے“۔ حسان کمرے کے اندر آیا اور احمد کے قریب آکھڑا ہوا۔

احمد نے امین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یا امیر ! یہ امین ہے۔ دمشق میں الدار الخضرا کے مہمان خانے میں آپ کو اپنی داستان سناتے ہوئے میں نے جس امین کا ذکر کیا تھا وہ یہی ہے“۔ پھر احمد نے عزیان کی طرف اشارہ کر کے کہا ”اور یہ خاتون اس کی ماں ہیں“۔

حسان نے خفیف سی مسکراہٹ میں کہا ”تم کہو ! میں انہیں پہچان چکا ہوں“۔

احمد نے رُکتے رُکتے کہا ”یہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانا چاہتی ہیں۔ میں آپ سے ——— حسان نے احمد کی بات مکمل نہ ہونے دی اور اپنا فیصلہ دیتے ہوئے کہا ”میں ابھی تمہیں ان کے گھر پہنچاتا ہوں۔ یہاں کی نسبت وہاں تم زیادہ آرام اور آسائش میں رہو گے۔ طبیب وہیں آکر تمہارے زخموں کی پٹیاں بدل دیا کریں گے۔ مغرب کی طرف اور آگے بڑھنے کے لیے ہم چند روز یہاں قیام کریں گے اور اس دوران میں تمہارے زخم مندمل ہو جائیں گے“۔

حسان فوراً واپس مڑا۔ دروازے پر کھڑے سپاہیوں سے اس نے کچھ کہا اور دوبارہ احمد کے پاس واپس آکر اس نے احمد کو بازو سے پکڑتے ہوئے پوچھا ”تم چل سکو گے یا میں تمہیں اٹھوا کر باہر لے چلوں“۔ احمد اُٹھ کر بیٹھ گیا اور جوتے پہنتے ہوئے کہا۔ ”میں چل سکوں گا آپ کوئی اندیشہ نہ کریں۔

احمد کھڑا ہو گیا۔ امین بھاگ کر احمد کے دائیں طرف آئی اور اپنا بازو اس کی بغل میں دے کر اسے سنبھالتے ہوئے کہا ”آپ میرے سہارے آہستہ آہستہ چلیئے“۔ احمد نے ہنستے ہوئے کہا ”امین ! امین ! میں اس قدر بے بس نہیں۔ میں بخوبی چل پھر سکتا ہوں میرا صرف بایاں شانہ اور بازو زخمی ہے۔ اس سے مجھے چلنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔ تم

مجھے ذرا چھوڑ کر تو دیکھو۔"

ایمن ذرا پیچھے ہٹ گئی اور احمد آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو حسان، ایمن اور عزیان اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ باہر آکر احمد نے دیکھا دروازے کے قریب ہی ایک جنگی رتھ کھڑی تھی جس میں دو گھوڑے جتے ہوئے تھے اور اس رتھ کے اندر ایک نرم اور صاف ستھرا بستر لگا ہوا تھا۔ حسان کے اشارے پر چند سپاہی بھاگ کر آگے بڑھے اور احمد کو آرام سے اٹھا کر انہوں نے رتھ میں لگے بستر پر لٹا دیا تھا۔ حسان نے عزیان اور ایمن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ دونوں بھی رتھ میں بیٹھ جائیں۔"

عزیان اور ایمن دونوں ماں بیٹی نے احسانمندی سے حسان کی طرف دیکھا۔ پھر وہ دونوں بھی آگے بڑھ کر رتھ میں سوار ہو گئی تھیں۔ حسان نے قریب آکر احمد سے سرگوشی میں کہا۔ "اب تم جاؤ۔ جو سپاہی رتھ کے گھوڑے ہانک کر لے جا رہا ہے یہ ایمن کا گھر دیکھ آئے گا۔ طبیب وہاں آکر تمہاری دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔ میں خود بھی آتا رہوں گا۔" حسان کے اشارے پر رتھبان نے گھوڑوں کو ہانک دیا اور رتھ بڑی تیزی سے شہر کے جنوبی حصے کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

ایمن کے اشارے پر رتھ چلانے والے سپاہی نے رتھ کے گھوڑوں کی باگیں کھینچ کر انہیں روک دیا۔ ایمن نے بائیں طرف اپنے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارا گھر ہے۔ جب طبیب یا لشکر کے امیر حسان بن نعمان تمہارے ساتھ آئیں تو انہیں یہیں لے کر آنا۔"

وہ سپاہی نیچے اترا اور احمد کو سہارا دے کر اس نے رتھ سے نیچے اتار لیا تھا۔ عزیان نے آگے بڑھ کر گھر کا دروازہ کھولا اور ایمن نے احمد کا بازو تھامتے ہوئے اس سپاہی سے کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

اس سپاہی نے رتھ کو واپس موڑا اور چرمی باگیں لہرا کر اس نے رتھ کے دونوں گھوڑوں کو تیزی سے ہانک دیا تھا۔ ایمن احمد کو تھام کر اندر لائی اور اسے اس کمرے میں لے گئی جس کا ایک دروازہ گلی میں بھی کھلتا تھا اور جو دیوان خانے کے طور پر استعمال

ہوتا تھا۔

احمد کو ایک صاف ستھرے اور نرم بستر پر لٹانے کے بعد ایمن نے اسے لحاف اوڑھا دیا اور پھر وہ جلدی جلدی آتش دان میں آگ روشن کرنے لگی تھی جب کہ عزیان احمد کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی تھی۔

جب آتش دان خوب روشن ہو گیا تو عزیان نے کہا۔ "ایمن! ایمن! شام ہو رہی ہے میری بیٹی! تم احمد کے پاس آکر بیٹھو، میں کھانا تیار کرتی ہوں۔" ایمن خاموشی سے اٹھی اور جس مسہری پر احمد لیٹا ہوا تھا اس سے دائیں طرف پڑی ہوئی دوسری چارپائی پر آکر بیٹھ گئی، جہاں عزیان پہلے سے بیٹھی احمد سے باتیں کر رہی تھی۔ عزیان اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔

ایمن اپنی جگہ سے اٹھی، احمد کی مسہری پر آکر بیٹھی اور پھر بڑی چاہت سے اس نے احمد کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "آپ کے زخموں میں درد تو نہیں ہو رہی؟"

احمد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اگر درد ہو بھی رہی ہو گی تو تم کیا کرو گی؟" ایمن نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی ننگے پاؤں یہاں سے بھاگوں گی اور طبیب کو بلا کر لے آؤں گی۔"

اپنی پیشانی پر رکھے ایمن کے نرم و گداز ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے احمد نے کہا۔ "ایسی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ مجھے رات کا ڈر تھا کہ سردی اور تیز ہواؤں کے باعث میرے زخم تکلیف دہ ہو جائیں گے لیکن اب کمرے میں آتش دان روشن ہو جانے سے یہ خدشہ بھی جاتا رہا ہے۔"

ایمن نے بڑے جرأت مند جذبے میں کہا۔ "آپ رات کے متعلق کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ میں آپ کے پاس ہوں گی اور ہر طرح سے آپ کا خیال رکھوں گی۔ آپ کو گھر لانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ یہاں آپ کی بہتر دیکھ بھال ہو سکے گی۔"

احمد نے پیار سے پوچھا۔ "تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ میں بھی اس لشکر میں شامل ہوں اور زخمی ہوں؟"

ہلکی ہلکی اور دلفریب مسکراہٹ میں ایمن نے کہا۔ "جس وقت قرطاجنہ کے لشکر کو

شہر سے باہر شکست ہوئی تھی اسی وقت سے مجھے یقین تھا کہ آپ اس لشکر میں شامل ہیں میرا دل کہتا تھا کہ آپ ہی یہ لشکر لے کر آئے ہیں۔ میں نے ماں سے کئی بار کہا کہ شہر سے باہر نکل کر احمد سے ملیں لیکن ماں اس خیال سے ڈرتے ہوئے انکار کر دیتی تھیں کہ اگر آپ لشکر میں شامل نہ ہوئے تو ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

جب آپ کا لشکر قرطاجنہ میں داخل ہوا اور شہر فتح ہو گیا تو پھر میں ماں کو مجبور کر کے باہر لے گئی۔ میں اور ماں اسلامی لشکر کے اندر آپ کو تلاش کر رہی تھیں کہ آپ کے ایک سپاہی نے ہمیں آپ کے زخمی ہونے کی خبر دی لہٰذا ہم دونوں ماں بیٹی شہر کے مشرقی دروازے کی طرف چلی گئیں جہاں آپ زخمی حالت میں پڑے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ مل گئے ورنہ میں آپ کے متعلق سخت پریشان اور فکر مند تھی۔

احمد کو جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ اس نے فوراً بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ ایمن! ایمن! اگر تم ناراض نہ ہو تو ایک بات کہوں؟ اگر تم نے خفا ہونا ہے تو پھر میں خاموش رہتا ہوں“۔

ایمن نے خود احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ آپ کہیے میں ناراض نہ ہوں گی۔ آپ کیسی سخت کیسی ہی دل فگار خبر کیوں نہ دیں میں آپ سے خفا ہونا تو ایک طرف میں ایسا سوچ تک نہیں سکتی“۔

احمد چند لمحوں تک غور سے ایمن کے حسین و روشن چہرے کو دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ آہستہ شروع سے آخر تک اسے ارتمیس کے متعلق بتا دیا۔ ایمن سر جھکائے کچھ سوچنے لگی۔ احمد نے کہا۔ ”میں نہ کہتا تھا تم بُرا مانو گی اور ناراض ہو جاؤ گی۔

ایمن نے چونک کر کہا۔ ”آپ کا اندازہ غلط ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ پہلے یہ بتائیں اس کا مذہب کیا ہے“۔ احمد نے کہا۔ ”وہ لوگ کبھی یونانی بت پرست تھے۔ اب وہ مسلمان ہیں۔ وہ بڑی اچھی اور نیک لڑکی ہے اس نے کہا تھا اگر ایمن مجھے اپنی خوشیوں کی شریک بنائے گی تو یہ اس کی مجھ پر مہربانی ہو گی ورنہ وہ میری نسبت آپ کی زیادہ حق دار ہے“۔

ایمن نے چونک کر کہا۔ ”نہیں! نہیں! خدا کی قسم اس نے میری نسبت آپ کی زیادہ خدمت کی ہے۔ وہ آپ کی زیادہ حق دار ہے۔ ہم دونوں مل کر آپ کی خدمت کریں گی۔ میں اسے اپنی چھوٹی بہن کی طرح عزیز رکھوں گی۔ پہلے اس سے آپ کی شادی ہو گی اس کے بعد میں آپ کے نکاح میں آؤں گی۔ واللہ! میں خوشی سے آپ کو اس سے پہلے شادی کرنے کی اجازت دیتی ہوں“۔

احمد نے ایمن کا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے کہا۔ ”ایمن! ایمن! تم بہت فراخدل ہو۔ بخدا مجھے تم سے ایسی ہی اُمید تھی۔ سنو ایمن سنو! میں تم دونوں سے شادی کر کے تمہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں گا۔ میرے ماں باپ اور بھائی بھی مجھے مل گئے ہیں“۔

ایمن کے چہرے پر خوشی میں یادوں کی مہک، پھولوں کی سی خوشبو اور کشف حقائق کی فرط و انبساط بکھر گئی تھی۔ اس نے اپنے لبوں کی پوری حلاوت میں کہا۔ ”وہ کہاں ہیں اور آپ سے ان کی ملاقات کیسے ہوئی“۔

جواب میں احمد اسے خصیب سے ملنے، شیبان کی شادی اور اپنی ہستی کو اپنے ماں باپ اور بھائیوں سے پوشیدہ رکھنے کی ساری داستان سُنا رہا تھا۔ احمد جب خاموش ہوا تو ایمن نے بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ماں کو بھی یہ خبر سُناتی ہوں“۔

پھر ایمن احمد کی مسہری سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایمن اور اس کی ماں اس کمرے میں داخل ہوئیں جس کے اندر احمد لیٹا ہوا تھا۔ ان دونوں نے کھانے کے برتن اٹھا رکھے تھے۔

ایمن نے جلدی جلدی برتن فرش پر رکھے۔ پہلے احمد کو اس نے بٹھایا پھر اس نے اس کے پیچھے کچھ تکیے رکھ کر ٹیک سی بنا دی تھی۔ کھانے کے سارے برتن انہوں نے احمد کے سامنے مسہری پر ہی پھیلا دیے تھے اور تینوں مل کر خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔





احمد نے سات آٹھ روز تک امین کے پاس قیام کیا تھا۔ اس دوران حسان اور لشکر کے طبیب لگاتار اس کے پاس آتے رہے۔ خصیب کو نہیں جانتا تھا کہ احمد ہی اس کا بچھڑا ہوا بھائی ہے۔ اس کے باوجود فطری لگن اور جبلی کشش کے تحت روزانہ احمد کو دیکھنے آتا تھا۔

سات آٹھ یوم بعد احمد کے زخم بھر گئے تو وہ امین کے پاس سے اپنے لشکر کے مستقر میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس دوران حسان نے اپنے اخلاق و کردار کے باعث اہل قرطاجنہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور شہر کی زیادہ آبادی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لہٰذا شہر کے نظم و نسق سنبھالنے میں اسے کسی دقت و دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔

ان ہی دنوں حسان کے جاسوسوں نے اسے یہ خبریں بھی دیں کہ قرطاجنہ سے بھاگنے والا لشکر صطفورا اور تبزوت شہروں میں جمع ہو گیا ہے اور ساتھ ہی یہ اطلاعات بھی ملیں کہ کارسیکا، سارڈینیا، مالٹا اور صقلیہ کے جزائر کے علاوہ اندلس سے بھی رومن اور دیگر

عیسائی دنیا کے جرار لشکر مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ان دونوں شہروں میں جمع ہو رہے ہیں۔

حسان نے اپنے لشکر کے ساتھ تقریباً دو ماہ قرطاجنہ میں قیام کیا۔ احمد اب بالکل تندرست ہو گیا تھا۔ پھر ایک روز جمعہ کی نماز کے بعد حسان اپنے لشکر کے ساتھ مغرب کی طرف کوچ کر گیا تھا۔

صطفورا اور تبزوت دونوں شہر سمندر کے کنارے تھے۔ صطفورا مشرق میں اور تبزوت اس سے چند میل مغرب کی طرف تھا لہٰذا حسان اور احمد بھی اپنے لشکر کو لے کر سمندر کے کنارے کنارے مغرب کی طرف بڑھے تھے۔

صطفورا سے پندرہ میل دور سمندر کے کنارے اور سرخ ریت کے صحرا میں انہوں نے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کیا اور کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے کے لیے وہ اپنے مخبروں کا انتظار کرنے لگے تھے۔

موسم کی رت اب سردی سے نکل کر گرمی میں داخل گئی تھی۔ پیڑوں نے نئی شاخیں اور شاخوں نے نئے پتوں کے پیراہن پہن لیے تھے۔ اس رت بدلنے سے صحرائی زندگی میں یوں تبدیلی آئی تھی گویا کوئی مسافر انہار فردوس سے نکل کر نار جہنم میں آن گھسا ہو۔

ایک روز جب کہ سورج اپنے دن بھر کے ہنر و کسب، ریاضت و ہنگاموں کے بعد کشف حقائق کی تلاش میں غروب ہو گیا تھا حسان، احمد اور لشکر کے کچھ دیگر سالار مغرب کی نماز کے بعد صحرا کی ٹھنڈی ریت پر بیٹھے تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ ان کی بحث کا موضوع آنے والی وہ جنگ تھی جس میں ان کا سامنا اہل صطفورا اور تبزوت کے علاوہ اندلس، صقلیہ، کارسیکا، سارڈینیا اور مالٹا کے لشکروں سے بھی تھا۔

صحرا کے جس حصے میں اسلامی لشکر نے قیام کیا تھا اس کے دائیں طرف موجیں مارتا اور جھاگ اڑاتا ہوا سمندر جب کہ بائیں طرف ذرا دور فاصلے پر ایک بلند کوہستانی سلسلہ تھا۔ اصل میں یہ کوہستان اور اس کا ہی ایک حصہ تھا جو مغرب میں دور تک صحرا کے اندر آگے بڑھ گیا تھا۔ ان پہاڑوں سے چشموں کا پانی ایک نالے کی صورت میں بہتا

ہوا سمندر کی طرف چلا گیا تھا اور اسی نالے کے کنارے اسلامی لشکر خیمہ زن ہوا تھا۔

سورج غروب ہونے کے بعد صہبا کی تلخی اور فلفل کی تیزی جیسی گرمی جاتی رہی تھی۔ دن بھر کی آتشِ سیال اور خمار خار شام خوابوں کے جزیروں میں کھو گئی تھیں۔ دشت و کہسار میں اب بوئے بہار، دھنک رنگ اور محویت و تفکّر کا عالم تھا۔ جیسے کوئی الہڑ جیسے کوئی شوخ دید ساقی و مطربِ فانی دہر میں رات بھر کی مشقت کے بعد اپنے سہو و نسیان اور تاریک و تیرہ صبر و عزیمت کو بھول کر گہری نیند سو جانے کی تیاری کر چکی ہو۔ صاف آسمان پر ستاروں کے کاروان تسخیرِ فطرت کی خاطر امیدِ سحر بن کر بھاگنے لگے تھے۔ صحرا میں ایک تغزل، دشت میں ایک غنا پیدا ہو گیا تھا۔

حسان اور احمد اپنے چند سالاروں کے ساتھ اسی طرح اپنے خیموں کے سامنے اور صحرا میں بہنے والے نالے کے کنارے ٹھنڈی اور ننگی ریت پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ مغرب کی طرف سے شب کا سینہ چیرتے دو سوار نمودار ہوئے۔

وہ دونوں اسلامی لشکر کے مخبر تھے۔ قریب آ کر وہ دونوں اپنے گھوڑوں سے اتر گئے۔ پھر اپنے گھوڑوں کو چھوڑ کر وہ اور نزدیک آئے اور ان میں سے ایک نے حسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سیّدی! ہم دشمن کے پورے محل و قوع کا پتہ کر کے آئے ہیں۔ دشمن کا متحدہ لشکر اس وقت صطفورا شہر سے پانچ میل مشرق میں خیمہ زن ہے لشکر کی تعداد اس قدر ہے کہ اس کا ایک سرا صحرا کے اندر اور دوسرا شہر کی فصیل سے ملا ہوا ہے۔ شہر کا مشرقی دروازہ انہوں نے کھول رکھا ہے اور اسی دروازے سے انہیں رسد و کمک فراہم ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ مالٹا، اندلس، صقلیہ، کارسیکا اور سارڈینیا کے سامانِ حرب و ضرب سے لدے کئی جہاز سمندر کے کنارے کھڑے ہیں۔ سامان سے لدے ہوئے یہ جہاز بھی دشمن کی تقویت اور قوت کا سبب ہیں کیونکہ انہوں نے ٹھان رکھی ہے کہ شکست کی صورت میں وہ ان جہازوں کے ذریعے اپنی جانیں بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔

مخبر ذرا رکا پھر کہا۔ "میرے آقا! اس کے علاوہ مغرب کے کوہستانوں کی طرف سے

شفاف پانی کا بہہ کر آنے والا ایک نالہ بھی شہر کے اندر داخل ہوتا ہے اور اس حصے میں لوہے کا ایک مضبوط جنگلہ ہے۔ یہ راستہ بھی ہمارے لیے سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ شہر کے اس حصّے پر قبضہ کرنے کے بعد ہم لوہے کے اس مضبوط جنگلے کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں۔

مخبر خاموش ہوا۔ پھر وہ حسان کے سر کا اشارہ پا کر اپنے ساتھی کے ساتھ وہاں سے لشکر کے اندر اپنی قیام گاہ کی طرف چلا گیا تھا۔ حسان چند ثانیوں تک گردن کو خم کیے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور غور سے احمد اور دوسرے سالاروں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "میرے ساتھیو! میرے رفیقو! میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔ میرا دل کہتا ہے۔ اس سے ہمیں شہر فتح کرنے میں زیادہ مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔ شاید تم لوگ بھی اسے پسند کرو۔

سنو میرے باجبروت ساتھیو! شہر کے شمال میں سمندر کے کنارے اندلس، صقلیہ، کارسیکا، سارڈینیا اور مالٹا سے آنے والے لشکروں کے جہاز کھڑے ہیں اور شہر کے جنوبی حصّے میں شفاف پانی کا وہ نالہ داخل ہوتا ہے جو کوہستان اور اس کی طرف سے آتا ہے اور اسی پانی پر اہلِ شہر کا انحصار ہے۔ اگر دشمن کھلے میدان میں ہم سے شکست کھانے کے بعد قلعہ بند ہو جائے تو ہمارے سامنے دو راستے ہوں گے۔

اولاً شہر کے شمال میں سمندر کے اندر کھڑے دشمن کے بحری جہازوں کو آگ دی جائے اس طرح اہل شہر اور ان کے لشکر کی توجہ شمال کی طرف ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے جہازوں کو بچانے کی کوشش بھی کریں۔ ایسی صورت میں ہم کسی طور اس آہنی جنگلے کو اکھاڑ کر پھینکیں جہاں سے نالے کا پانی شہر میں داخل ہوتا ہے اور اسی راستے سے اندر گھس کر ہم شہر پر قبضہ کر لیں۔

ثانیاً اگر دشمن پھر زیر نہ ہو، اپنے جلتے جہازوں کی طرف توجہ نہ دے اور ہمیں نالے کا آہنی جنگلہ اکھاڑنے کی مہلت نہ دے تو آخری حربے کے طور پر شہر میں داخل ہونے والے پانی کے نالے کا رخ بدل دیا جائے اور اسے شہر سے باہر ہی باہر سمندر میں پھینک دیا

جلئے تو دشمن ہمارے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور ہوگا اور بآسانی شہر ہمارے حوالے کر دے گا۔"

حسان خاموش ہوا پھر اپنے سامنے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا "تم میں سے اس لائحہ عمل پر کسی کو کوئی اعتراض ہو تو کہو۔ ہو سکتا ہے ہم سب مل کر اس سے بھی کوئی بہتر تجویز اور مناسب راستہ اختیار کر سکیں۔"

احمد نے غور سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان سب کے چہرے پر اطمینان اور رضامندی کا اظہار تھا۔ احمد نے حسان کو مخاطب کر کے کہا "یا امیر! ہم آپ کی اس رائے سے مکمل اتفاق کرتے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس طور سے ہم ایک ہی روز میں صطفورا شہر کو اپنی گرفت میں لے لیں گے۔ بشرطیکہ جنگ کی ابتدا کسی مناسب وقت پر کی جائے۔"

حسان نے چونک کر پوچھا "مناسب وقت سے تمہاری کیا مراد ہے؟" احمد نے رازداری سے کہا "میرا ارادہ ہے ہم کل سورج طلوع ہونے کے بعد اپنی پوری جنگی تیاریوں کے بعد۔ یہاں سے کوچ کریں اور دوپہر کے وقت جب کہ گرمی اور سورج کی شدت اپنے عروج پر ہو پڑاؤ کیے بغیر دشمن پر حملہ کر دیا جائے۔ شام تک ہر حال میں ہمیں دشمن کو شکست دے دینی چاہئیے اور جب وہ قلعہ بند ہو جائے تو ہمیں فوراً شہر کے جنوب میں نالے کے کنارے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کرنا چاہئیے۔ یہاں سے ہمیں دو ایسے گروہ تشکیل دینے چاہئیں جن میں سے ایک شہر کے شمال میں سمندر کے اندر کھڑے بحری جہازوں کو آگ لگا کر دشمن کی توجہ اس طرف کر دے۔ اسی وقت لشکر شہر کے جنوبی حصے پر بھرپور حملہ کر دے اور اسی حملے اور افراتفری کے عالم میں دوسرا گروہ نالے کے آہنی جنگلے کو اکھاڑ کر اپنے لشکر کو شہر میں داخل ہونے کا موقع فراہم کرے۔"

احمد کے خاموش ہونے پر حسان نے کہا "مجھے تمہاری اس تجویز سے مکمل اتفاق ہے۔ اب یہ فیصلہ بھی تم سب مل کر کرو کہ تم میں سے کون جہازوں کو آگ لگانے اور کون نالے کا آہنی جنگلہ اکھاڑنے والے گروہ کا سرخیل ہوگا۔"

میمنہ کے سالار عروج بن بشر نے فوراً کہا "دشمن کے جہازوں کو آگ لگانے

کی ذمہ داری مجھ پر ڈالیے، میں اسے احسن طریقے سے ادا کر لوں گا۔ میں ایک اچھا تیراک ہوں۔ نکہ کے ساحل پر میں کبھی ایک مچھیرے کا پیشہ کرتا تھا۔ خطرے کی صورت میں سمندر کی ایک خاصی مسافت تیر کر میں سمندر سے باہر بھی آ سکتا ہوں۔ اس مقصد کے لیے جو جوان مجھے مہیا کیے جائیں وہ بھی اگر اچھے تیراک ہوں تو میرا کام اور سہل ہو جائے گا۔"

حسان نے عروج بن بشر کے شانے پر شفقت اور پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میں تمہارے اس دینی اور ملی جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ تمہیں ایسے مناسب جوان فراہم کیے جائیں گے جو خوب تیراک ہوں۔ تم کل صبح سویرے ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہم سے علیحدہ ہو جانا۔ شہر سے باہر مچھیروں کی کئی بستیاں ہوں گی۔ انہیں مناسب معاوضہ دے کر ان سے کشتیاں حاصل کر لینا۔ پھر اپنے کسی آدمی کو بھیج کر مجھ سے رابطہ قائم کرنا تاکہ میں تمہیں بتا سکوں تمہارے حملہ آور ہونے کا بہترین وقت کون سا ہے۔"

حسان جب اپنی بات مکمل کر چکا تو احمد نے کہا "آہنی جنگلہ اکھاڑنے کی مہم مجھ پر ڈال دیجئے۔ منجنیقوں کے رسّے ہمارے پاس پہلے ہی ہیں ان کی مدد سے ہم اپنی مہم کو بآسانی سر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

حسان نے چلا کر کہا "احمد! احمد! خدا کی قسم مجھے تم سے ایسی ہی بات کی توقع تھی۔ میں جانتا ہوں یہ مہم زیادہ سخت خطرناک اور جان لیوا ہے اور میرے ترکش میں تم سے بہتر کوئی ایسا تیر نہیں ہے جو میں اس خطرناک سمت چلا سکوں۔ اب تم سب اٹھو اور جا کر آرام کرو۔" سب سالار اٹھ کر چلے گئے۔ حسان اور احمد بھی اپنے خیموں کی طرف جا رہے تھے۔



لشکر نے رات بھر صحرا کے اس حصے میں آرام کیا۔ دوسرے روز فجر کی نماز کے بعد میمنہ کا سالار عروج بن بشر چند دستوں کے ساتھ جن میں اچھے تیراک جوان شامل تھے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ ماہی گیروں کی بستیوں کی طرف چلا گیا۔ جب سورج خوب چڑھ آیا تو حسان اور احمد نے لشکر کے ساتھ کوچ کیا اور صطفورا شہر کی طرف بڑھے۔ ان کی رفتار سست

تھی - عین اس وقت جب کہ سورج سر پہ چمک رہا تھا اور گرمی ہر شے کو جھلسا رہی تھی اسلامی لشکر اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ حملہ آور ہو گیا تھا - پہلے سے طے شدہ تجویز کے مطابق حملہ آور ہوتے وقت لشکر آپ ہی آپ دو حصوں میں بٹ گیا تھا - ایک حصہ حسان اور دوسرا احمد کے تحت دشمن کے اندر تک گھستا چلا گیا تھا -

اس دِل فگار اور سلگتی دوپہر میں کھلی آستینوں والے عرب اپنے ماضی و فردا کو ایک کر کے عروج عظمتِ آدمیت اور اکسیرِ خاک آدم کی خاطر اپنے دلیرانہ حملوں سے عظمتوں کی ایک نئی دُنیا آباد کر رہے تھے - ان کے حملوں میں ذہنی وسعت اور قہرمانیت تھی ان کی تکبیروں میں جیت کی تمہید اور ان کے جذبوں میں ربِ تبارک و تعالیٰ کی ودیعت کی ہوئی مقصدیت تھی -

صحرا کی گرمی عربوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی لیکن دشمن اس چلچلاتی دوپہر میں کھل کر نہ لڑ سکا - ان کا لشکر موم کی طرح پگھل پگھل کر ختم ہونے لگا اور صحرا کے لب آب خواہ خون سے رنگین اور سُرخ ہونے لگے تھے - ہر طرف ایک افراتفری اور ہاہو مچ گئی تھی -

شام تک دشمن کا متحدہ لشکر پوری طرح شکست کھانے کے بعد بھاگ کر شہر میں گھس گیا اور محصور ہو کر جنگ کرنے لگا - انہیں اُمید تھی کہ وہ شہر میں محصور رہ کر مسلمانوں کے حملوں کی روک تھام کر لیں گے لیکن قدرت کائنات کی تقدیر کے قرطاس پہ کچھ اور ہی تحریریں ثبت کر چکی تھی - حسان اور احمد اپنے لشکر کو لے کر شہر کے جنوب کی طرف چلے گئے تھے -



رات اپنے پورے عروج کے ساتھ نازل ہوئی تھی - کو بہ کو کہر کے آنچل پھیل گئے تھے - زمین کے رخساروں پہ گورِ غریباں جیسی اُداسی اور فکر مندی بکھر گئی تھی - گہرے خاکستری رنگ کے صحرائی پرندے غیر سرزمینوں اور اجنبی دیسوں کی طرف سے لوٹتے ، تیرگی کا سینہ چیرتے اور نغماتِ عبودیت گاتے مغرب کی طرف جا رہے تھے -

اسلامی لشکر شہر کے جنوب میں فصیل سے ذرا پیچھے ہٹ کر شہر میں داخل ہونے والے نالے کے کنارے خیمہ زن ہو چکا تھا - چاروں طرف صحرا کے اندر بے صدا سمندر کا سا سکوت تھا - ہر شے پر ایک اسرارِ مخفی طاری تھا جیسے اُفق بہ اُفق پھیلے ہوئے قدرت کے جنگجو عناصر حکمت و ادراک کی کئی راہیں تلاش کر رہے ہوں - مصطفورا شہر کی سایہ سایہ سی فصیل کے اُوپر قندیلیں اور مشعلیں روشن تھی اور دشمن اسلامی لشکر پہ گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا -

حسان اور احمد اپنے خیموں سے باہر نالے کے کنارے ٹھنڈی ریت پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک گھوڑ سوار اپنے گھوڑے کو بھگاتا ہوا وہاں آیا - اپنے گھوڑے سے وہ اُترا اور حسان کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے کہا - " اے امیر ! میں عروج بن بشر کی طرف سے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں - ہم ماہی گیروں سے اپنے لیے مناسب کشتیاں مناسب اُجرت پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں - اس وقت سمندر کے کنارے ہمارے ساتھی کشتیوں کے ساتھ کھڑے آپ کے اگلے حکم کے منتظر ہیں -

حسان اور احمد دونوں کھڑے ہو گئے -

حسان آنے والے اس سوار کے قریب گیا اور سرگوشی میں اس سے کہا " عروج بن بشر سے جا کر کہو کہ فوراً اپنی مہم کا آغاز کر دے - اپنی کشتیوں کو دشمن کے جہازوں کے قریب مناسب فاصلے پرلے جا کر ان پر آتشی تیر برسائے جب دیکھے کہ جہاز آگ پکڑ گئے ہیں تو فوراً وہاں سے پیچھے ہٹ جائے تاکہ وہ دشمن کی نگاہوں میں نہ آئے - کشتیاں ماہی گیروں کے حوالے کرنے اور انہیں معاوضہ ادا کرنے کے بعد وہ لشکر میں واپس آجائے - اس وقت تک ہم بھی اپنے عمل کی ابتدا کر چکے ہوں گے - اس وقت دشمن شہر کی فصیل کے جنوبی حصّے کی طرف پوری رُخ متوجہ ہے - جہازوں کو آگ لگ جانے کی صورت میں اس کی توجہ جنوب سے شمال کی طرف اپنے جلتے جہازوں کی طرف مرکوز ہو جائے گی اور جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں اسے ہم بہترین اور کامیاب انداز میں کر سکیں گے -

اب تم لوٹ جاؤ۔ خداوندِ دو عالم تمہاری سعی کو جامع و مربوط اور تمہاری قوت و عظمت کو پُرشکوہ علامت بنادے گا۔ عروج بن بشر سے کہنا۔ مذہب کی خدمت اور ملت کی استواری کے ایسے مواقع بار بار میسّر نہیں آتے۔ اللہ تم سب کو اپنی خصوصی رحمتوں سے نوازے گا۔

عروج بن بشر کی طرف سے آنے والا جوان اپنے گھوڑے پر سوار ہُوا اور جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی روانہ ہو گیا۔ حسان نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "احمد! احمد! اس شہر کے مقدّر کی لوح اب کھلنے والی ہے۔ آؤ ہم بھی دریائے اضطراب کی طرح اپنے کام کی ابتدا کریں۔

دونوں نالے کے کنارے کنارے جنوب کی طرف بڑھنے لگے۔ چند قدم آگے جا کر انہوں نے دیکھا وہاں کنارے کی ٹھنڈی ریت پر چند جوان گول دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے اور ان کے درمیان لمبے لمبے رسّوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان کے قریب آکر احمد نے پُوچھا "کیا تم لوگ تیار ہو"۔

وہ سب کھڑے ہو گئے پھر ان میں سے ایک نے کہا "اے امیر! ہم اپنے کام کی ابتدا کے لیے تیار ہیں"۔ احمد نے حسان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یا امیر! میں اپنے کام کی ابتدا کرتا ہوں، اتنی دیر تک آپ رتھوں میں گھوڑوں کو جتوا کر تیار رکھیں۔ جونہی عروج بن بشر کا عمل مکمل ہو ہمیں اپنے فعل کی ابتدا کر دینی چاہیے۔ اللہ پاک ہمارا حامی وناصر ہو گا"۔

حسان نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "تم لوگ اپنے رب کا نام لے کر شروع ہو جاؤ، تمہاری واپسی تک میں بھی اپنے کام کی تکمیل کر چکا ہوں گا۔ یاد رکھو تمہاری مہم جس قدر کٹھن اور مشکل ہے اسی قدر اس میں ہماری ملّت کی فلاح اور بہتری پنہاں ہے۔"

حسان پیچھے ہٹ گیا۔ احمد ان جوانوں کے ساتھ ریت پر پڑے لمبے لمبے رسّے اُٹھا کر نالے کے تیزی سے بہتے ہوئے پانی میں اتر گیا تھا۔ اپنی ڈھالیں انہوں نے اپنے سروں پر باندھ لی تھیں۔



دشمن مشعلوں کی روشنی میں فصیل کے جنوبی حصّے میں غیر معمولی طور پر چوکس تھا۔ اسلامی لشکر چونکہ شہر کے جنوب کی طرف پڑاؤ کیے ہوئے تھا۔ لہٰذا اصطفورا کے محافظ بھی جنوبی حصّے پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

شہر میں داخل ہونے والے اس شفاف پانی کے نالے کی گہرائی کہیں بہت زیادہ اور کہیں کم تھی۔ احمد اور اس کے ساتھی اپنے کندھوں پر رسّے لٹکائے کہیں تیرتے اور کہیں نالے کے اندر چلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ فضاؤں میں گہری تاریکی تھی۔ فصیل پر پہرہ دینے والوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے وہ پانی میں بے آواز آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے سروں پر بندھی ہوئی ڈھالیں ان کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ تھیں جو انہیں دشمن کی تیر اندازی سے محفوظ رکھ سکتی تھیں۔

احمد اور اس کے ساتھی اپنے جسموں کو پانی میں چھپائے اور صرف ڈھال سے ڈھکا ہوا سر باہر رکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ لوہے کے اس مضبوط جنگلے کے پاس پہنچ گئے جو فصیل کے اندر نصب تھا اور جس میں سے پانی شہر میں داخل ہوتا تھا۔ انہوں نے چار رسّے لوہے کے اس جنگلے سے باندھ دیئے اور باقی رسّوں کو ان چار رسّوں سے باندھ کر انہیں لمبا کرتے ہوئے وہ اپنے پڑاؤ کی طرف واپس جا رہے تھے۔

پانی سے نکل کر جب وہ اس جگہ آئے جہاں سے وہ نالے میں کُودے تھے تو انہوں نے دیکھا وہاں چار جنگی رتھیں کھڑی تھیں اور ہر رتھ میں چار گھوڑے جُتے ہوئے تھے اور ان چار رتھوں کے پاس لشکر کا سپہ سالار حسان بن نعمان کھڑا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کسی پاسبان کا سا عقابی پن تھا۔

آگے بڑھتے ہوئے وہ فوراً اُن کی طرف لپکا اور احمد کے قریب آکر وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ احمد خود ہی بول پڑا "یا امیر! ہم اپنا کام مکمل کر چکے ہیں"۔ حسان نے آگے

بڑھ کر احمد کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔" خدا تم لوگوں کو اس کام کا اجر دے گا۔ تم سب اپنے لباس تبدیل کرو۔ اتنی دیر تک میں ان رسوں کو رتھوں سے بندھواتا ہوں۔"

احمد اور اس کے ساتھی اپنے لباس تبدیل کرنے کے لیے اپنے خیموں کی طرف چلے گئے تھے۔ حسان کے اشارے پر چند جوان آگے بڑھے اور وہ چاروں رسّے لے کر انہوں نے رتھوں کے ساتھ کس کر باندھ دیئے تھے۔

احمد جب لباس تبدیل کر کے باہر آیا تو اس نے دیکھا رسّے چار رتھوں کے ساتھ بندھ چکے تھے اور لشکر حملہ آور ہونے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ احمد حسان کے پاس آ کھڑا ہوا اور دونوں جنگ کے لائحہ عمل سے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ یہاں تک کہ صطفورا شہر کے شمال میں سمندر کے اندر انہیں آگ کے شعلے آسمان کی طرف لپکتے دکھائی دیئے جس کا مطلب تھا کہ عروج بن بشر دشمن کے جہازوں کو آگ لگانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔

فصیل کے اوپر جنوب سے شمال کی طرف ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ اسی لمحہ حسان نے چلّا کر کہا۔" رتھوں کو ہانک دو۔" رتھ بان حرکت میں آئے اور چاروں رتھوں کے سولہ گھوڑوں کو انہوں نے بُری طرح ہانک دیا تھا۔

تھوڑی دیر تک گھوڑے ہنہنائے اور زور لگاتے رہے یہاں تک کہ رتھوں کے ساتھ بندھے ہوئے رسّے ڈھیلے پڑ گئے اور گھوڑے آگے کو بھاگ کھڑے ہوئے۔ گھوڑے جب کافی آگے نکل گئے تو انہیں روک دیا گیا کیونکہ لوہے کا وہ مضبوط جنگلہ فصیل کے اندر سے اکھڑ چکا تھا اور پانی سے نکل کر وہ ریت پر گھسٹتا جا رہا تھا۔

پہلے رسّوں کو علیحدہ کر کے لپیٹ دیا گیا اس کے بعد حسان بن نعمان نے شہر پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ لشکر آناً فاناً دو حصّوں میں بٹ گیا تھا۔ آدھا حصّہ حسان اور آدھا احمد کی سرکردگی میں جنگ کی ابتدا کر چکا تھا۔ شہر پہ منجنیقوں سے پتھر اور تیر برسانے کا عمل تیزی سے شروع ہو گیا تھا۔

دشمن کے جہازوں کو آگ لگانے کے بعد عروج بن بشر بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ لشکر میں آ شامل ہوا تھا۔ ایک طوفان تھا جو ہر سو اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

تیروں اور پتھروں کی تیز اور طوفانی بارش کے اندر لشکر کے اس حصّے نے جو احمد کے تحت جنگ کر رہا تھا تیر برسانے بند کر دیئے تھے اور احمد کی سرکردگی میں نالے میں اتر کر آگے بڑھنے لگے تھے۔ انہوں نے اپنی ڈھالیں اپنے سروں پر باندھ لی تھیں۔ اس طرح وہ گھُپ اندھیرے میں دشمن کی تیر اندازی سے محفوظ رہ کر آگے بڑھتے رہے۔ احمد ان کے آگے آگے تھا۔

جہاں نالہ فصیل کے نیچے سے گزرتا تھا وہاں آ کر احمد نے دیکھا پانی وہاں شور کرتا ہوا شہر میں داخل ہو رہا تھا۔ احمد تیرتا ہوا آگے بڑھ گیا اور شہر میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھی دور دور تک اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

حسان بن نعمان ابھی تک پتھروں اور تیروں کی تیز بارش کر کے دشمن کو پوری طرح اپنے ساتھ الجھائے ہوئے تھا۔ شاید اس طرح دشمن کو اپنے ساتھ مصروفِ پیکار رکھ کر وہ احمد کو شہر کے اندر پاؤں جمانے کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کرنا چاہتا تھا۔

فصیل کے قریب ہی ایک قدرے تاریک جگہ احمد نالے سے نکل کر کنارے پہ چڑھ گیا۔ اس کے ساتھی بھی نالے سے نکل کر اس کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ اب یہ ایک سلسلہ سا شروع ہو گیا تھا اور لمحہ بہ لمحہ شہر کے اندر اسلامی لشکر کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔

جب شہر میں داخل ہونے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تو احمد حرکت میں آیا۔ ابھی وہ کوئی قدم اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ فصیل کے اوپر سے کسی نے انہیں دیکھ لیا اور شور کرنے لگا۔" مسلمان پانی کے نالے کے ذریعے شہر میں داخل ہو گئے ہیں۔"

شہر میں مسلمانوں کی آمد سے شہر کے اندر اور فصیل کے اوپر ایک شور سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ شہر کے اندر دشمن کے محفوظ دستے حرکت میں آئے تھے اور انہوں نے احمد پہ حملہ کر دیا تھا لیکن پہلے ہی ٹکراؤ میں احمد نے انہیں عبرت خیز شکست دی اور انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

لشکر کے کئی حصّے فصیل سے نیچے اتر کر اپنے ساتھیوں کی مدد کو آگے بڑھے تھے جب کہ احمد کسی پُر تلاطم دریا کی طرح یلغار کرتا ہوا اب اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں شہر پناہ کا

جنوبی دروازہ تھا۔

فصیل کے اُوپر سے اب ایک ریلے کی صورت میں دشمن کے دستے نیچے اُترنا شروع ہوگئے تھے۔ ایک بار اُنھوں نے پھر متحدہ ہوکر احمد کو اس طرف بڑھنے سے روکنا چاہا جہاں شہر کا جنوبی دروازہ تھا۔ نالے کے ذریعے مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا اور ان کی قوت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ احمد کو جب خبر ہوئی کہ دشمن اپنی پوری قوت سے اس کی راہ میں حائل ہوگیا ہے اور فصیل سے اُترنے والے اور شہر کی حفاظت کرنے والے دستے بھی راستہ روکنے والے دشمن کے لشکر میں شامل ہو رہے تھے تو ایک جگہ رُک کر اس نے اپنے لشکر کا جائزہ لے کر اسے منظم کیا پھر اس نے اپنی گونجتی آواز میں تکبیر بلند کی جس کے جواب میں دور نالے تک کوہ شکن تکبیریں بلند ہونے لگی تھیں۔

مسلمان مجاہدین بلند آوازوں میں اپنے رب کو پکار رہے تھے۔ صفطورا شہر کے ا
یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو یا کسی کیمیا گر نے ناموسِ اکبر او
صورِ اسرافیل پھونک کر شہر کی قسمت اور اس کی تقدیر کے لکھے حروف کو بدل دینے کا پ
عزم کر لیا ہو۔

تکبیریں بلند کرتا ہوا احمد اپنے لشکر کے ساتھ دشمن پر اس طرح حملہ آور ہوا جیسے وقت کی تیز یلغار، جیسے صموم و سرسر، سو بہ سو ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ مسلمان اپنے رب کو پکارتے ہوئے تسخیرِ قلب اور سحر انگیزی کا عزم کر چکے تھے۔ رات خاموش تھی اور وقت کسی جنو
ساحر کی طرح مسلمانوں کو اپنی شامِ غریباں صبحِ وطن میں تبدیل کرتے دیکھ رہا تھا۔

وہ اسلوبوں کے رہبر بن کر حملہ آور ہو رہے تھے اور کبرِ ابلیس توڑ کر انہوں نے ہر سمت استعجاب آمیز کیفیت طاری کر دی تھی۔ جس طرح صحرا میں سفر کرنے والا کوئی بدو سا
صحرائی فاصلوں کو سمیٹنے کے لیے حدی خوانی کا سہارا لیتا ہے، جس طرح کوئی سمندری مسافر رات کی تاریکی میں ستاروں کو رہبر بنا کر اپنی منزل کے فاصلوں کو سمیٹتا ہے۔ ایسے ہی مسلمان مجاہدین بھی اپنے سینوں کے طاق میں اوج و علا جذبے لیے اور تکبیریں بلند کرتے ہوئے دشمن کے غرور، تمکنت جہل و مکر، وسواس و بدگمانی اور ہر فریب و مغالطے کو سمیٹنے لگے تھے۔ ا

یہ حملوں کے آغاز میں جیت کی تمہید اور انجام میں سحر طرازی تھی۔ جس طرح شب کے درزوں میں سحر تانک جھانک کرتی ہے ایسے ہی فتح و نصرت اپنے پورے لحن اور شدید و محکم صورت کے ساتھ ان کا استقبال کر رہی تھی۔

احمد راستے میں آنے والے دشمن کے لشکر کو کاٹتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ دشمن کے آدھے سے زیادہ جوان کھلی آستینوں والے عربوں کی خمدار تلواروں کا شکار ہوگئے اور جو بچ رہے وہ اپنی جانیں بچانے کی خاطر اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔

فصیل کے اُوپر پھیلے ہوئے دشمن نے جب اپنے لشکر کا یہ انجام دیکھا تو وہ بڑی تیزی سے نیچے کی طرف لپکا تھا۔ صرف حسان کا مقابلہ کرنے کے لیے جنوبی دستے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جب کہ مشرق و مغرب اور شمال کی طرف سے سارے لشکر فصیل خالی کرکے احمد کی طرف بڑھے تھے۔ دشمن کے وہ لشکری جو بحری جہازوں کی آگ پر قابو پانے کے لیے شمال کی طرف شہر سے باہر نکل کر سمندر کی طرف گئے تھے۔ مسلمانوں کے نالے کے ذریعے شہر میں داخل ہونے کی خبریں سن کر واپس لوٹ چکے تھے۔

احمد اپنے لشکر کے ساتھ دشمن کو عبرت خیز شکست دینے کے بعد آگے بڑھ گیا تھا۔ قبل اس کے کہ جلتے جہازوں کی طرف سے لوٹنے اور فصیل کے اُوپر سے اُترنے والے لشکر آگے بڑھ کر اس سے نبرد آزما ہوتے احمد نے شہر کے جنوبی دروازے کے محافظوں کا فی الفور صفایا کر کے شہر کا جنوبی دروازہ کھول دیا تھا۔ ایک تیز اور جان لیوا صحرائی طوفان کی طرح حسان بن نعمان اپنے لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوا تھا اور دشمن کے وہ لشکر جو احمد کا مقابلہ کرنے کو جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے انہیں اپنے پہلے ہی ہلے میں حسان نے اُدھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

فصیل کے جنوبی حصے میں لڑنے والا لشکر بھی نیچے اُتر گیا تھا لیکن وہ بھی مسلم مجاہدین کے ہاتھوں تہ تیغ ہو کر رہ گیا۔ تھوڑی ہی دیر کی کش مکش کے بعد شہر میں لڑنے والے مسلح جوانوں کا صفایا کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ لوگ بھاگ بھاگ کر حسان کے پاس آنے لگے اور امان طلب کرنے لگے۔

حسان نے مزاحمت کرنے والے تمام مسلح جوانوں کا صفایا کرنے کے بعد عام معافی کا اعلان کر دیا تھا۔ کسی کے مال و جان اور عزت و ناموس سے کوئی تعرض نہ کیا گیا تھا۔ اہلِ شہر مسلمانوں کے اس عمدہ کردار سے متاثر ہوئے اور جوق در جوق حسان کے پاس آکر اسلام قبول کرنے لگے۔

صطفورا کی فتح پر اہلِ تبرزت نے بھی اطاعت قبول کر لی دونوں شہروں کا نظم وضبط درست کرنے کی خاطر حسان اور احمد نے کئی روز تک صطفورا میں قیام کیا۔ اس دوران دونوں شہروں کی آبادی میں سے اکثریت نے اسلام قبول کر لیا تھا۔





اسلامی لشکر اسی طرح شہر کے جنوبی صحرائی حصے میں خیمہ زن تھا۔ صطفورا شہر کے ذاتی لشکر کے علاوہ مالٹا، اندلس، صقلیہ، کارسیکا اور سارڈینیا سے آئے مذہبی جنونیوں اور جنگ جُو رومنوں کو چونکہ قتل کیا جا چکا تھا اس لیے شہر میں کوئی ایسی مسلح انفرادی قوت نہ رہی تھی جو شہر کے دروازے بند کر کے اور دوبارہ محصور ہو کر مسلمانوں کے خلاف رزم آرائی کر سکے لہٰذا اسلامی لشکر کو شہر کے اندر پڑاؤ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔

شہر کا جنوبی حصہ جس طرف سے پانی کا نالہ اندر داخل ہوتا تھا بالکل صحرائی تھا اور دور دور تک ریت کے ٹیلے کوہستان اور اس کے ان معاونوں کی طرف چلے گئے تھے جہاں سے چشموں کا پانی نالے کی صورت میں آتا تھا تاہم شہر کے استعمال شدہ پانی سے شہر کے مغربی اور مشرقی حصے کو قابلِ زراعت بنایا گیا تھا اور دور دور تک فصلوں کے طویل سلسلے پھیلے ہوئے تھے جن سے اہلِ شہر کی گزر بسر ہوتی تھی۔ مسلمانوں نے فصلوں کو نقصان پہنچانے کے بجائے ان کی دیکھ بھال کی تھی۔

ایک روز جب کہ رات ہو چکی تھی احمد اپنے خیمے میں اکیلا بیٹھا نہ جانے کن خیالوں میں غرق تھا۔ فضاؤں کے اندر ایک ویران راہ گزر کی سی اتھاہ خاموشی اور اماتی تصورات جیسا سکون آفرین سکوت چھایا ہوا تھا۔ رات چاندنی تھی۔ بدر کامل اپنی تمام پُر اسرار خوابیدہ کہانیوں کے ساتھ فضاؤں کے کہر آلود سمندر سے برسرِ پیکار تھا۔ ستارے آسمان پر سدا فروزاں شعلوں کی طرح جھلملاتے ہوئے اپنے آغاز و انجام کے ذو فنون اور مبہم گیت گاتے ہوئے اپنی حدیثِ دل کہہ رہے تھے۔ پانی کا وہ بوڑھا اور قدیم نالہ صحرا کے اندر ریت کے ٹیلوں کے بیچ و بیچ کسی پیر فرزانہ کی طرح بل کھاتا ہوا دُور جنوب کی طرف چلا گیا تھا۔

احمد اسی طرح اپنے خیالات میں غرق تھا کہ اس کے خیمے میں اس کا چھوٹا بھائی خصیب داخل ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور جوان بھی تھا جو بے حد وجیہہ، خوش رو اور شکیل و حسین تھا۔ ان دونوں کی آمد پر احمد چونکا اور اپنے دائیں طرف چٹائی پر ہاتھ مارتے ہوئے اس نے کہا۔ "آؤ بیٹھو۔"

وہ دونوں خاموشی سے احمد کے قریب بیٹھ گئے۔ اس جوان کی طرف اشارہ کر کے خصیب نے احمد سے کہا۔ "یا امیر! یہ میرا دوست خالد بن یزید ہے۔ یہ بنی قیس سے ہے اور میرے ساتھ ہی جہاد میں حصہ لے رہا ہے۔ میں آپ سے کچھ کہنے حاضر ہوا ہوں۔"

احمد مسکرایا پھر پُر سکون ہوا جیسے نرم لہجے میں اس نے کہا۔ "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

شب کے گہرے حصار میں خصیب کی آواز گونجی وہ احمد سے کہہ رہا تھا۔
"یا امیر! یہ زیست آنی جانی ہے۔ اس تنگنائے زندگی میں انسانی حیات چراغوں کے افسردہ دھوئیں کی طرح تحلیل ہوتی جا رہی ہے۔ میں بہت پہلے آپ سے گفتگو کر چکا ہوتا لیکن آپ کو جنگوں میں لگاتار مصروف دیکھ کر میں کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔ اب جب کہ ہم صطفورا شہر کو فتح کر چکے ہیں اور کسی اگلی مہم کا تعین کرنے کے لیے وقت لگے گا۔ لہٰذا مجھے میرے بھائی احمد کے متعلق کچھ بتائیے تاکہ میں اسے تلاش کر سکوں۔"

خصیب کے ساتھ آنے والے جوان خالد نے بھی احمد کو مخاطب کر کے کہا۔
"اے امیر! اگر آپ اس کے بھائی کے متعلق کچھ جانتے ہیں تو بتائیے تاکہ اسے تلاش کیا جا سکے اس کام میں خصیب کی میں بھی مدد کروں گا۔"

احمد نے خصیب کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اے رفیقِ من! میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے خبر نہیں تمہارا بھائی اس وقت کہاں ہے۔ تاہم میں ایک روز تمہارے لیے اسے ضرور تلاش کر کے تمہارے ماں باپ کے پاس لے جاؤں گا۔"

خصیب مایوسی میں راکھ سے کشتہ ہو کر رہ گیا۔ اشکِ یتیماں جیسے تپتے لہجے میں اس نے کہا "یا امیر! کہیں ایسا تو نہیں میرے بھائی کو کچھ ہو چکا ہو اور آپ مجھے اور میرے ماں باپ کو بہلانے کی خاطر جھوٹی تسلیاں دے رہے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یاد رکھئے وقتی طور پر میرے ماں باپ پُرسکون تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کے ذہن میں تخم ریزی کرنے والے مسموم وہموں اور ان کی رُوحوں میں اُٹھنے والے طوفانوں کو کون روکے گا۔

یا امیر! میں نے آپ سے کہا تھا۔ احمد میرا ایسا بھائی ہے جسے میرے ماں باپ اپنی جان اپنی رُوح سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ خدا کے لیے مجھے وہموں میں نہ ڈالیے۔ میرا وہ بھائی میرے ماں باپ کے لیے امرت کا خزانہ تھا۔ اگر آپ جانتے ہیں کہ وہ کہاں ہے تو بتائیے کہ میں اسے تلاش کر کے لا سکوں۔ کیونکہ اسے خبر نہیں ہم کہاں آباد ہو چکے ہیں لہٰذا وہ ان راستوں سے ناواقف ہے جو ہمارے گھر کی طرف جاتے ہیں اور اگر وہ اس دُنیا میں نہیں ہے تو بھی مجھے بتائیے کہ میں اپنے ماں باپ کی تسلی کر سکوں۔"

احمد نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ "میرے عزیز! اَلْوَقْتُ سَیْفٌ قَاطِعٌ (وقت ایک کاٹنے والی تلوار ہے) اور ایک روز یہی وقت ان پردوں کو کاٹ دے گا جو تمہارے بھائی اور تم لوگوں کے درمیان حائل ہیں۔

لاریب! میں نہیں جانتا اس وقت تمہارا بھائی کہاں ہے۔ لیکن قسم مجھے اپنے اس خداوند کی جو فکر و دانش کا سرِ عظیم ہے، تمہارا بھائی زندہ ہے اور ایک روز میں تم لوگوں کی خاطر اسے ضرور تلاش کر لوں گا۔"

خصیب نے دِل شکستہ کی سی غماز آواز اور عاصی و عاجز سے لہجے میں کہا۔
"یا امیر! کب آپ ایسا کریں گے جب کئی دِل ٹوٹ چکے ہوں گے اور امیدیں راکھ کا ڈھیر بن چکی ہوں گی۔

یاد رکھیے! دل، دودھ اور موتی ایک بار پھٹ کر جڑتے نہیں ہیں۔ میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ آپ جہاد جیسا مقدّس فریضہ چھوڑ کر میرے بھائی کی تلاش شروع کر دیں۔ میں چاہتا ہوں مجھے آپ اس کا کچھ اَتہ پتہ بتادیں کہ میں خود اپنے اس گم شدہ موتی کو تلاش کرنے کی سعی کروں۔ اس کے بغیر ہماری راتیں ٹوٹے دل کی طرح اداس اور دِن گہن لگے چاند کی طرح افسردہ و غمگین ہیں۔

کاش میں آپ کو بتا سکتا کہ وہ ہمارے خاندان کے لیے کیا تھا۔ وہ ایک ایسا بیٹا تھا جو لمحوں کے اندر ستاروں کو آفتاب بنا دے۔ وہ ایک ایسا بھائی تھا جو اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے ساتھ ہم آہنگی کا جذبہ اور خیالوں کی گہرائی رکھتا تھا۔ کاش میں اسے تلاش کر سکتا۔ کاش اب تک میں اسے ڈھونڈ کر اپنے ماں باپ کے پاس لے جاچکا ہوتا۔ ہائے حیف! کیسی بدقسمتی ہے ہماری، کیسا بے نوائی کا عالم ہے ہمارا۔ میرا بھائی جو ہمارے لیے ایک محکم قلعہ تھا ہم سے بچھڑ گیا ہے۔

خصیب کی آنکھیں جھلملاتی شمع جیسی ہو کر پرنم ہو گئی تھیں۔ احمد کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کے ستارے چمکتے دکھائی دینے لگے۔ پھر خصیب کو تسلّی دینے کی خاطر اس نے تلخ آمیز لذت میں کہا۔ "خصیب! خصیب! گو ہم سب قانونِ قدرت کے اسیر ہیں پھر بھی اے میرے بھائی! قسم مجھے ربِ لایزال کی میں تمہیں مایوس نہ کروں گا۔ انتظار کرو ایک روز تمہارے بھائی کو میں تم سے ضرور ملاؤں گا۔"

خصیب نے تشکر آمیز نگاہوں سے احمد کو دیکھا پھر وہ اُٹھا احمد سے مصافحہ کیا اور خالد کے ساتھ خیمے سے باہر نکل گیا تھا۔ احمد پھر پہلے کی طرح انجانی یادوں میں کھو گیا تھا۔



مطفورا شہر کے سقوط، اہلِ تبرزت کی اطاعت اور دشمن کے متحدہ لشکر کی عبرت خیز شکست کے بعد رومنوں اور فرانسیسیوں نے مِل کر ایک اور لشکر کو منظم کیا اور مغرب کے دو شہروں باجہ اور بونہ کو اپنا مرکز بنا کر جنگ کی تیاری کرنے لگے تھے۔ اس بار اندلس، صقلیہ، کارسیکا، سارڈینیا اور مالٹا کے علاوہ جزیرہ اوڑس اور جزیرہ کریٹ سے بھی لشکر ان کی مدد کو پہنچ گئے تھے۔

حسان اور احمد چاہتے تھے کہ مغرب کی طرف آگے بڑھ کر رومنوں اور فرانسیسیوں کے اس متحدہ لشکر سے نبرد آزما ہوں لیکن اسی دوران لشکر کے جاسوس یہ خبر لائے کہ افریقہ کی ساحرہ ملکہ جرارہ کوہستانِ اوراس میں اپنے مسکن سے نکل کر اسلامی لشکر پر حملہ آور ہونے کے لیے شمال مغرب کی طرف بڑھ رہی ہے۔

حسان اور احمد نے فوراً اپنے لشکر کے ساتھ مطفورا شہر سے اپنا پڑاؤ اُٹھایا اور اپنی جنگی تیاری کے بعد وہ بڑی برق رفتاری کے ساتھ جنوب مشرق کی طرف بڑھے تھے۔ اصل میں وہ چاہتے تھے کہ رومنوں اور فرانسیسیوں کا متحدہ لشکر اور ملکہ جرارہ آپس میں متحد نہ ہونے پائیں۔ وہ افریقہ کی ان دونوں قوتوں کے ساتھ علیحدہ علیحدہ رزم آرائی کرنا چاہتے تھے۔ اسی غرض سے وہ انتہائی تیزی کے ساتھ جنوب مشرق کی طرف بڑھے تھے تاکہ ملکہ جرارہ کو پسپا کرنے کے بعد وہ رومنوں اور فرانسیسیوں پر بروقت قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں لیکن حالات ان کے خلاف تھے کیونکہ رومن اور فرانسیسی پہلے ہی ملکہ جرارہ سے اتحاد کر چکے تھے اور اُنہیں خبر نہ تھی۔

کوہستان اوراس کے شمال مغرب میں صحرائے تاخیلات کے اندر اسلامی لشکر کا ٹکراؤ افریقہ کی دہشت خیز ساحرہ جرارہ سے ہوا۔ یہ ملکہ پُرانے اور قدیم سفلی علوم کی ماہر تھی اور جادو میں افریقہ کے اندر اپنا کوئی ثانی و مثیل نہ رکھتی تھی۔

جب دونوں لشکر آپس میں ٹکرائے تو جادوگر جرارہ ایک مضبوط اور قلعہ نما جنگی رتھ پر سوار تھی جو ایک پالکی کی شکل میں بنائی گئی تھی۔ چاروں طرف سے اسے لکڑی کے مضبوط تختوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور ان تختوں پر لوہے کے پترے چڑھا دیئے گئے تھے۔ چاروں

طرف انسانی قد کے برابر بلندی پر برج بنائے گئے تھے اور ان برجوں کے اندر کھڑی ہو کر وہ ساحرہ جنگ کے احکام دیتی تھی۔ اس کے اس قلعہ نما رتھ کو دو اونٹ کھینچ رہے تھے۔

جنگ جب اپنے عین جوبن پر آئی تو قریب تھا کہ وہ ساحرہ اپنے لشکر کے ساتھ جنگ سے منہ موڑ پر بھاگ جائے لیکن اسی وقت باجہ اور بونہ کے متحدہ لشکر نے اچانک کہیں صحرائی گھات سے نکل کر مسلمانوں کی پشت پر حملہ کر دیا تھا۔ کریٹ اور اوڑس سے آنے والے لشکر بھی ان کی مدد کر رہے تھے۔

اس دو طرفہ حملے سے مسلمانوں میں ابتری اور انتشار پھیل گیا لشکر کی ترتیب اور شیرازہ بندی بکھر گئی۔ شاید ملکہ جرارہ اور رومنوں کے ساتھ پہلے ہی طے پا گیا تھا کہ عین جنگ کے شباب میں رومن پشت سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوں۔

مسلمانوں کی صفیں جب بکھرنے لگیں اور جنگی تنظیم قطعاً بے اثر ہو گئی تو حسان نے اس جہنم سے نکلنے کے لیے اپنے لشکر کو پسپا ہونے کا حکم دے دیا۔

اس دوران ملکہ جرارہ نے ایک زوردار حملہ کیا اور اسلامی لشکر کے ایک حصے کو گھیر کر اس کو گرفتار کر لیا۔ حسان اور احمد اپنے لشکر کو لے کر دور تک پیچھے ہٹتے چلے گئے تھے ملکہ جرارہ اور رومنوں نے اس خوف سے ان کا تعاقب نہ کیا کہ اگر کسی جگہ مسلمان قدم جما کر پھر لڑنے پر آمادہ ہو گئے تو صحرا کے اندر کوئی ایسی جگہ نہ ہو گی جس کی آڑ میں وہ مسلمانوں کی ترکتازی سے محفوظ رہ سکیں۔ لہذا انہوں نے اسلامی لشکر کو جانے دیا اور خود پیچھے ہٹ گئے۔

رومنوں کے پشت پر اچانک حملہ آور ہونے سے اسلامی لشکر کا ایک بڑا حصہ جنگ میں کام آ گیا تھا۔ حسان اور احمد اب اس حالت میں نہ رہے تھے کہ وہ اپنے لشکر کو از سر نو ترتیب دے کر موقع پر ہی ملکہ جرارہ اور رومنوں سے اپنی اس پسپائی کا انتقام لیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ملکہ جرارہ کے ساتھ اس قدر بربر ہیں کہ ان پر آسانی سے قابو نہیں پایا جا سکتا اور پھر ابھی تک صحرا کے اندر سے بربر جوق در جوق ملکہ کے لشکر میں شامل ہونے کو آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا برسوں بعد بارش ہوتی ہو اور حشرات الارض طوفانی صورت میں زمین سے نکل پڑے ہوں۔

بربر چونکہ جادوگر جرارہ کو ایک دیوی کی صورت میں پوجتے تھے لہذا اس کی خاطر لڑتے ہوئے وہ اپنی جان تک کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ مسلمان یقیناً بربروں کے طوفان اور ملکہ جرارہ کے سحر کو پاش پاش کر کے انہیں شکست دے چکے ہوتے بشرطیکہ رومن اور فرانسیسی، کریٹ اور اوڑس کے لشکروں کے ساتھ ان کی پشت پر چھپ کر حملہ آور نہ ہو جاتے۔

اپنے لشکر کے ساتھ مشرق کی طرف بڑھتے ہوئے حسان اور احمد جب قرطاجنہ شہر کی سیدھ میں تقریباً پچیس میل جنوب کی طرف سے گزر رہے تھے تو حسان نے سر اٹھا کر احمد کی طرف دیکھا وہ اپنے گھوڑے پر گھور اندھیرے سمندر کی طرح اداس بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا غبار اور چہرہ غم و اندوہ میں داغدار تھا۔

چند ثانیوں تک حسان بڑی شفقت، بڑے پیار سے احمد کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اضطراب انگیز لہجے میں اسے پکارتے ہوئے کہا "احمد! احمد! میرے ہمدم! میرے مونس! میرے دوست! میرے انیس!" احمد نے مڑ کر حسان کی طرف دیکھا زنگ آلود آئینے کی طرح اس وقت اس کا چہرہ دھندلا و اداس تھا۔

حسان نے پھر اپنی رقت آمیز آواز میں کہا۔ اداس نہ ہو میرے رفیق! میں جانتا ہوں ہماری پسپائی تمہیں شاق گزر رہی ہے لیکن یاد رکھو، نیند کے اندھیرے غاروں کی سی یہ گھڑیاں عارضی ثابت ہوں گی۔ ایک روز شب کی سی یہ تاریکی تمام ہو گی اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھٹ جائے گا۔

حسان چند ثانیوں تک رکا پھر جذبات میں ڈوبی آواز میں وہ کہہ رہا تھا۔ "احمد! احمد! جرارہ کی ہمارے خلاف یہ کامیابی سراب ریگ اور کچے رنگوں کے عارضی نقش و نگار ثابت ہوں گے۔ سنو میرے دوست! یہ ہار جیت اور تعمیر و تخریب ہی زندگی کی معراج نہیں جسے بنیاد بنا کر ہم اپنے اعمال و افعال کا محاسبہ کر سکیں۔ میرے محسن! میرے دوست! قسم مجھے خاکِ بطحا کی ایک روز ہم صحراؤں کی اس ساحرہ کے لیے دکھ کا قہری سورج اور مہیب عفریت بن کر اٹھیں گے اور اس کے شجرِ اقبال، اس کے

رحم مادر جیسے تاریک سحر، اس کی قدیم رسموں روایتوں اور اس کی کہنہ اساطیر اور بوسیدہ قوانین، قواعد اور عقائد کو کاٹ کر رکھ دیں گے۔ قسم مجھے اپنے رب ذوالجلال کی بربروں اور رومنوں کے اس اتحاد و فریب نے ان کے خلاف میری نفرت کو اور بڑھا دیا ہے۔ اب میں اپنے پورے وجد اور رقت کے ساتھ انہیں ان کی آخری ساعت کی طرف دھکیل دوں گا۔

احمد نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "واللہ! اس احسن کام میں اپنی پوری شدت اور اپنی پوری استطاعت لیے میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ جس صحرا نے آج ہماری ہار اور تخریب دیکھی ہے وہ کل ہماری تعمیر اور جیت بھی دیکھے گا۔"

حسان نے تھوڑی دیر تک کچھ سوچا دوبارہ اس نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "احمد! احمد! میں لشکر کو لے کر سیدھا برقہ شہر کی طرف جاؤں گا۔ ان صحراؤں میں وہی ہمارے لیے محفوظ ترین جگہ ہے۔ وہاں میں پڑاؤ کروں گا اور خلیفہ عبدالملک سے مزید کمک طلب کروں گا۔ ان لاکھوں بربروں اور لاکھوں فرانسیسیوں اور رومنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں اپنے لشکر کی تعداد بھی کچھ حد تک بڑھانا ہو گی۔ پچھلی جنگ جو ہم نے لڑی ہے وہ بھی ہمارے اور دشمن کے درمیان ایک اور چالیس کی جنگ تھی۔ برقہ شہر میں کمک کے انتظار میں دوبارہ جنگ کی تیاری میں کچھ وقت درکار ہو گا۔ تم یہیں مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ اور قرطاجنہ جا کر امین اور ارتمیس سے شادی کر لو۔ ان دونوں کو اپنے گھر پہنچانے کے بعد دوبارہ میرے پاس آؤ۔ میں برقہ شہر سے باہر بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔ اس طرح تمہیں کچھ آرام کرنے کا موقع بھی مل جائے گا اور تم ایک فرض سے بھی سبک دوش ہو جاؤ گے۔"

احمد نے حسان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ آپ کا حکم ہے؟"

حسان نے بڑے پیار اور نہایت شفقت میں کہا۔ "نہیں، یہ ایک بڑے بھائی کا مناسب اور بروقت مشورہ ہے۔"

احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پھر میں اس پر عمل کروں گا۔" احمد نے حسان سے مصافحہ کیا اور اپنے گھوڑے کو اس نے بائیں طرف موڑ لیا۔

حسان لشکر کے ساتھ مشرق کی طرف جا رہا تھا جب کہ احمد صحرا کے اندر شمال کی طرف اور قرطاجنہ شہر کی طرف اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا رہا تھا۔



شام سے کچھ دیر قبل ہی احمد اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا قرطاجنہ شہر میں داخل ہوا۔ جب وہ کوچوں اور گلیوں میں سے ہوتا ہوا امین کے گھر کے سامنے آیا تو دنگ اور پریشان رہ گیا۔ مکان کا دروازہ باہر سے بند تھا اور اس کی ہیئت سے ایسا لگتا تھا گویا ایک عرصہ سے وہاں کوئی نہ رہ رہا ہو۔

احمد اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے امین کے گھر کے سامنے گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ سامنے والے مکان سے ایک بوڑھا اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا نکلا اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "اے اجنبی! میں نہیں جانتا تمہارا نام کیا ہے لیکن میں تمہیں پہلے بھی دو ایک بار یہاں آتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ مکان کو تالا دیکھ کر تمہیں یقیناً مایوسی ہوئی ہو گی۔ یہ گھر اب اُجڑ چکا ہے۔ اور یہاں اب کوئی نہیں رہتا۔ مکان کو احتیاطاً تالا میں نے اس لیے لگا دیا ہے کہ اگر مالکوں کی طرف سے کوئی ان کا رشتہ دار آئے تو مکان اپنے سامان سمیت اس کے حوالے کر دیا جائے۔ باہر لگے تالے کی چابی میرے پاس ہے اگر تم چاہو تو لے لو۔"

احمد نے پریشانی میں کہا۔ "مکان کی چابی آپ اپنے پاس ہی رکھیں مجھے صرف یہ بتا دیں کہ اس گھر کے مکین کہاں چلے گئے ہیں؟"

اس بوڑھے نے اپنی گردن خم کرتے ہوئے کہا۔ "اس گھر کے مکین بچارے لُٹ گئے۔"

احمد نے زوال پذیر سی آواز میں پوچھا۔ "خدا کے لیے مجھے پہیلیوں میں نہ ڈالیے کھل کر کہیے کہ یہاں جو ماں بیٹی رہتی تھیں وہ کہاں چلی گئی ہیں۔"

اس بوڑھے نے دکھ سے کہا۔ "سنو اجنبی! قرطاجنہ کے سابقہ حکمرانوں کا ایک رشتہ دار تھا جس کا نام طبرق تھا۔ اس نے اس گھر کو لوٹ لیا۔ بوڑھی عزیان

کو اس نے قتل کر دیا اور امین کو اُٹھا کر وہ نہ جانے کہاں لے گیا ہے“۔

احمد نے دُکھتے لہجے میں پوچھا ”لیکن طبرق تو ایک جنگ میں مارا گیا تھا۔

بوڑھے نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”سُنا ایسا ہی گیا تھا لیکن یہ خبر غلط تھی۔ وہ امین کو پسند کرتا تھا۔ جب امین کو ایک بار اس نے اس گھر میں محصور کر دیا تھا تو کوئی آدمی طبرق کے پہریداروں کو قتل کر کے امین کو یہاں سے نکال کر لے گیا تھا۔ طبرق جنگ میں مارا نہ گیا تھا۔ یہ خبر غلط تھی بلکہ وہ جگہ جگہ امین کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ پھر ایک روز وہ اچانک قرطاجنہ میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ اس کے کئی مسلح ساتھی بھی تھے۔ پہلے اس نے امین کو شادی کی پیش کش کی جو امین نے حقارت سے ٹھکرا دی۔

اصل میں وہ احمد نام کے کسی مسلمان کو پسند کرتی تھی اور وہ خود بھی اسلام قبول کر چکی تھی۔ سنا ہے اس کی ماں نے اسے باقاعدہ طور پر اس مسلمان سے منسوب بھی کر دیا تھا۔ امین کے انکار پر طبرق نے امین کو اس گھر سے اُٹھا لے جانا چاہا۔ اس کی ماں نے بھرپور مزاحمت کی لیکن اس ظالم نے امین کی ماں کو قتل کر دیا اور امین کو اُٹھا کر لے گیا۔ سُنا ہے وہ امین کو جزیرہ کریٹ کی طرف لے گیا ہے۔ جہاں وہ اس سے شادی کرے گا۔ یہاں قرطاجنہ میں چونکہ کافی لوگ مسلمان ہو چکے ہیں اور پھر یہاں کا حکمران طبقہ بھی بدل چکا ہے۔ لہٰذا اسے خوف تھا کہ اگر قرطاجنہ کے مسلمانوں کو خبر ہو گئی کہ امین مُسلمان ہے۔ تو وہ اس کے خلاف حرکت میں آ جائیں گے۔

چند ثانیوں تک احمد انتہائی غم آلود نگاہوں سے اس بوڑھے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے کرب آمیز آواز میں کہا ”میرے محترم! جس احمد کا ذِکر آپ نے کیا ہے وہ مَیں ہی ہوں۔ جہاں اس قدر اطلاعات آپ نے دی ہیں کیا آپ یہ بتانے کی زحمت بھی کریں گے کہ وہ ابلیس نفس طبرق امین کو کریٹ کے کس شہر میں لے گیا ہے“۔

اس بوڑھے نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ مجھے خبر ہوتی کہ طبرق کریٹ میں کس جگہ گیا ہے تو مَیں تمہارے پوچھنے سے قبل ہی بتا چکا ہوتا۔ ہاں یہ اطلاعات تمہیں قدیما سے مِل سکتی ہیں شاید وہ جانتا ہو“۔

احمد نے بیتاب ہو کر پوچھا ”قدیما کون ہے؟“

اس بوڑھے نے زمین پر اپنی لاٹھی مارتے ہوئے کہا۔ میری طرح ایک بوڑھا آدمی ہے اور یہاں قرطاجنہ میں امین کے ماموں کی دکان سنبھالے ہوئے ہے۔ تم زرگروں کے بازار میں چلے جاؤ وہاں کسی سے بھی قدیما زرگر کا پوچھنا۔ لوگ تمہیں بتا دیں گے۔ وہ خود بھی پریشان ہے۔ کیونکہ وہ امین کا دُور کا رشتہ دار بھی ہے۔ وہ امین کے متعلق بہت کچھ جانتا ہو گا“۔

احمد نے اس بوڑھے کا شکریہ ادا کیا۔ ہاتھ آگے بڑھا کر اس نے اس سے مصافحہ کیا پھر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھ گیا تھا۔

زرگروں کے بازار میں لوگوں سے پوچھتا ہوا احمد ایک دکان کے سامنے رُک گیا۔ اندر ایک بوڑھا اور دو جوان کام میں مصروف تھے۔ احمد نے اس بوڑھے کو مخاطب کر کے کہا۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ کا نام قدیما ہے“۔

بوڑھے نے لاپرواہی سے کہا۔ ”ہاں اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں میرا ہی نام قدیما ہے“۔

احمد نے اپنے گھوڑے کی باگ اس کی گردن پر ڈال دی اور آگے بڑھ کر دکان کے لکڑی کے تختے پر بیٹھتے ہوئے کہا ”میرے بزرگ! مَیں اس شہر میں ایک اجنبی ہوں۔ اگر آپ کچھ وقت نِکال سکیں تو مَیں آپ سے علیحدگی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں“۔

قدیما نے اس بار غور سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اے اجنبی! تو کیسی گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ دکان میں کام کرنے والے یہ دونوں جوان میرے بیٹے ہیں۔ میرا کوئی عمل، کوئی فعل ان کے سامنے راز نہیں ہے۔ تم جو کہنا چاہتے بلا جھجک کہو“۔

احمد نے قدیما سے اور قریب کھِسکتے ہوئے کہا ”میرا نام احمد ہے۔ شاید امین کے حوالے سے آپ مجھے پہلے بھی جانتے ہوں کہ وہ میری منسوبہ ہے“۔

بوڑھا چونک اُٹھا کام کرنا اس نے بند کر دیا۔ اپنی جگہ سے وہ اُٹھا اور آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے احمد کو اس نے گلے لگاتے ہوئے کہا ”احمد! احمد! میرے

بیٹے! تم بہت دیر سے آئے ہو۔ کاش! تم اس وقت یہاں ہوتے جب اس مردود طر
امین کے گھر پہ شبخون مارا تھا۔ قدیما جب علیحدہ ہوا تو اس کے دونوں جوان بیٹے کام
کر آگے بڑھے اور دونوں باری باری احمد سے مصافحہ کر رہے تھے۔

احمد نے اس بار قدیما کی طرف دیکھتے ہوئے رازداری سے پوچھا "مجھے امین کے
ایک بوڑھے ہمسائے سے خبر ہوئی ہے کہ طبرق امین کو کریٹ لے گیا ہے کیا آپ کو
ہے کہ وہ امین کو کس شہر میں لے گیا ہے تاکہ مجھے اس کا تعاقب کرنے میں آسانی ہو"

قدیما نے بڑی حسرت سے کہا۔ "مجھے اگر یہ خبر ہوتی کہ قدیما کریٹ میں کس جگہ
تو اب تک میں امین کی رہائی کا کوئی نہ کوئی سامان ضرور کرتا تاہم طبرق کا ایک بھائی اس
شہر میں رہتا ہے۔ میں نے دو ایک بار اسے کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ بتلانے سے
گریز کرتا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ سب کچھ جانتا ہے۔ شاید اس پر سختی کی جائے تو وہ
ہمیں سب کچھ بتا دے"۔

احمد نے اپنی تلوار کے دستے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تو پھر اٹھیئے میرے ساتھ
چلیئے۔ میں دیکھتا ہوں وہ کیسے نہیں بتاتا

قدیما نے بڑی شفقت سے کہا۔ "احمد! احمد! اتنے جذباتی نہ بنو۔ طبرق کے
بھائی سے الجھنا اتنا آسان نہیں۔ وہ بلا کا ماہر تیغ زن اور طاقت ور انسان ہے۔ وہ
طبرق کا بڑا بھائی ہے"۔

احمد نے غصے میں اپنی تلوار کھینچتے ہوئے کہا۔ "میرے بزرگ! آپ مجھے الجھا رہے
ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے بہت سے جوان دیکھے جن کا خون میری تلوار چاٹ گئی۔ آپ
ابھی اٹھ کر میرے ساتھ طبرق کے بڑے بھائی کے پاس چلیئے۔ میں یقین دلاتا ہوں
آپ کو مایوس نہ کروں گا"۔

قدیما نے اس بار احمد کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "احمد! احمد! سنو
یہاں سے ہر سبت کے روز شام کے وقت ایک جہاز کریٹ کی طرف جاتا ہے۔ ابھی
سبت آنے میں پانچ یوم باقی ہیں۔ تم میرے ہاں آرام سے قیام کرو۔ اس دوران میں طبرق

کے بھائی سے ایک بار اور پوچھ لوں گا۔ اگر اس نے بتا دیا تو ٹھیک ورنہ اس پر سختی بھی کی
جا سکتی ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ کریٹ چلوں گا۔ اس لیے کہ میں طبرق اور اس کے
چند ساتھیوں کو پہچانتا ہوں اس طرح ان سے امین کو حاصل کرنے میں تمہیں آسانی رہے گی"۔

احمد نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یہاں قرطاجنہ شہر کے مضافات میں
میرے کچھ جاننے والے ہیں۔ میں یہ پانچ روز ان کے ہاں گزاروں گا۔ طبرق کے بھائی سے نمٹ
لینا بہت ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ بھی کہیں چلا جائے۔ اس سے معلومات حاصل کرنے
کے بعد میں اپنے ان عزیزوں کے ہاں چلا جاؤں گا۔ سبت کے روز میں یہاں آ جاؤں گا۔
اور ہم کریٹ کی طرف روانہ ہو جائیں گے"۔

قدیما مان گیا اور جوتے پہنتے ہوئے اس نے کہا۔ "تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو۔ آؤ چلیں
یہ فیصلہ بھی ہو جائے تو بہتر ہے"۔

احمد نے قدیما کو اپنے ساتھ گھوڑے پہ بٹھا لیا اور قدیما کے اشارے پر اس نے
اپنے گھوڑے کو شہر کے مشرقی حصے کی طرف دوڑا دیا تھا۔

قدیما کے کہنے پہ ایک حویلی کے سامنے احمد نے گھوڑے کو روک لیا اور مڑ کر
قدیما کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "کیا یہیں طبرق کا بھائی رہتا ہے"۔ قدیما
نے گھوڑے سے نیچے اترنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں! یہی اس کی حویلی ہے آؤ
نیچے اتر کر اس کی حویلی میں داخل ہوں"۔

احمد نے قدیما کو روکتے ہوئے کہا۔ "میرے بزرگ! نیچے مت اترو۔ حویلی کا
بیرونی دروازہ کھلا ہے ہم اس کے غلام تو نہیں کہ گھوڑے سے اتر کر احترام سے اندر
داخل ہوں"۔ احمد نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور حویلی میں داخل ہو گیا تھا۔

اتنے میں طبرق کے بھائی کا ایک خادم بھاگتا ہوا باہر آیا۔ وہ کچھ پوچھنا ہی
چاہتا تھا کہ قدیما نے اس سے کہا۔ "اپنے آقا سے کہو، قدیما کے ساتھ ایک اجنبی آیا
ہے وہ تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔ وہ خادم واپس مڑا اور بھاگتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔
احمد اور قدیما گھوڑے سے اتر کر کھڑے ہو گئے تھے۔

حویلی کے سکونتی حصّے کی طرف سے تھوڑی دیر بعد ایک خوب لمبے قد اور بھرے ہوئے جسم کا جوان نکلا ۔ وہ پوری طرح مسلح تھا شاید اس کے خادم نے اسے احمد اور قدیما کے تیوروں سے آگاہ کر دیا تھا ۔

احمد نے نہایت نرم لہجے میں گفتگو کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم ہی طبرق کے بھائی ہو ؟" اس نے بیزاری سے کہا۔ "طبرق کا بھائی ہونا کوئی گناہ نہیں ہے ۔ تم دونوں کس غرض سے حویلی میں داخل ہوئے ہو۔"

احمد نے پھر نرم آواز میں پوچھا۔ "ہمیں صرف یہ بتا دو طبرق کریٹ میں کس شہر گیا ہے اور کہاں اس کا قیام ہے ۔ ہم تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے اور واپس لوٹ جائیں گے۔" اس نے پھر بیزاری سے کہا۔ "تم اگر تعرض بھی کرو تو بھی میں نہ بتاؤں کہ طبرق کریٹ میں کس جگہ ہے ۔ اس سے قبل قدیما بھی کئی بار پوچھنے آ چکا ہے ۔ اسے بھی میں یہی جواب دے چکا ہوں پھر دوبارہ آنے کی کیا ضرورت ہے ۔ جاؤ چلے جاؤ میں نہیں بتاؤں گا کہ طبرق کہاں ہے ۔ مجھے اپنے بھائی کی زندگی عزیز ہے۔"

احمد نے اس بار اپنا لہجہ بدلتے ہوئے سختی سے کہا۔ "اپنی زندگی بھی تو عزیز رکھو کیا تم نہیں دیکھتے میں طبرق کے متعلق جاننے کا عزم کیے ہوئے ہوں ۔ اگر تم نے نرمی سے بتا دیا تو تمہارے حق میں بہتر ورنہ جان رکھو میری تلوار کی نوک ہر راز اگلوانا جانتی ہے۔"

طبرق کے بھائی نے اپنی تلوار سونت لی اور بھرپور نفرت میں اس نے کہا ۔
"یہاں سے فی الفور چلے جاؤ ورنہ میرے ہاتھوں نقصان اٹھاؤ گے" ۔

ایک سخت جھٹکے کے ساتھ احمد نے بھی اپنی تلوار کھینچ لی اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اپنی نرمی کو بھرپور نفرت میں بدلتے ہوئے ناآشنیدہ سی آواز میں کہا۔ "مجھے مجبور نہ کرو کہ تمہارے آبروسوز لہجے تمہاری حیوانی جبلتوں کے تقاضے اور طبرق کے ساتھ تمہارے رشتے کی زنجیروں کو کاٹ کر چلا جاؤں گا ۔ اب بھی وقت ہے طبرق کے متعلق مجھے صحیح صحیح بتا دو کہ وہ کہاں ہے ۔ اس وقت مجھے کیا حاصل جب میں تیرے دل کی زنبیل چیر پھاڑ دوں گا اور مجھے ایک بدتمیز انسان جان کر تجھے ادب و تہذیب سکھانے

کے بعد تیرے ناپاک جسم کو فنا کر دوں گا ۔ اے بدقسمت انسان قبل اس کے میں اپنا رنگ بدل لوں بتا طبرق کہاں ہے کہ وہ میرا مجرم ہے اور سخت ترین سزا کا مستحق ہے۔"

طبرق کے بھائی نے فوراً اپنی پشت سے ڈھال اتار کر سنبھال لی اور آگے بڑھ کر اس نے احمد پر حملہ کر دیا تھا ۔ احمد نے فوراً اس کا وار اپنی ڈھال پر لیا اور اس پر جوابی حملہ کر دیا تھا ۔ بالکل آندھیوں کے شور اور ہوا چاک جھپاکے کی طرح احمد اس پر حملہ آور ہوا اور برق رفتاری سے وار کرتا ہوا وہ اسے پیچھے کی طرف دھکیلتا ہوا دور تک لے گیا تھا ۔

طبرق کا بھائی چاہتا تھا کہ ایک جگہ جم کر مقابلے کا رخ بدلنے کی کوشش کرے لیکن اسے ناکامی ہوئی ۔ احمد کے تیز حملوں نے اس کے نفس کے زیر و بم کو تیز کر دیا تھا اور اسے اتنی مہلت ہی نہ دی تھی کہ وہ کہیں جم کر جوابی کارروائی کر سکے ۔

اپنے تیز حملوں کے دوران احمد نے دفعتاً اس کی دائیں ٹانگ پر اپنے پاؤں کی ایک سخت ٹھوکر ماری اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا ۔ احمد نے اس کے شانے پر تلوار کا ہلکا سا ایک زخم لگایا پھر اس کی گردن پر تلوار رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "بتاؤ طبرق کہاں ہے ؟"

زمین پر لیٹے ہی لیٹے وہ ہانپنے لگا تھا۔ منہ سے اس نے کچھ نہ کہا تھا ۔ احمد نے اس بار اس کے دوسرے شانے پر گہرا گھاؤ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں خاموشی سے مرنے نہ دوں گا ۔ تجھے ایسی اذیت سے ماروں گا کہ تو طبرق کے متعلق ہر راز کو اگلتا چلا جائے گا۔"

تکلیف کی شدت میں سسکتے اور کراہتے ہوئے طبرق کے بھائی نے کہا۔ "مجھے قتل نہ کرنا ۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا ۔ احمد نے غراتی آواز میں کہا۔ "سچ بتانا ۔ اگر تم نے جھوٹ کہا تو واپس آ کر میں تمہارے لیے اس سے کہیں زیادہ خطرناک اور مہلک ثابت ہوں گا۔"

طبرق کے بھائی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "جزیرہ کریٹ کے شمال مغربی حصّے

میں سمندر کے کنارے حلیم نام کا ایک ساحلی شہر ہے۔ اس شہر کے عین وسط میں ایک بہت بڑا چوک ہے۔ اس چوک کے ایک طرف کلیسا ہے اور دوسری طرف کمان گروں کا بازار ہے۔ اس بازار میں ایک کمان گر امینس نام کا یونانی ہوگا۔ طبرق اس کے پاس ٹھہرا ہوگا۔ اگر وہ کہیں اور چلا گیا ہوا تو بھی اس بوڑھے یونانی کو علم ہوگا کیونکہ وہاں چند اور شہروں میں بھی ہمارے جاننے والے ہیں لیکن اے اجنبی! وہ تم سے مات نہ کھائے گا کہ وہ خوب توانا اور طاقت ور ہے اور اس کے ساتھ اس کے چند جان نثار ساتھی بھی ہیں۔"

احمد نے اپنی تلوار نیام میں کرتے ہوئے کہا۔ "مطمئن رہو، میں تمہیں مایوس نہ کروں گا۔ عنقریب تم طبرق کے متعلق ایسی خبریں سنو گے جو تمہارے لیے دل فگار اور ناقابل یقین ہوں گی۔ یاد رکھو! میں عبد مشیت اور طبرق کا سایہ ہمزاد بن کر اس کا تعاقب کروں گا۔ اسے اس طرح گراؤں گا جیسے بوجھل و بلند اشجار بارش کے بعد تیز آندھی میں زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ اسے اس طرح ماروں گا جس طرح کوئی ماہر فن آہن گر اہرن پر رکھے سرخ لوہے پر شکل و شباہت بدل دینے والی زوردار اور طوفانی ضربیں لگاتا ہے۔

احمد نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ اب تو جا اور اپنے زخموں کا علاج کر۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی ایسی شرارت پھرائی جو میرے یا اس قدیما سے تعلق رکھنے والے کسی بھی فرد کے خلاف خطرناک ثابت ہوئی تو یاد رکھنا واپس آکر اس حویلی کے اندر میں آگ اور خون کا وہ کھیل کھیلوں گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے ہو۔"

طبرق کا بھائی اٹھ کھڑا ہوا اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے خوفزدہ سی آواز میں پوچھا۔ طبرق سے تمہاری کیسی دشمنی، کیسا عناد ہے اور کیوں تم اس کے تعاقب میں ہو؟

احمد نے کھولتے ہوئے لہجے میں کہا۔ کیا تمہیں علم نہیں اس نے ایک لڑکی کو زبردستی اٹھا لیا تھا۔ اس لڑکی کا نام ایمن ہے اور وہ میری منسوبہ ہے۔ قسم مجھے اپنے رب کے جلال کی طبرق اگر زمین کی پاتال میں چلا گیا ہے تو بھی میں اس کا تعاقب ضرور

کروں گا۔ وہ میرے عذاب، میرے انتقام سے بچ نہیں سکتا۔

احمد مڑ کر پیچھے ہٹنا ہی چاہتا تھا کہ حویلی کے سکونتی حصے سے ایک نوخیز لڑکی بھاگتی ہوئی نکلی اور احمد کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے خفگی میں پوچھا۔ "کون ہو تم اور کیوں تم نے میرے بھائی کو زخمی کیا ہے"۔

احمد نے سخت آواز میں کہا۔ "تمہارا بھائی طبرق میری منسوبہ کو یہاں سے اٹھا کر کریٹ کی طرف فرار ہو گیا ہے۔ میں اس کا پتہ پوچھنے آیا تھا۔ تمہارے اس بھائی نے انکار کر دیا لہٰذا میں نے اسے زخمی کر کے اپنا کام نکال لیا ہے۔"

لڑکی نے نفرت کے اظہار میں کہا۔ "تم کیسے جنگجو اور شجاع ہو جو میرے بھائی طبرق سے اپنی منسوبہ کی حفاظت نہ کر سکے۔ کیا فائدہ تمہاری شجاعت، کیا منفعت تمہاری تیغ آرائی میں۔"

احمد نے قہر آلود نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے اور طبرق سے تمہارا کیا رشتہ ہے"۔ لڑکی نے بڑی بے باکی و بے حجابی سے کہا "میرا نام ثما ہے اور میں طبرق کی چھوٹی بہن ہوں۔"

احمد نے اس لڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے طبرق کے بڑے بھائی سے کہا۔ "میں تمہاری بہن ثما کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ یہ میرے پاس یرغمال کے طور پر رہے گی۔ اگر ایمن مجھے مل گئی تو میں اسے لوٹا دوں گا اگر وہ مجھے نہ ملی تو مجھے اختیار ہوگا میں تمہاری اس بہن کا عقد جس سے چاہوں کرا دوں۔"

ثما نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "میرے بھائی کی موجودگی میں تم مجھے یہاں سے نہیں لے جا سکتے۔"

احمد نے اپنی تلوار پھر بے نیام کر لی اور سختی سے کہا۔ "تمہارے دونوں بھائی بے غیرت ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی تمہاری حفاظت نہیں کر سکتا"۔

ثما نے وہاں بھاگنا چاہا لیکن احمد نے اسے اٹھا کر اپنے گھوڑے پر ڈال دیا پھر اس نے طنزاً ثما سے کہا۔ "تم نے تو مجھے کہا تھا کہ تم کیسے جنگجو ہو جو اپنی

منسوبہ کی حفاظت نہ کر سکے لیکن یہ تو بتاؤ تمہارا بھائی تمہارے لیے کوئی مدافعت کیوں نہیں کر رہا۔ حالانکہ جب میری منسوبہ کو اُٹھایا گیا' مَیں اس کے پاس نہ تھا۔ قسم مجھے ربِ عظیم کی طبرق میری موجودگی میں اگر ایسا کرنے کی جسارت کرتا تو مَیں اس کے جسم کو لخت لخت کر کے سمندری موجوں کی نذر کر دیتا۔"

ثمانے احمد کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی مدد کے لیے شور کرنے لگی۔ احمد نے ایک زور دار ہاتھ ثما کے شانے پر دے مارا۔ ثما بے ہوش ہو گئی۔ احمد نے پیٹ کے بل اسے اپنے گھوڑے پر ڈال لیا۔ خود وہ گھوڑے پر سوار ہُوا' قدیما کو اپنے پیچھے بٹھایا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر وہ حویلی سے باہر نکل گیا تھا۔

قدیما کی دکان کے پاس آکر احمد نے قدیما کو نیچے اُتارتے ہوئے کہا۔ "قدیما قدیما! میرے محسن! مَیں اب جاتا ہوں۔ آنے والے سبت کے روز مَیں شام سے قبل ہی یہاں پہنچ جاؤں گا۔" قدیما کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ احمد اپنے گھوڑے کو موڑ کر اسے ایڑ لگانے کے بعد سرپٹ دوڑا چکا تھا۔





سورج کے سارے شیشے دھندلا لیے گئے تھے اور وہ اپنا بے کفن وجود گھسیٹتا ہوا مغرب کے بعد اور گھن کی طرح کھا جانے والی تاریکیوں میں اُترنے لگا تھا۔ سورج کی تجلّی اور حرارت جاتی رہی تھی اس لیے کہ موسم اپنی رتوں پر کروٹ بدل چکا تھا۔

اکتوبر کے آخری ایام تھے۔ گرما ختم ہو چکا تھا اور جاڑا اپنی چادر اور طیلسان دراز کرتا جا رہا تھا۔ فضائیں داغدار اور چاروں طرف گہرا غبار بکھرنے لگا تھا۔ نرسلوں کی ایک گھاٹی سے نکل کر ہرمس اپنے ریوڑ کو ہانکتا ہوا اپنی بستی کی طرف جا رہا تھا۔ جب وہ اپنے ریوڑ کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہُوا تو اندر سے حسین ارتمیس بھاگتی ہوئی نکلی اور فکر گیر آواز میں اس نے پوچھا۔ "ہرمس! ہرمس! تم نے کچھ سُنا۔"

ہرمس نے غمگین آواز میں کہا۔ "کچھ سُننے سے تمہارا مطلب اگر یہ ہے کہ

مسلمانوں کا لشکر صحراؤں کی ساحرہ ملکہ جرارہ سے مقابلہ کے بعد مشرق کی طرف پسپا ہو گیا ہے تو میں یہ دِل فگار خبر سُن چکا ہوں"۔ ارتمیس نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمارے لیے یہ انتہائی حوصلہ شکن خبر ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ ہماری بستی کے کچھ جوان اصل حالات جاننے کے لیے اسلامی لشکر کی طرف گئے ہوئے ہیں دیکھیں وہ کیا خبر لاتے ہیں۔"

ہرمس نے اُداس لہجے میں پوچھا۔ "بابا اب کیسے ہیں۔ کیا ان کا بُخار اُتر گیا ہے"۔ ارتمیس نے پھر غمزدہ آواز میں کہا۔ "طبیب آج دوبارہ آیا تھا۔ بابا کو دَوا دینے آیا تھا۔ اس وقت اُن کا بخار اُترا ہوا ہے اور وہ پہلے سے بہتر حالت میں ہیں۔"

دونوں بہن بھائی نے پہلے ریوڑ کو باڑے میں بند کیا پھر وہ اپنے گھر کے دائیں طرف، والے کمرے میں آئے۔ وہی کمرہ جس میں پہلے روز احمد داخل ہوا تھا۔ کمرے کی سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک چٹائی پر تین چادر توشک ڈال کر ایک صاف سُتھرا بستر لگایا گیا تھا جس پر بوڑھا زیوس لیٹا ہوا تھا۔

ہرمس نے قریب جا کر زیوس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا بازو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑی ارادتمندی سے پوچھا۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے بابا!" زیوس نے خوشدلی سے کہا۔ "میرا بخار اُتر چکا ہے بیٹے! اب مَیں ٹھیک ہوں۔ کچھ کمزوری ہے۔ یہ بھی دو ایک روز میں جاتی رہے گی۔"

حسین ارتمیس بھی زیوس کے پاس بیٹھ گئی۔ زیوس نے اس کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ارتمیس! ارتمیس! بستی کے جو جوان اسلامی لشکر کی طرف گئے تھے لوٹ آئے ہیں؟ اگر آ چکے ہیں تو کیا کہتے ہیں۔ مَیں احمد کے متعلق بہت فکر مند ہوں"۔

ارتمیس نے گردن جُھکاتے ہوئے زخمی سے لہجے میں کہا۔ "ابھی نہیں آئے بابا! بستی میں ہر کوئی اُنہیں کا انتظار کر رہا ہے"۔ زیوس نے گہری فکر اور اندیشوں

میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ "اگر اسلامی لشکر مشرق کی طرف پسپا ہو چکا ہے تو احمد کو ضرور ہمیں مِل کر جانا چاہیئے تھا۔ اللہ کرے وہ ٹھیک ہو اور خوش ہو۔ اب تو وہ اس گھر کا ایک فرد ہے اس کی تکلیف ——

زیوس کو رُک جانا پڑا تھا کیونکہ باہر گلی میں اسے لوگوں کا شور سنائی دیا تھا۔ جو لمحہ بہ لمحہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔ ارتمیس نے چونک کر کہا شاید بستی کے وہ جوان لوٹ آئے ہیں جو لشکر کی طرف گئے تھے۔ مَیں ابھی پتہ کرتی ہوں وہ کیا خبر لائے ہیں"۔ ارتمیس اُٹھی اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگی۔ ہرمس بھی اُٹھ کر اس کے ساتھ باہر بھاگ گیا تھا۔ زیوس بچارہ ان کے انتظار میں بڑی بے چینی سے دروازے کی طرف بھاگی۔ ہرمس بھی اُٹھ کر اس کے ساتھ باہر بھاگ گیا تھا۔ زیوس بچارہ ان کے انتظار میں بڑی بے چینی سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ارتمیس اور ہرمس جب لوٹ کر آئے زیوس نے بیتاب ہو پوچھا۔ "کیسا شور تھا بیٹی! ارتمیس نے پھر زیوس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بستی کے سوار لوٹ آئے ہیں بابا! وہ اسلامی لشکر سے ہو کر آئے ہیں بابا! لشکر واقعی مشرق کی طرف پسپا ہو رہا ہے۔ ان سواروں کا کہنا ہے۔ اسلامی لشکر نے شکست نہیں اُٹھائی بلکہ وہ ملکہ جرارہ کے سامنے سے جنگی حکمت عملی کے تحت پسپا ہوا ہے۔ لشکر برقہ شہر کی طرف گیا ہے۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کرے گا اور اپنی جنگی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد دوبارہ اِدھر کا رُخ کرے گا۔ آنے والے سوار بہت مطمئن ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے مُسلمان مجاہدین کے حوصلے بلند ہیں اور وہ دوبارہ ملکہ جرارہ کی طرف آنے کا عزم لے کر برقہ شہر کی طرف جا رہے ہیں"۔

زیوس نے بڑے پُر اُمید لہجے میں کہا۔ "کیا وہ احمد سے نہیں مِلے۔ جب مَیں نے اُن سے کہا تھا وہ احمد سے مِل کر آئیں اور اس کے متعلق تفصیل سے مجھے کہیں۔" ارتمیس نے اس بار خوشگوار اور چہکتی آواز میں کہا۔ "بستی کا ایک جوان لشکر کے سالار حسان بن نعمان سے مِلا تھا —— ہرمس نے درمیان میں بولتے

ہوئے کہا۔" یہ بات میں بتاتا ہوں بابا! ارتمیس آپ سے پوری بات نہ کہے گی بستی کا ایک جوان لشکر کے سالار حسان بن نعمان سے ملا تھا اور اس نے احمد سے متعلق پوچھا تھا۔ وہ جوان کہہ رہا تھا حسان بن نعمان نے احمد بھائی کو ارتمیس اور ایمن بہن سے شادی کر لینے کے لیے بھیج دیا ہے۔ وہ پہلے قرطاجنہ گئے ہیں۔ شاید ایمن کو لے کر وہ ادھر ہی کا رُخ کریں۔"

زیوس کے چہرے پر خوشی کی لہریں بکھر گئیں وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ارتمیس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔" ارتمیس! ارتمیس! احمد اور ایمن آنے والے ہوں گے۔ ان کے آنے سے پہلے پہلے کھانا تیار کر لو۔ اگر حسان بن نعمان نے اسے واقعی اس غرض کے ساتھ اپنے لشکر سے علیحدہ کیا ہے تو میں آج تمہیں اس سے بیاہ دوں گا۔"

ارتمیس کے چہرے پر احمد کے آنے کی اُمید میں خوشیوں کا جوالا مکھی پھٹ پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر لحظہ گہری ہوتی خوشیوں کی دُھند میں لعل و لولو و مرجان کی سی کشش تھی اور وہ خوشبو کے عروساں کی طرح خنداں و خوش دکھائی دینے لگی تھی زیوس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے خرما کے شجر جیسی اپنی شیریں اور شنیدہ و ناشنیدہ نغموں کے آہنگم جیسی دل آویز آواز میں پوچھا۔" آپ کیا کھائیں گے بابا!"

زیوس نے پیار سے کہا۔" میری خوشی کو بھول جاؤ بیٹی! احمد اور ایمن کے لیے اپنی پسند سے کچھ پکا ڈالو۔"

ارتمیس اُٹھنے ہی والی تھی کہ گھر کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی زیوس نے چونکتے ہوئے کہا۔" میرا دل کہتا ہے، احمد آگیا ہے۔ جاؤ بیٹی دروازہ کھولو جا کر۔ ہرمس کا سہارا لے کر میں بھی باہر آتا ہوں۔" ارتمیس اُٹھی اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ جب اس نے گھر کا بیرونی دروازہ کھولا تو اس نے دیکھا وہاں احمد اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے کھڑا تھا۔ احمد کو دیکھتے ہی ارتمیس کے جسم میں شبنم کی سی آسودگی، آنکھوں میں مرہم اور ہونٹوں پر تریاق جذبے بکھر گئے تھے۔

گردن جھکاتے ہوئے اس نے ضیار اور زمزمہ جیسی اپنی معجز نوا آواز میں پوچھا" آپ کیسے ہیں؟"

احمد چند لمحوں تک ارتمیس کو دیکھتا رہا جو سر جھکائے کھڑی تھی اور چاندنی رات میں اس کا حسین چہرہ آبِ شنگرف اور لعلِ بدخشاں کی طرح چمک رہا تھا۔ ارتمیس خود ہی حرکت میں آئی اور احمد کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے اس نے کہا۔" آپ باہر ہی کیوں کھڑے ہو گئے ہیں۔ اندر آجائیے نا۔ بابا بھی آرہے ہیں وہ کچھ بیمار رہے ہیں اور ہرمس کا سہارا لے کر باہر آرہے ہیں۔ میں آپ کا گھوڑا اصطبل میں باندھ آتی ہوں۔"

احمد اندر آیا۔ اتنی دیر تک زیوس اور ہرمس بھی باہر آگئے۔ دونوں نے آگے بڑھ کر احمد سے مصافحہ کیا۔ اچانک زیوس نے احمد کے گھوڑے پر بے ہوش پڑی ثما کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔" یہ لڑکی کون ہے؟ کیا یہ ہماری بیٹی ایمن ہے اور یہ اس طرح گھوڑے کی زین پر بے ہوش کیوں پڑی ہے؟"

احمد نے مغموم لہجے میں کہا۔" یہ ایمن نہیں ہے"۔ ارتمیس نے پریشانی سے پوچھا" پھر کون ہے اور یہ بے ہوش کیوں ہے"۔ احمد نے غور سے ارتمیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" یہ ایک لمبی داستان ہے آپ لوگ اندر چلیں میں آپ کو سناتا ہوں"۔ احمد نے بے ہوش ثما کو اُٹھا کر اپنے شانے پر رکھتے ہوئے ارتمیس سے کہا۔" ارتمیس! ارتمیس! میرے گھوڑے سے میرا بستر اور دونوں خرجینیں اُتار لو۔ ارتمیس نے فوراً بستر اور خرجینیں اُتار لیں۔ ہرمس آگے بڑھا اور گھوڑے کو وہ اصطبل کی طرف لے گیا تھا۔

احمد نے بستر اُٹھا لیا۔ ارتمیس نے دونوں خرجینیں پکڑ لیں اور دونوں زیوس کو سہارا دے کر وہ کمرے کی طرف لے جانے لگے تھے۔ سہارا دینے کی خاطر احمد نے اپنا بازو زیوس کی کمر میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔" آپ کب سے بیمار ہیں؟"

زیوس نے بڑی شفقت سے کہا۔" پچھلے کئی روز سے مجھے بخار ہو رہا ہے۔ میں تو اپنی زندگی سے ہی مایوس ہو گیا تھا۔ ارتمیس بچاری رات رات بھر تیمار داری کے

علاوہ میرے پاس بیٹھ کر روتی رہی ہے۔ بخار تو آج ٹوٹ گیا ہے۔ بس یہ کمزوری ہے۔“

ارتمیس نے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی خرجینیں اور احمد سے بستر لے کر ایک طرف رکھ دیئے۔ پھر اس نے بھاگ بھاگ کر کمرے میں چٹائیاں بچھا کر چار بستر اور لگا دیئے۔ احمد نے ان میں سے ایک بستر پر ثما کو لٹا دیا۔ اتنی دیر تک ہرمس بھی گھوڑے کو اصطبل میں باندھنے اور چارہ ڈالنے کے بعد آ گیا تھا پھر وہ تینوں بھی بستروں پر بیٹھ گئے اور ارتمیس کے کہنے پر احمد انہیں جنگ کے حالات سے لے کر امین کے اُٹھائے جانے، قدیا سے ملاقات، طرق کے بھائی سے جنگ اور ثما کو اپنے ساتھ لانے کے واقعات سُنا رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہُوا تو ارتمیس نے غمگین لہجے میں کہا۔ ”طرق نے امین کے ساتھ زیادتی کی ہے اسے اس کی سزا ضرور ملنی چاہیئے۔“

احمد نے غصّے میں کہا۔ ”اسی لیے تو میں کریٹ جانے کا عزم کر چکا ہوں۔ طرق خواہ کہیں بھی چلا جائے وہ میرے غضب سے نہ بچ سکے گا۔“

زیوس نے دُکھ سے کہا۔ ہماری بستی کے چند جوان اپنے لشکر میں گئے تھے وہاں وہ حسان بن نعمان سے ملے تھے۔ جس نے ان سے کہا تھا کہ احمد قرطاجنہ گیا ہے۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ تم امین سے شادی کر کے اسے اپنے ساتھ لاؤ گے اور یہاں ہم ایک خوشگوار ماحول میں ارتمیس کو بھی تم سے بیاہ دیں گے لیکن شاید قدرت کو یہ منظور نہیں۔ بیماری کے دنوں میں اکثر میں سوچا کرتا تھا۔ کاش میں ارتمیس کے فرض سے سبکدوش ہو گیا ہوتا۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں میری خوشیاں اور میرا سکون ابھی مجھ سے بہت دُور ہیں۔

احمد نے اُداس اور فکرمند زیوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پچھلی بار جب میں یہاں سے گیا تھا تو قرطاجنہ کی جنگ میں معمولی سے زخم آنے پر میں نے چند روز امین کے پاس گزارے تھے۔ میں نے اسے ارتمیس کے متعلق تفصیل سے بتا دیا تھا اور اس زندہ دل لڑکی نے اپنی خوشیوں اور مسکراہٹوں میں مجھے ارتمیس سے پہلے شادی کرنے

اجازت دے دی تھی۔“

زیوس نے چونک کر پوچھا ”تو کیا امین کی غیر موجودگی میں ہم یہ شادی کریں؟“ احمد نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ ”جیسے آپ کی خوشی ہو کریں میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔“ زیوس نے ہرمس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم بستی کے قاضی کو بلا کر لاؤ آج اور ابھی احمد اور ارتمیس کا نکاح ہو گا۔“

ہرمس اُٹھا اور بھاگتا ہُوا باہر نکل گیا۔ حسین ارتمیس جو ابھی تک گردن جھکائے یہ ساری گفتگو سن چکی تھی اپنی شادی کا سُن کر وہ اچانک اُٹھی اور جب وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل رہی تھی تو زیوس نے اسے پکارا۔ ”ارتمیس! ارتمیس! سنو! میری بات سنو!“

ارتمیس بھاگتی ہوئی رُک گئی اور مڑ کر وہ زیوس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ زیوس نے بڑے پیار سے کہا۔ ”میری بچی! ساتھ والے کمرے میں مسہریاں اور بستر لگا دو شادی کے بعد تم اور احمد اسی کمرے میں رہا کرو گے۔“

ریحان نفس ارتمیس شرم و حیا سے زمزمہ و موج کی طرح دہری ہو گئی اور نسیم کے کسی تیز جھونکے کی طرح وہ ساتھ والے کمرے میں چلی گئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہرمس اپنے بستی کے قاضی کو بُلا لایا اور اس نے احمد اور ارتمیس کا نکاح پڑھا دیا۔ قاضی وہی طبیب تھا جس نے بخار کی حالت میں خصیب کا علاج کیا تھا۔ نکاح کے بعد تھوڑی دیر احمد کے پاس بیٹھ کر وہ باتیں کرتا رہا پھر اُٹھ کر چلا گیا۔ ارتمیس اب احمد کے سامنے نہ آ رہی تھی اور دوسرے کمرے میں جا بیٹھی تھی۔

احمد نے زیوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ذرا ارتمیس کو تو بلایئے۔ اس لڑکی کو ذرا ہوش میں لائیں۔“

زیوس زور سے پکارنے لگا۔ ”ارتمیس! ارتمیس! اِدھر آؤ بیٹی!“ ارتمیس جھکتی جھکتی اور شرماتی شرماتی آئی اور دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔

اس بار احمد نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”شادی کے بعد تو رشتہ مضبوط ہوتا

ہے اور تم نے ہمارے پاس بیٹھنا ہی ترک کر دیا ہے ۔ یہ ثما ابھی تک بے ہوش پڑی ہے
اس کا بھی کچھ کرو ۔"

ارتمیس سنبھلی جلدی جلدی اس نے پانی کا ایک پیالہ بھرا اور اس سے وہ ثما کے منہ پر چھینٹے دینے لگی تھی ۔ تھوڑی دیر بعد ثما نے آنکھیں کھولیں اور ارتمیس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا ۔" تم کون ہو ؟ اور وہ وحشی کہاں ہے جو مجھے میرے بھائی کی موجودگی میں اٹھا لایا ہے ۔"

احمد نے ثما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔" اس کا نام ارتمیس ہے اور یہ میری بیوی ہے اور میں یہاں بیٹھا ہوں ۔ میرا نام احمد ہے ۔"

ثما نے اس بار نرمی سے پوچھا ۔" مجھے میرے گھر سے اٹھا کر تمہیں کیا ملا ۔"
احمد نے دکھ سے کہا ۔" تمہارے بھائی طبرق کو میری منسوبہ اٹھا کر کیا ملا ۔"

ثما خاموش رہی اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا ۔ احمد نے پھر کہا ۔" ثما ! ثما ! آگ جب اپنے گھر کو لگتی ہے تو ہی اس کی سفاکی اور ہولناکی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ تمہارے بھائی نے جب کسی اور کی بیٹی کو اٹھایا تو تم لوگوں کا کردار اور ضمیر نہ جاگا ۔ اب جب کہ وہی آگ تم لوگوں کے گھر میں لپٹیں مار رہی ہے تو تم اس کا شکوہ کرنے میں حق بجانب نہیں ہو ۔"

ثما نے بے بسی میں کہا ۔" مجھے سزا دینے سے کیا حاصل ؟ بد کرداری کا مظاہرہ میرے بھائی طبرق نے کیا ہے اس کی سزا اسے ہی ملنی چاہیے ۔ میرا اس سے کیا تعلق ؟"

تھوڑی دیر خاموش رہ کر ثما نے پھر پوچھا ۔" یہ کون سی جگہ ہے جہاں مجھے لایا گیا ہے ۔ تاکہ میں جان سکوں کہ میں اس وقت کہاں ہوں ۔"

احمد نے نرمی سے کہا ۔" ہم تمہیں یہ نہ بتائیں گے کہ تم اس وقت کہاں ہو نہ ہی تمہیں یہ جاننے کی ضرورت ہے ۔ ایک نظر بند کی حیثیت سے مقررہ وقت تک تمہیں یہاں رہنا ہوگا ۔ اس دوران تم نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو یاد رکھو !

تمہارا انجام تمہارے بھائی طبرق سے بھی زیادہ عبرت انگیز ہوگا ۔"

ثما نے رو دینے والی آواز میں کہا ۔" مجھے یہاں محبوس رکھنے میں تمہیں کیا حاصل ہوگا ۔" احمد نے بھی دکھ سے کہا ۔" میں چند روز تک طبرق کی تلاش میں جزیرہ ریٹ کی طرف نکلوں گا اگر وہ مجھے مل گیا اور میں امین کو واپس لانے میں کامیاب ہوگیا تو تمہیں میں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا اور اگر امین مجھے نہ ملی تو میں تمہیں اپنے چھوٹے بھائی سے بیاہ دوں گا جو اس وقت برقہ شہر میں ہے ۔ وہ تمہارے اعتماد کو بڑھائے گا ۔ اور تمہاری عزت افزائی کرے گا ۔"

ثما نے پھر بے بسی میں کہا ۔" میں یہاں رہنے کو تیار ہوں بشرطیکہ میری عزت اور میری جان یہاں محفوظ ہو ۔"

احمد اٹھا اور ثما کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا ۔" اس گھر میں تمہاری حیثیت ایک معزز و محترم مہمان کی سی ہوگی ۔ تمہاری عزت تمہاری جان یہاں محفوظ و مامون ہوگی ۔ اس کی میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں ۔"

ثما نے پرسکون لہجے میں کہا ۔" تو پھر میں یہاں گزارے ہوئے دنوں کو اپنی زندگی کا بدترین حصہ نہ سمجھوں گی ۔" احمد خاموش رہا ۔ ارتمیس بھی اٹھ کر باہر نکل گئی اور سب کے لیے وہ کھانا تیار کرنے لگی تھی ۔



احمد پانچ روز تک ارتمیس کے ساتھ رہا ۔ ایک بیوی کی حیثیت سے وہ احمد پر پھولوں کی پتیوں کی طرح نچھاور ہوتی رہی تھی ۔ سبت کے روز سہ پہر کے وقت جب قرطاجنہ کی طرف کوچ کرنے کے لیے احمد اپنے گھوڑے پر زین ڈال رہا تھا ۔ اتنے میں گھر کے اندر سے ارتمیس نکلی اس نے کچھ سامان اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا رکھا تھا ۔ وہ سیدھی اصطبل میں آئی اور سامان جو وہ اٹھائے ہوئے تھی احمد کے گھوڑے کی دونوں خرجینوں میں ڈال دیا تھا ۔ پھر وہ خاموشی سے کھڑی ہو کر احمد کو دیکھنے لگی تھی ۔ وہ ٹوٹ جانے والے ستارے کی طرح اداس تھی اور اس کے چہرے پر دکھ کے

گہرے اثرات تھے۔ گھوڑے کا تنگ کسنے کے بعد احمد جب سیدھا کھڑا ہوا تو ارتمیس نے کہا "میں بھی آپ کے ساتھ کریٹ چلوں گی۔ وہاں کافی تعداد میں یونانی بستے ہیں۔ میرے ساتھ ہونے سے کوئی آپ کو شک کی نگاہ سے نہ دیکھے گا"۔

احمد چند ثانیوں تک ارتمیس کو پیار سے دیکھتا رہا پھر حسین ارتمیس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے کہا "ارتمیس! ارتمیس! اگر میں کسی دشمن کی تلاش میں نہ جا رہا ہوتا تو بخدا میں تمہارے بغیر جانا بیکار تصوّر کرتا۔ لیکن ان حالات میں تمہیں میں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ اس طرح میرا کام دشوار ہو جائے گا اور امین کی تلاش کے ساتھ ساتھ مجھے تمہاری حفاظت پر بھی نظر رکھنا ہو گی۔ اس طرح میں کھل کر اپنا فرض ادا نہ کر سکوں گا۔ میں زیادہ دن نہیں لگاؤں گا۔ بہت جلد لوٹنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ تمہارے علاوہ برقہ شہر میں میرا آقا حسان بن نعمان بھی بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا ہو گا"۔

ارتمیس بے چاری نے سسکتی سی آواز میں کہا "میں وقت کے طوفانوں اور حالات کے مدوجزر کے سامنے تنہا کھڑی ہو کر بڑی بے چینی سے آپ کی واپسی کا انتظار کرتی رہوں گی۔ امین جب مل جائے تو اسے لے کر سیدھا اسی طرف آئیے ہمارے ساتھ رہ کر وہ ایک پُرسکون اور بے فکر زندگی کی ابتدا کر سکے گی۔

احمد نے ارتمیس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا "ارتمیس! ارتمیس! میرے بعد ثما پر نظر رکھنا وہ یہاں سے بھاگنے نہ پائے۔ قرطاجنہ تک ہرمس میرے ساتھ جا رہا ہے اور وہاں سے وہ میرا گھوڑا واپس لے آئے گا۔ تم فکر نہ کرنا۔ میں تمہیں طویل انتظار میں نہ ڈالوں گا۔ میں جہاں کہیں بھی جاؤں گا تمہاری یادیں قطب ستارے اور کہکشاں کی طرح میرے ساتھ رہیں گی۔ ارتمیس! ارتمیس! مجھے تم جیسی بیوی پر فخر ہے۔ کاش اس وقت امین بھی یہاں ہوتی تو میں اپنے آپ کو دُنیا کا ایک خوش قسمت انسان سمجھ رہا ہوتا ——

احمد کہتے کہتے رُک گیا۔ کیونکہ مکان کے اندر سے زیوس اور ہرمس نکلے

تھے۔ ہرمس نے احمد سے قریب آ کر پوچھا "ابھی چلیں"؟

احمد نے اپنے گھوڑے کی باگ تھامتے ہوئے کہا "ہاں چلو، میں تیار ہوں"

ایک میٹھی اور الوداعی نگاہ احمد نے اداس اور پریشان حال کھڑی ارتمیس پر ڈالی۔ زیوس سے اس نے مصافحہ کیا پھر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ ہرمس کو اس نے اپنے پیچھے بٹھا لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس نے ہانک دیا تھا۔ سیاہ گھوڑا دُم ہلاتا، کنوتیاں بدلتا اور نتھنے پھڑپھڑاتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

ارتمیس دروازے پر کھڑی ہو کر احمد کو دیکھتی رہی جب اس کا گھوڑا شمال کی طرف اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بھاگ کر واپس کمرے میں چلی گئی تھی۔

قرطاجنہ میں داخل ہونے کے بعد احمد نے اپنا گھوڑا قدیما کی دکان کے سامنے روکا۔ اندر قدیما دکان کے سامنے والے تختے پر بیٹھا تھا جب کہ اس کے بیٹے کام میں مصروف تھے۔

احمد کو دیکھتے ہی قدیما کھڑا ہو گیا۔ اتنی دیر تک احمد اور ہرمس گھوڑے سے اُتر چکے تھے۔ قدیما نے آگے بڑھ کر ان دونوں سے مصافحہ کیا اس کے بعد اس کے بیٹے احمد اور ہرمس کے ساتھ مصافحہ کر رہے تھے۔ احمد نے پہلے ہرمس کا ان سے تعارف کرایا۔ اس کے بعد قدیما کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا "کیا آپ کُوچ کا انتظام کر چکے ہیں"۔

قدیما نے خوش طبعی سے کہا "میں تو تمہارا ہی منتظر تھا۔ میں فکر مند تھا کہ آج اگر تم نہ آتے تو یہ کوچ اگلے سبت پر جا پڑے گا۔ میں سب انتظام مکمّل کر چکا ہوں۔ نقدی اور زادِ راہ ہر چیز دکان کے اندر موجود ہے۔ یہیں سے ہم کوچ کریں گے۔ کریٹ کی طرف جانے کے لیے میں اپنے گھر والوں سے مل چکا ہوں"۔

احمد نے ہرمس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہرمس! ہرمس! تم میرا گھوڑا لے کر واپس لوٹ جاؤ۔ ہاں اس کی خرجینوں سے سامان نکال کر مجھے دے دو" ہرمس

نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی روانگی تک یہیں رہوں گا۔ جب آپ کا جہاز کوچ کر جائے گا تو پھر میں لوٹوں گا تاکہ بابا اور ارتمیس بہن مجھ سے آپ کے متعلق پوچھیں گے تو میں انہیں تفصیل سے بتا سکوں گا۔" قدیما نے بھی حامی بھرتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں اسے رہنے دو۔ اسی گھوڑے پر ہم اپنا سامان لاد کر بندرگاہ چلے جائیں گے۔"

احمد نے بھی قدیما کی تجویز سے اتفاق کیا۔ قدیما کے اشارے پر اس کے بیٹوں نے اپنے باپ کا بستر گھوڑے کی زین سے باندھ دیا اور زادِ راہ کے علاوہ نقدی کی تھیلی گھوڑے کی خرجینوں میں ڈال دیں۔ ایک بار پھر سب نے آپس میں مصافحہ کیا اور احمد، قدیما اور ہرمس کے ساتھ بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ وہاں ان کو شام تک انتظار کرنا پڑا۔ جہاز پہلے سے کنارے پر کھڑا تھا اور انہوں نے اپنا سارا سامان اندر رکھ دیا تھا اور تینوں کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تھے۔

جب جہاز کے اندر روانگی کی ڈف بجی احمد اور قدیما ہرمس سے مصافحہ کر کے جہاز میں سوار ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد جہاز روانہ ہو گیا۔ ہرمس کنارے پر کھڑا ہو کر کھلے بادبانوں والے دیو پیکر جہاز کو دیکھتا رہا۔ جب وہ سمندر کے نیلے خلا میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ہرمس اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے ایڑ لگا دی۔ قرطاجنہ شہر سے باہر نکل کر وہ اپنے گھوڑے کو اپنی بستی کی طرف سرپٹ دوڑا رہا تھا۔



وہ بے چاند اور تاریک رات تھی۔ سمندر کے اندر پھیلی ہوئی تاریکی شعاعِ شمس، ضیائے نجوم اور نورِ قمر کو ترستی ہوئی بھیانک موجوں کے وحشی ظلم سے برسرِ پیکار تھی۔

احمد کا جہاز پُرشور سمندر میں پانی کے بلبلے اور ہوا کے بگولے کی طرح آگے بڑھتا رہا تھا۔ صدیوں کی منتظر موجیں ماند و بود کا کھیل کھیل رہی تھیں۔ ہاتھ ملتے سمندر میں کئی روز سفر کرنے کے بعد ایک روز وہ دیو پیکر سخت لکڑی کا جہاز

کریٹ کی مغربی بندرگاہ سنفاری جا پہنچا۔

جہاز سے نیچے اتر کر احمد اور قدیما نے حالات کا جائزہ لیا۔ سنفاری ایک چھوٹا سا مگر بارونق شہر تھا۔ بندرگاہ کے ساتھ ساتھ مسافر خانوں اور سرائوں کا سلسلہ شمالاً جنوباً دور تک چلا گیا تھا۔ وہ دونوں بھی اپنا سامان اٹھا کر ایک قریبی سرائے میں داخل ہوئے۔

اپنا سامان اٹھائے وہ سیدھے سرائے کے مالک کے پاس آئے جو ایک بوڑھا وینسی تھا۔ اپنا سامان فرش پر رکھتے ہوئے احمد نے اس وینسی سے کہا۔ "کیا ہمیں ایک رات قیام کے لیے کوئی علیحدہ کمرہ مل جائے گا۔ اس وینسی نے بڑی خوش طبعی سے کہا۔ کیوں نہیں ملے گا۔ یہ سمندری لہروں کی طرح آنے والے مسافر ہی تو ہماری روزی، ہمارے رزق کا سبب بنتے ہیں۔ میں ابھی آپ دونوں کے کمرے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

احمد نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے۔"

بوڑھے وینسی نے کہا۔ "میرا نام ہالپس ہے۔ یہ سرائے بہت پرانی ہے۔ اسے میرے دادا نے شروع کیا تھا۔ میرا باپ اور میں اس سرائے میں پیدا ہوئے۔ ٹھہرو میں اپنا ایک آدمی تمہارے ساتھ بھیجتا ہوں۔ وہ تمہیں تمہارے کمرے میں پہنچا آتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اونچی آواز میں اپنے کسی خادم کو پکارنے لگا تھا۔

احمد نے نقدی کی تھیلی نکالی اس میں سے چند سکے نکالے اور انہیں ہالپس کے سامنے رکھی لکڑی کی بھدی سی میز پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا دوں؟" ہالپس نے خود ہی دو سکے اٹھا لیے اور مسکرا کر کہا۔ "بس میرے لیے یہ کافی ہیں۔" اتنی دیر تک اس کا ایک خادم بھاگتا ہوا آ گیا۔ بوڑھے وینسی نے اس سے کہا۔ "انہیں نچلے حصے کے شرقی کمروں میں جو خالی ہیں ان میں سے کسی ایک میں پہنچا دو۔"

وہ خادم احمد اور قدیما کو لے کر چلا گیا۔ احمد اور قدیما نے اپنا سامان وہاں رکھا اور کمرے کو قفل لگانے کے بعد وہ پھر آئے۔ ہالپس اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ احمد قدیما کے ساتھ پھر اس کے پاس آیا اور استفساراً اس نے پوچھا۔ "اپنا سفر جاری رکھنے کے

لیے ہمیں گھوڑوں کی ضرورت ہے۔ کیا یہاں نزدیک کوئی ایسی جگہ ہے جہاں سے ہم گھوڑے خرید سکیں"۔

ہالپس نے سر ہلاتے ہوئے خوشامدی لہجے میں کہا "ضرور ہے۔ میری سرائے کی پشت پر ایک کھلا میدان ہے جہاں جانوروں کی منڈی لگتی ہے اور لوگ خرید و فروخت کرتے ہیں۔ تم دونوں وہاں جاؤ اور اپنی پسند کے گھوڑے خرید لو"۔

احمد نے پھر کریدنے کے انداز میں ہالپس سے پوچھا "اگر ہم نے کریٹ کے شمالی شہر حلیم کی طرف جانا ہو تو ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔"

اس بوڑھے دنیسی نے کہا "حلیم جانے کے دو ذرائع ہیں۔ اوّل یہاں سے جہاز میں بیٹھو وہ یہاں سے شمال کی طرف کیسٹیلی کی بندرگاہ سے ہوتا ہوا مشرق کی طرف مڑ کر تمہیں حلیم پہنچا دے گا"۔

احمد نے بیزاری سے کہا "ہم بحری سفر سے تنگ آ چکے ہیں۔ ہم خشکی کے راستے سفر کرنا چاہتے ہیں"۔

ہالپس نے پھر کہا "خشکی کے راستے یہاں سے مشرق کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ اس کے لیے تمہیں راستے تلاش کرنے کی کوئی تگ و دو نہ کرنی پڑے گی۔ سفناری شہر سے باہر ایک شاہراہ سیدھی مشرق کی طرف جاتی ہے بس اس پر ہو لو۔ لگ بھگ پچیس میل آگے جا کر راستے میں پڑنے والی چھوٹی چھوٹی بستیوں کی نسبت ایک بڑی بستی آئے گی۔ اس بستی سے باہر شمال کی طرف ایک چوراہا ہے۔ اس چوراہے سے ایک سڑک سیدھی جنوبی جانب بالخورہ کی بندرگاہ کی طرف چلی گئی ہے اور ایک سیدھی مشرق کی طرف جھیل لیو کا اور اس کے ساحلی شہروں کی طرف جاتی ہے۔ تمہیں شمال کی طرف سفر کرنا ہو گا لیکن یہاں تمہیں احتیاط برتنا ہو گی کیونکہ شمال کی طرف وہاں سے دو سڑکیں نکلتی ہیں۔ ایک سڑک جو بائیں طرف ہے وہ سیدھی حلیم شہر کی طرف جاتی ہے۔ دوسری سڑک ذرا مشرق کی طرف جھکتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور یہ کوہستان المیرس کے پہاڑی شہر کانیا کی طرف جاتی ہے۔

جو سڑک سیدھی شمال کی طرف جاتی ہے تم اس پر چڑھ جانا لیکن یہاں سے اپنی مکمل تیاری کر کے جانا اس لیے کہ حلیم شہر بھی کوہستان المیرس میں واقع ہے۔ وہاں سخت سردی پڑتی ہے۔ موسم سرما کا آغاز ہو چکا ہے اور اب وہاں برفانی موسم شروع ہو جائے گا"۔

ذرا رک کر بوڑھے ہالپس نے پوچھا "تم وہاں کیا کرنے جاؤ گے۔ تم مجھے چہرے سے ایک سپاہی لگتے ہو۔ تمہارا جلا ہوا چہرہ اس بات کا غماز ہے کہ تم یا تو کچھ عرصہ کے لیے غلام رہے ہو یا اپنے دشمنوں کی قید میں تھے۔ جنہوں نے تمہارا چہرہ داغ کر بھیانک بنا دیا ہے۔ ایسے ہی جلے ہوئے چہرے کا میں نے ایک بحری قزاق دیکھا تھا جس کا چہرہ دیکھ کر لوگ خوفزدہ ہو جایا کرتے تھے۔ اس وقت میں جوان تھا اور وہ سفناری کے بازار میں اکثر آیا کرتا تھا۔ اب خبر نہیں کہاں ہو گا کیا تمہارا اس سے کوئی تعلق تو نہیں"۔

احمد نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں"۔

ہالپس نے غور سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر تم برا نہ مانو تو کچھ اور پوچھوں"۔ احمد نے خوش طبعی میں کہا "بلا جھجک پوچھو، میں بحری قزاق نہیں ہوں"۔

ہالپس نے مدھم آواز میں کہا "تم کہاں سے آئے ہو اور کس غرض سے حلیم شہر جاؤ گے۔ سنو! حلیم ایک کوہستانی اور مہنگا شہر ہے وہاں تو اکثر متمول لوگ گھومنے کی غرض سے جاتے ہیں۔ یا زندہ دل امیرزادے وہاں اپنی شادیاں رچانے جاتے ہیں۔ تم وہاں کیا کرو گے"۔

احمد نے سنجیدگی سے کہا "میرا تعلق افریقہ سے ہے اور میں بربر ہوں۔ میں اپنے ایک دشمن کی تلاش میں حلیم جا رہا ہوں۔ کوہ المیرس کے اندر میں اس سے اپنا انتقام لوں گا"۔

ہالپس نے خوفزدہ لہجے میں کہا "مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا۔ تم جیسا خطرناک انسان کسی ایسی ہی مہم پر ہو گا۔ میں تمہاری کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔

اس بار قدیمانے ہالپس کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "چند ہفتے پہلے تمہاری سرائے

میں کسی ایسے شخص نے قیام تو نہیں کیا جس کا قد خوب نکلتا ہو۔ جسم کڑا اور سڈول۔ بائیں گال پر زخم کا ایک لکیر نما ترچھا نشان، کان ٹوٹے ہوئے ہوں۔ کسی بدتہذیب فوجی سوار کی طرح باتیں کرتا ہو اور اپنا نام طبرق بتاتا ہو۔"

وہ بوڑھا وینیسی چند ثانیوں تک گہری سوچوں میں کھویا رہا پھر اس نے مایوسی میں کہا۔ "مجھے افسوس ہے اس حلیے اور اس نام کے کسی شخص نے میری سرائے میں قیام نہیں کیا۔"

احمد اور قدیما وہاں سے ہٹ گئے پھر وہ گھوڑے خریدنے کے لیے اس میدان کی طرف جا رہے تھے جو ہالیس کی سرائے کے عقب میں تھا۔





ایک رات اس بوڑھے وینیسی کی سرائے میں بسر کرنے کے بعد احمد اور قدیما سفاری کی بندرگاہ سے روانہ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کی منزل اب کوہستان المیرس کے اندر حلیم شہر تھا۔ سفاری سے وہ ہالیس کے بتائے ہوئے راستے پر مشرق کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ لگاتار سفر کرتے ہوئے وہ اس چوراہے پر پہنچ گئے تھے جس کی نشاندہی انہیں ہالیس نے کی تھی۔

انہوں نے دیکھا چوراہے کے قریب ہی ایک بستی تھی اور وہاں سے سڑک سیدھی جنوب میں کریٹ کی جنوبی بندرگاہ بالخورہ کی طرف جا رہی تھی جب کہ ایک سڑک مشرق کی جانب جھیل لیو کا اور اس کے نواحی شہروں کی طرف چلی گئی تھی۔ شمال کی طرف جدھر انہیں سفر کرنا تھا دو سڑکیں جا رہی تھیں۔ ان میں ایک ذرا سا مشرق کی طرف رخ کرتی ہوئی کانیا کی طرف چلی گئی تھی۔ چوتھی شاہراہ جو سیدھی شمال میں حلیم شہر کی طرف جاتی تھی ان دونوں نے اپنے گھوڑوں کو اس شاہراہ پر چڑھایا اور مہمیز لگا کر انہیں سرپٹ دوڑا دیا تھا۔

ایک روز جب کہ رات پر زوال کا وقت تھا۔ کہکشاں اُجڑ گئی تھی اور ستارے راکھ ہوتے جا رہے تھے احمد اور قدیما علیم شہر سے دس میل دور اس دریا کے کنارے جا پہنچے تھے جو کوہستان المیرس سے نکل کر جنوب مشرق کی طرف بل کھاتا ہوا جھیل لیو کا میں جا گرتا تھا۔ دریا کے کنارے احمد نے اپنے گھوڑے کو روکتے ہوئے کہا "قدیما! قدیما! سورج طلوع ہونے والا ہے۔ میں فجر کی نماز ادا کر لوں۔ تم یہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر ستا لو۔" دونوں اپنے گھوڑوں سے اُتر گئے۔ احمد نے پہلے دونوں گھوڑوں کی اگلی ٹانگیں باندھیں اور ان کے دہانے اُتار کر انہیں چرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد احمد نے دریا کے کنارے بیٹھ کر وضو کیا اور پھر وہیں پتھریلی زمین پر قبلہ رو ہو کر وہ فجر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ قدیما دریا کے کنارے کنارے گھاس پھوس اور خشک لکڑیاں جمع کر کے ایک جگہ ڈھیر کرنے لگا تھا۔

نماز کے بعد احمد دعا مانگ کر جب فارغ ہوا تو اس نے دیکھا قدیما نے دریا کے کنارے پتھریلی زمین پر آگ کا چھوٹا سا ایک الاؤ روشن کر دیا تھا اور اپنے گھوڑے کی خرجین سے پنیر اور مکئی کی میٹھی روغنی روٹیاں نکال کر آگ کے قریب کپڑا بچھا کر اس پر رکھ دی تھیں۔

احمد جب قریب آیا تو قدیما نے کہا "احمد! احمد! آؤ بیٹھو! کھانا کھا لیں مجھے تو بھوک لگ گئی ہے۔ رات بھر سفر کرنے سے اور وہ بھی سخت سردی میں، سارا بدن چُور ہو گیا ہے۔" احمد بھی قدیما کے سامنے بیٹھ گیا۔ دونوں آگ کے سامنے اپنے آپ کو گرم کرنے کے علاوہ کھانا بھی کھانے لگے تھے۔

سورج اب مشرق سے طلوع ہو رہا تھا اور کوہستانوں کی چوٹیاں روشن ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ جاگ اٹھا تھا۔ دُور کہیں مرغوں کی اذانیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید دُور نزدیک کوئی بستی ہو۔

شمال میں کوہستان المیرس کی برف سے ڈھکی بلند چوٹیاں چمکنے لگی تھیں۔ ہوا کا رُخ چونکہ شمال سے جنوب کی طرف تھا اس لیے سردی میں خوب اضافہ ہو گیا تھا۔

کھانے کے بعد احمد اور قدیما آگ کے پاس بیٹھ کر ستاتے رہے۔ جب قدیما کی جمع کی ہوئی خشک گھاس اور لکڑیاں ختم ہو گئیں اور آگ بجھ گئی تو وہ دونوں کھڑے ہو گئے اور گھوڑوں کو دوبارہ دہانے چڑھا کر وہ سوار ہو گئے تھے۔ دریا کا چوبی پل عبور کرنے کے بعد انہوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر سرپٹ دوڑا دیا تھا۔ دھوپ اب چاروں طرف پھیل کر تیز ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ سردی کی شدت میں کمی ہونے لگی تھی۔

دوپہر سے تھوڑی دیر قبل احمد اور قدیما علیم شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ شہر قدرے کم بلند اور پستہ قد پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا جب کہ مغرب اور مشرق میں کوہستان المیرس کا بلند سلسلہ جو برف سے ڈھکا ہوا تھا دُور سمندر تک چلا گیا تھا۔ جنوب کی طرف سے وہ دونوں علیم شہر میں داخل ہوئے تھے اور اپنے گھوڑوں کو دُلکی چال چلاتے وہ آگے بڑھتے رہے۔ شہر کے وسط میں وہ ایک بڑے چوک کے پاس رُک گئے۔ یہ وہی چوک تھا جس کی نشان دہی طبرق کے بھائی نے کی تھی۔ اس کے ایک طرف کلیسا تھا جس کے بلند و بالا سنہری کلس بلندی اور دھوپ میں چمک رہے تھے اور دوسری طرف کمان گروں کا پُرانا اور قدیم بازار تھا۔

دونوں چوک کے دائیں طرف آئے اور لوگوں سے پوچھتے ہوئے وہ ایک دکان کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ اندر ایک بوڑھا دھونکنی سے آگ کی بھٹی کو ہوا دے کر لوہے کے ٹکڑے گرم کر رہا تھا جب کہ اس کے پیچھے چار کاریگر کمانیں اور تیر بنانے میں مصروف تھے۔

اپنے گھوڑوں سے اُتر کر احمد اور قدیما باہر کھڑے ہو کر تھوڑی دیر تک کام میں مصروف اس بوڑھے کو دیکھتے رہے۔ اچانک اس بوڑھے کی نظر اُن پر پڑی اور اس نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "باہر کیوں کھڑے ہو کوئی چیز چاہیے تو اندر آ کر دیکھ لو۔"

احمد چند قدم اور آگے بڑھا اور اس بوڑھے سے قریب ہوتے ہوئے اس

نے پوچھا "جس طرح مجھے بتایا گیا ہے۔ اس کے مطابق اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو تمہارا نام امیتس ہے اور تم یونانی ہو"۔

بوڑھے نے ہلکی سی مسکراہٹ میں کہا "میرا یونانی ہونا تو میرے نام سے ظاہر ہے لیکن تم یہاں اجنبی لگتے ہو۔ تم کہاں سے آئے ہو، کون سے نگر کو جاؤ گے اور کس نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے"۔

احمد نے اپنا چہرہ بوڑھے امیتس کے قریب لے جاتے ہوئے کہا "میرا تعلق افریقہ کے شہر قرطاجنہ سے ہے۔ میں طبرق سے ملنے آیا ہوں"۔

امیتس نے اُسے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم کس سلسلے میں اس سے ملنا چاہتے ہو"۔

احمد نے پھر سرگوشی میں کہا "میں اس کے لیے ایک بُری خبر لایا ہوں۔ اس کی غیر موجودگی میں ایک مسلمان نے کہ جس کا نام احمد ہے اس کی بہن کو اُٹھا لیا ہے۔ اور اس کے بڑے بھائی کو بُری طرح زخمی کر دیا ہے"۔

امیتس نے دُکھ سے کہا "اس مسلمان نے ایسا کیوں کیا ہے۔ جب کہ میں نے سُن رکھا ہے۔ مسلمان اخلاق و کردار کے بہت بلند اور عورتوں کا احترام کرتے ہیں"۔

احمد نے کہا "تم نے ٹھیک سُنا ہے۔ پر یہ بُری ابتداء طبرق کی طرف سے ہوئی ہے۔ طبرق اس مسلمان کی منسوبہ کو اُٹھا لایا تھا اس کا نام ایمن ہے لہذا وہ بھی حرکت میں آیا اور طبرق کے بڑے بھائی کو اس نے زخمی کر دیا اور اس کی بہن کو کہ جس کا نام ثما ہے اُٹھا کر لے گیا۔ اب طبرق کی بہن اس مسلمان کے پاس یرغمال ہے اور اس نے طبرق سے مطالبہ کیا ہے کہ اس کی منسوبہ دے جائے اور اپنی بہن لے جائے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے، ورنہ وہ بھی طبرق کی بہن کو اپنے چھوٹے بھائی سے بیاہ دے گا"۔

امیتس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا "اس مسلمان نے بہت بہتر اور احسن فیصلہ کیا ہے۔ یقیناً اس مسلمان کے پاس طبرق کی بہن ثما کی عزّت محفوظ ہو گی لیکن

اس احمد نام کے مسلمان کو اپنی منسوبہ حاصل کرنے سے کیا فائدہ وہ اس کے لیے بیکار ہو چکی ہے"۔

احمد نے چونک کر پوچھا "کیا طبرق اسے بے آبرو کر چکا ہے"۔ امیتس نے بڑے وثوق سے کہا "نہیں وہ بے آبرو نہیں ہوئی اگر کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرتا بھی تو وہ ایسی لڑکی تھی کہ یا تو وہ بے آبرو کرنے والے کو قتل کر دیتی یا اپنا کام تمام کر لیتی"۔

احمد نے چونک کر پوچھا پھر وہ کیسے بیکار ہو گئی"۔ امیتس نے دُکھ سے کہا "اسے اندھا کر دیا گیا ہے"۔

احمد نے اس بار بھرپور غصے میں پوچھا "کس نے اسے اندھا کر دیا ہے اور کس جرم میں ایسا کیا گیا ہے"۔

امیتس نے کہا "یہ ایک طویل کہانی ہے"۔

احمد کہہ رہا تھا "تم کہو تو میں سنوں گا"۔

امیتس نے اپنے قریب خالی نشست پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "بیٹھو میں تمہیں پوری داستان سناتا ہوں"۔

احمد اور قدیما دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ امیتس کے دھونکنی کے دستے سے ہاتھ ہٹا لیا پھر وہ احمد کی طرف دیکھتے ہوئے رازدارانہ آواز میں کہہ رہا تھا۔

"طبرق جب ایمن کو اُٹھا کر یہاں لایا تو اس کے ساتھ اس کے آٹھ محافظ قسم کے ساتھی بھی تھے۔ وہ اپنے ساتھ قرطاجنہ سے بے شمار مال و دولت اُٹھا لایا تھا۔ وہ ایمن سے شادی کر کے مستقلاً یہاں کریٹ میں آباد ہونا چاہتا تھا لیکن ایمن نے اس کے ساتھ شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

طبرق آہستہ آہستہ پیار اور ہمدردی سے ایمن کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی ہر خواہش اور ضرورت کا خیال رکھتا پھر ایمن ہی کے لیے جھیل لیو کا کے کنارے اس نے ایک پُرتکلف حویلی خرید لی اور ایمن کے ساتھ وہاں رہنے لگا۔

ایمن کی خدمت کے لیے اس نے ایک مقامی یہودی عورت کو کنیز رکھ لیا تھا۔ ساتھ ہی آہستہ آہستہ وہ ایمن کو شادی کرنے پر اُکساتا رہا۔ لیکن ایمن برابر انکار کرتی رہی۔ اس دوران طرق نے یہ شریفانہ ثبوت دیا کہ ایمن کو زبردستی بے آبرو نہ کیا۔

ساری آسائشیں اور راحتیں ہونے کے باوجود جب ایمن شادی سے انکار کرتی رہی تو طرق طیش میں آگیا اور اس نے دھمکی دی کہ اگر ایمن نے شادی نہ کی تو وہ اسے اندھا کر دے گا لیکن ایمن نے کوئی پرواہ نہ کی اور برابر انکار کرتی رہی۔ پھر ایک روز اس ظالم طرق نے اس معصوم بچی کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سرخ سلاخیں پھیر کر اسے اندھا کر دیا۔ اب وہ اندھی ایمن کو بھی معاف کرنے پر تیار نہ تھا اور اندھی حالت میں بھی زبردستی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا پر وہ یہودی عورت جسے طرق نے ایمن کے لیے کنیز رکھا تھا آڑے آئی۔ اس نے سارے حالات اپنے بوڑھے شوہر سے کہہ دیئے۔ ایمن بھی چونکہ کبھی یہودی تھی لہٰذا وہ اس کی مدد پر آمادہ ہو گئے۔

امیتس رُک کر احمد کی طرف دیکھنے لگا۔ احمد نے خفگی میں کہا "تم رُک کیوں گئے اپنی بات مکمل کرو۔"

امیتس نے پھر کہنا شروع کیا "وہ بوڑھا یہودی اور اس کی بیوی ایمن کو اپنے جوان بیٹے کی مدد سے طرق کی حویلی سے اُٹھا کر لے گئے اور بوڑھا یہودی جس کا نام لمحان ہے۔ ایمن کو لے کر نہ جانے کہاں چلا۔ طرق کو بھی اسی روز ایمن کے اٹھائے جانے کی خبر ہو گئی تھی کیونکہ وہ جھیل لیوکا کے کنارے شکار پر گیا ہوا تھا۔

اس نے بوڑھی یہودی کنیز سے ایمن کا پوچھا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ طرق نے اس بوڑھی یہودن کو بہت مارا پر وہ برابر لاعلمی کا اظہار کرتی رہی۔ غصے میں آکر طرق نے یہودن کے اس جوان بیٹے کو قتل کر دیا جس کی مدد سے اس نے ایمن کو طرق کی حویلی سے اُٹھایا تھا۔ اب وہ بوڑھی یہودن کسمپرسی کی حالت میں اپنے جھونپڑے میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ جب کہ بوڑھا یہودی لمحان ایمن کو لے کر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ طرق نے اپنے آدمی لمحان اور ایمن کی تلاش کے لیے مختلف شہروں

میں پھیلا رکھے ہیں لیکن ابھی تک اس کا کچھ نشان نہیں ملا۔"

احمد نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا "طرق کے آدمی کس کس شہر میں ہیں اور وہ خود کہاں ہے؟"

امیتس نے کہا "طرق کے دو آدمی تو اسی شہر میں ہیں۔ دو جنوبی بندرگاہ بانخورہ میں۔ دو مغربی بندرگاہ سفناری میں اور وہ خود اس کے پاس جھیل لیوکا کے کنارے کندناس شہر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایمن بہت خوب صورت اور اچھی بچی تھی چند روز جب طرق میرے ہاں ٹھہرا تو میں نے اسے دیکھا تھا وہ بہت اُداس اور کم آمیز تھی۔"

ایمن کے اندھا ہو جانے کا سُن کر احمد اپنے آپ میں نہ رہا تھا۔ غصے اور طرق کے خلاف نفرت میں اس کا چہرہ ایسا ہو گیا تھا جیسے صحرا کی چلچلاتی دھوپ میں کسی بستی کے در و بام جل اُٹھے ہوں۔ اس کی آنکھوں میں شعلے اور چہرے پر خون ریزی اتر آئی تھی۔ تاہم اس نے اپنے آپ کو بکھرنے سے بچاتے ہوئے پھر امیتس سے پوچھا۔ "تم طرق کو کیسے جانتے ہو؟"

امیتس نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا "کبھی میں بھی اپنی جوانی کے دور میں قرطاجنہ شہر کے مشرقی حصے میں رہا کرتا تھا۔ میں اور طرق کا باپ اشتراک سے تجارت کیا کرتے تھے پھر اس کا باپ مر گیا اور میں قرطاجنہ سے یہاں آکر کمان گری کا پیشہ کرنے لگا تب سے میرے ان کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔

طرق مجھے بے حد عزیز تھا لیکن جب سے وہ ایمن کو اُٹھا لایا ہے اور اسے اندھا کر دیا ہے مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ اس کے دو آدمی جو حلیم ہیں ایمن اور بوڑھے یہودی لمحان کی تلاش میں ہیں، میں نے انہیں اپنے ہاں جگہ نہیں دی۔ وہ شہر سے باہر جنوب کی طرف ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور شہر سے نکلنے والے راستوں کی نگہداشت کرتے ہیں تاکہ ایمن اور لمحان اگر یہاں ہوں تو بھاگ کر کہیں نہ جا سکیں۔ اس شہر کے شمال میں بلند و بالا برفانی پہاڑ اور ان سے آگے سمندر ہے۔

مشرق اور مغرب میں ناقابلِ عبور اور برف سے لدے کوہسار ہیں لہٰذا ان اطراف سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ اِسی لیے طبرق کے آدمی جنوب کی طرف نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔

امیتس چند ثانیوں تک خاموش رہا پھر اس نے دُکھ سے کہا۔ کبھی کبھی میرا دِل چاہتا ہے، کاش کوئی ایسا آدمی ہوتا جو ان ظالموں سے ایمن کی بے گناہی، معصومیت اور مظلومی کا انتقام لیتا۔ کاش مَیں جوان ہوتا تو ایمن کو اندھا ہونے سے بچاتا اور طبرق کو قتل کر دیتا۔

کچھ سوچتے ہوئے احمد نے پوچھا" طبرق کے ہاں کنیز کا کام کرنے والی یہودی عورت کہاں رہتی ہے جس نے ایمن کو بچایا تھا"؟

لمبا سانس لیتے ہوئے امیتس نے کہا" جھیل لیوکا کے کنارے جو کنداس شہر ہے اس کے مشرقی حصے میں جھیل کے عین کنارے یہودیوں کا ایک بہت بڑا معبد ہے۔ اس معبد کے دائیں جانب دو مکان چھوڑ کر تیسرا مکان لمحان یہودی کا ہے جس میں اس کی بیوی رہتی ہے۔ کوئی اسے اب کما کر کھلانے والا نہیں۔ سنا ہے اڑوس پڑوس کے یہودی اس کی مدد کر دیتے ہیں۔

مجھے یہ سارے واقعات طبرق کے ان دو ساتھیوں نے بتائے ہیں جو ان دونوں ایمن اور لمحان پر نگاہ رکھنے کے لیے حلیم کی ایک جنوبی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کاش کوئی ہوتا جو ان ظالموں سے ان کے ظلم کی خونریزی کا حساب طلب کرتا۔

احمد نے کچھ سوچا پھر اس نے غور سے امیتس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"امیتس! امیتس! کیا تم طبرق کے ان دو ساتھیوں کو جو اسی شہر کی جنوبی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں یہاں اپنی دکان میں بُلا سکو گے"؟

امیتس نے فراخدلی سے کہا" یقیناً بُلا سکتا ہوں۔ وہ میرے کہنے پر ضرور یہاں آجائیں گے لیکن تم انہیں کیا کہو گے"؟

احمد نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا" مَیں ان سے کیا کہوں گا یہ اُن کے آنے پر تم خود ہی جان جاؤ گے۔ بس تم مہربانی کر کے انہیں یہاں بُلا دو"۔

امیتس نے کمانیں بنانے میں مصروف ایک کاری گر کو اشارے سے اپنے پاس بُلایا اور اسے کہا" جاؤ شہر کی جنوبی سرائے میں چلے جاؤ وہاں طبرق کے جو دو ساتھی ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے کہو قرطاجنہ سے دو آدمی ان کے لیے کوئی پیغام لے کر آئے ہیں"۔

وہ کاری گر بھاگتا ہوا چلا گیا۔ امیتس نے احمد اور قدیما کو مخاطب کر کے کہا" تم دونوں دوکان کے اندر آکر آرام سے بیٹھو"۔ احمد اور قدیما دوکان کی ایک نشست پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ قدیما سخت پریشان اور فکرمند تھا۔ شاید ایمن کی داستان سنکر اس کی یہ حالت ہو گئی تھی۔

احمد اور قدیما دونوں دکان کے اندر بیٹھ کر امیتس سے باتیں کرتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ کاریگر لوٹ کر آگیا جو طبرق کے ساتھیوں کو بُلانے گیا تھا۔ اس کے ساتھ خوب تناور اور تنومند دو مسلح جوان بھی تھے۔ دوکان کے اندر آکر وہ دونوں جوان قدیما کو پہچان گئے اور ان میں سے ایک نے سختی سے پوچھا" تم یہاں کیا کرنے آئے ہو۔ اگر تمہارا مقصد ایمن کو تلاش کرنا ہے تو یہاں سے زندہ بچ کر نہ جاؤ گے"۔

احمد آندھی اور طوفان کی طرح اُٹھا اور دوکان کا بیرونی دروازہ اس نے اندر سے بند کرتے ہوئے اس نے اپنی کھولتی اور غراتی آواز میں کہا" اگر قدیما بچ کر نہ جا سکے گا تو تم بھی زندہ اس دوکان سے باہر نہ نکل سکو گے"۔

احمد نے فوراً اپنی تلوار کھینچی اور پشت پر لٹکتی ہوئی ڈھال بھی اس نے سنبھال لی تھی۔ ان دونوں نے بھی اپنی تلواریں سنبھال لی تھیں لیکن ان کے پاس ڈھالیں نہ تھیں وہی جوان جس نے قدیما کو دھمکی دی تھی اس بار احمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اگر تم نے یہ سوچ لیا کہ تم اس دکان کا دروازہ بند کر کے ہمیں زیر کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ ہم قدیما کے ساتھ تمہیں بھی اسی دکان میں دفن کر جائیں گے۔

احمد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا" تم بکتے ہو۔ مَیں ایسی باتیں سُننے کا عادی نہیں ہوں۔ میری تلوار جب تم دونوں پر برسے گی تو تم اپنی ساری نفس پروری اور بدظرفی بھول

جاؤ گے۔ سُن رکھو مَیں تمہارے خون سے اس دوکان کو رنگین کر کے جھیل لیوکا کی طرف راز
ہو جاؤں گا۔ تمہاری ساری بدبختی، تمہاری ساری ہمت و عزیمت چند لمحوں کے اندر
مَیں زائل کر دوں گا۔ آگے بڑھ کر مجھ پر حملہ کرو کہ مَیں تم دونوں کو ایک ساتھ مقابلے
کی دعوت دیتا ہوں۔"

ایک بار ان دونوں نے گہری اور ذو معنی نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف
دیکھا پھر انہوں نے کوئی فیصلہ کرنے کے بعد اپنی تلواریں لہرائیں اور احمد پر حملہ آور ہونے
کے لیے آگے بڑھے۔ قدیما، امیتس اور اس کے کاریگر پریشان حالت میں ایک طرف
ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

ان دونوں نے آگے بڑھ کر احمد پر حملہ کر دیا۔ بڑی آسانی کے ساتھ احمد نے
ایک کا وار اپنی ڈھال پر اور دوسرے کی تلوار کو اپنی تلوار پر روک دیا تھا۔ پھر احمد شعلے
کی سی بے تابی سے حملہ آور ہوا تھا۔ اس کی تلوار باری باری ان دونوں پر ایسی تیزی اور
مہارت سے برسنے لگی تھی گویا انجمنِ کُن فیکون میں سیفِ لا الٰہ ابھر ڈوب گئی ہو۔
دونوں کو دھکیلتا ہوا احمد دُور تک لے گیا تھا۔

احمد ایسی تسلیم رضا اور ایسی عیسلے نفسی سے جھپٹ رہا تھا کہ وہ ہوا کے
جھونکے کی طرح ان پر حاوی ہو گیا تھا۔ ان دونوں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے کہ ایک
بار جم کر جنگ کا توازن اپنے حق میں کرنے کی کوشش کریں لیکن انہیں کوئی کامیابی نہ ہوئی
تھی۔ احمد پہلے اپنی ڈھال پر ان کے وار روکتا رہا اور تلوار سے ان پر جوابی حملے کرتا رہا لیکن
اب اس نے اپنے حملوں میں اس قدر تیزی پیدا کر لی تھی کہ وہ دونوں حملہ کرنے کے قابل
ہی نہ رہے تھے اور اپنے آپ کو صرف اپنے دفاع تک محدود رکھ کر وہ احمد کے آگے
آگے الٹے پاؤں بھاگنے لگے تھے۔

احمد کے حملوں کے سامنے وہ اپنے آپ کو اپنی زندگی کے بدترین حلقۂ گرداب
اور دل کے ذلیل ترین فریب اور طالع بد کا سامنا کر رہے تھے۔ احمد کے حملوں کا
سدباب اب ان کی پہنچ سے باہر تھا اور وہ اپنی مرضی سے انہیں اپنے سامنے جس طرح

چاہتا بھگائے جا رہا تھا۔

اچانک احمد کی تلوار ان میں سے ایک کی پسلیوں پر گری اور ران تک اسے
چیرتی چلی گئی تھی۔ امیتس کی بند دوکان کے اندر ایک المناک چیخ بلند ہو کر ڈوب
گئی تھی۔ اپنے ساتھی کے زخمی ہو کر گرنے اور پھر دم توڑ جانے کے بعد دوسرے کی
حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج۔

وہ سوچ رہا تھا ایسے خطرناک اور زہریلے دشمن کا مقابلہ کرنے کے بجائے
کاش یہ زمین پھٹ گئی ہوتی اور مَیں اس میں سما جاتا۔ یا صور ہی پھونک دیا گیا ہوتا کہ
حشر ہی برپا ہو جاتا لیکن کچھ بھی نہ ہوا اور چند ثانیوں کے خطرناک حملوں کے بعد احمد
نے عجیب سے رعد سے مشابہ اور نعرہ کناں ہونے کے انداز میں چلا کر کہا۔ "جہالت کے
پُتلے سنبھلو تمہارے زوال کا وقت آ گیا ہے اور مَیں تمہیں کاٹنے لگا ہوں۔" اس
کے ساتھ ہی احمد کی تلوار اس کے شانے پر گری اور پسلیوں کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔
کمرے میں ایک بار پھر وحشت خیز چیخ بلند ہوئی تھی اور پھر کاٹ کھانے والی
خاموشی طاری ہو گئی۔

مرنے والے کے کپڑوں سے اپنی تلوار اچھی طرح صاف کرنے کے بعد احمد
نے میان میں ڈال لی تھی۔ قدیما، امیتس اور کمان گر جوان سب حیرت و استعجاب
سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

امیتس نے پریشان سی آواز میں پوچھا۔ "تم کون ہو اور ان دونوں کو قتل
کرنے سے تمہارا کیا مقصد حل ہو گا۔"

احمد نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "مَیں تمہاری دعاؤں کا ثمر اور تمہاری خواہش
کا انجام ہوں۔" امیتس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مَیں کچھ نہیں سمجھا کھُل کر کہو۔"

احمد نے امیتس سے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا تھوڑی دیر قبل میرے
سامنے تم نے یہ دعا نہ مانگی تھی کہ کاش! کوئی ایسا ہوتا جو ان ظالموں سے امین کی بے
گناہی، معصومیت اور مظلومی کا انتقام لیتا اور پھر تم نے اس خواہش کا بھی اظہار

کیا تھا کہ کاش میں جوان ہوتا تو امین کو اندھا ہونے سے بچاتا اور طبرق کو قتل کر دیتا۔ میں نے طبرق کے دو ساتھیوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اس کے بعد اس کی اپنی اور اس کے دیگر ساتھیوں کی باری ہے۔ کیا اس طرح میں آپ کی دعاؤں کو باثر اور آپ کی خواہشات کی تکمیل نہیں کر رہا۔"

امیتس نے خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم طبرق اور اس کے ساتھیوں سے امین کی مظلومیت کا انتقام لے لو تو یہ اُن کے لیے بہترین حساب اور عمدہ احتساب ہوگا۔ اور اس نیک کام کا تمہیں اجر ضرور ملے گا۔"

احمد نے پھر امیتس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر میں اپنے ساتھی کے ساتھ ابھی اور اسی وقت یہاں سے روانہ ہونا چاہوں تو کیا تم ان دونوں لاشوں کو ٹھکانے لگا دو گے۔"

امیتس نے بڑی فراخدلی سے کہا۔ "تم کوئی اندیشہ نہ کرو، اطمینان سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ میں ان دونوں کی لاشیں دبا دوں گا۔"

احمد دوکان کا دروازہ کھول کر قدیما کے ساتھ باہر آ گیا۔ دونوں اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور حلیم شہر سے نکل کر جنوب مشرق کے رُخ پر وہ اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑانے لگے تھے۔ ان کی منزل جھیل لیوکا کے کنارے کندناس شہر تھا جہاں طبرق اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔

آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ گھُل کر نیچے جھکتے جا رہے تھے۔ فضاؤں میں تاریکی پھیلنے لگی تھی اور برف باری کا بھی امکان تھا۔ اس کے باوجود احمد قدیما کے ساتھ طوفانی انداز میں لیوکا کی طرف روانہ ہو گیا۔

اسی رات تیز اور طوفانی برف باری شروع ہو گئی تھی۔ راستے میں کسی سرائے میں ٹھہر کر قیام کرنے کے بجائے وہ دو ایک بار رُک کر سستا لیے اور دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

دوسرے روز شام سے تھوڑی دیر پہلے وہ جھیل لیوکا کے کنارے کندناس شہر

میں داخل ہوئے۔ برف باری اس وقت بھی جاری تھی۔ جھیل کے کنارے احمد یہودیوں کے معبد کے پاس آ کر رُک گیا۔ پھر دائیں ہاتھ دو مکان چھوڑ کر اس نے تیسرے مکان پر دستک دی تھی۔ قدیما اس سے قریب ہی دونوں گھوڑوں کی باگیں پکڑے کھڑا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ احمد نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ "اگر میں غلطی پر نہیں تو کیا آپ لمحان کی بیوی ہیں۔" اس عورت نے دُکھ سے کہا۔ "تم نے سچ کہا۔ میں ہی لمحان کی بیوی ہوں۔ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیا تم لمحان کے پاس سے آئے ہو یا تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے۔"

احمد نے کہا۔ "میں افریقہ کے شہر قرطاجنہ سے آیا ہوں۔ میں امین کے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہوں وہ اس وقت کہاں ہے۔ میں اس کے متعلق سخت فکر مند ہوں۔" اس بڑھیا کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور غور سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "تم کون ہو، امین سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔"

گھٹی گھٹی سی آواز میں احمد نے کہا۔ "میرا نام احمد ہے اور امین میری منسوبہ ہے۔" بڑھیا نے ایک لمبا سانس لیا۔ "آہ! وہ بدقسمت لڑکی تمہیں بہت یاد کرتی تھی۔ جب وہ طبرق کے پاس مقید تھی تو وہ اپنی دعاؤں میں ہر روز رو رو کر اور گڑگڑا کر کہتی تھی یا اللہ میرے احمد کو میری مدد کے لیے بھیج۔" ہم لوگوں نے اس نظریے کے تحت اس کی مدد کی تھی کہ وہ کبھی یہودی تھی۔ تاہم مجھے یہ علم تھا کہ اب وہ مسلمان ہو چکی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ اندھی کر دی گئی ہے اور کیا تم اب بھی اس سے محبت کرو گے جب کہ وہ اندھی ہے اور دوسروں کے لیے ایک بوجھ ہے۔"

احمد نے زخمی سی آواز میں کہا۔ "میں پہلے کی نسبت زیادہ اس سے محبت کروں گا۔ وہ قابلِ ستائش ہے کہ پُر آسائش زندگی میں بھی اس نے میرے ساتھ اپنی محبت کا ناطہ نہ توڑا۔ مجھے حلیم شہر میں طبرق کے ایک جاننے والے سے سب حالات کا علم ہو چکا ہے۔ وہاں میں طبرق کے دو ساتھیوں کو بھی قتل کر آیا ہوں۔ مجھے اب صرف یہ خبر ہو کہ امین کہاں ہے۔ تاکہ میں اسے اپنے ساتھ لے جا سکوں۔ کیا آپ بتا

سکیں گی وہ اس وقت کہاں ہے ۔ میں برف باری اور طوفان کی پرواہ کیے بغیر ابھی اس کی تلاش میں نکل جاؤں گا ۔"

اس بڑھیا نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا ۔" آؤ ، اندر آ کر بیٹھو ۔ تمہارے آنے سے مجھے خوشی ہوئی ہے ۔ کاش تم پہلے آتے تو امین کی آنکھیں بچائی جا سکتی تھیں ہم نے تو خلوصِ دل سے امین کی مدد کی تھی ۔ اسی کشمکش میں میرا جوان بیٹا بھی طبرق کے آدمیوں نے قتل کر ڈالا ۔ میرا شوہر امین کو کسی محفوظ مقام پر لے جانا چاہتا تھا جہاں وہ طبرق کی دسترس سے محفوظ رہے ۔ میں خود اپنے شوہر کے متعلق فکر مند ہوں ۔ نہ جانے وہ کہاں چلا گیا ہے ۔ مجھے یہ بھی ڈر ہے ان دونوں کو کسی نے کہیں ویرانوں میں مار ہی نہ ڈالا ہو ۔ تم اندر آ کر بیٹھو ۔ یہ پیچھے گھوڑوں کی باگیں پکڑے کھڑا اگر تمہارا ساتھی ہے تو اسے بھی اندر بلا لو ۔ باہر برف باری ہو رہی ہے اور سردی کا زور بڑھ گیا ہے ۔"

احمد نے کہا ۔" میں بیٹھوں گا نہیں اگر آپ کو علم نہیں کہ امین کہاں ہے ۔ تو پھر مجھے طبرق کا پتہ بتا دیں کہ وہ کہاں رہتا ہے تاکہ میں اس سے نمٹ سکوں ۔"

بڑھیا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔" ہاں ! میں تمہیں اس کا پتہ ضرور بتاؤں گی ۔ یہاں سے سیدھے دائیں ہاتھ کی طرف جائیں تو ایک چوک آتا ہے ۔ اس چوک پر جو راستہ بائیں طرف جھیل کے کنارے کی طرف جاتا ہے ۔ اس راستے پر دائیں جانب پہلی حویلی طبرق کی ہی ہے ۔ لیکن تم بیٹھو تو تم بھوکے ہو گے میں تمہارے لیے کھانا تیار کرتی ہوں ۔"

احمد نے کہا ۔" نہیں میں طبرق سے نمٹ کر پھر تمہارے پاس آؤں گا ۔"

بڑھیا پیچھے ہٹتی ہوئی بولی " ٹھہرو ! ذرا رک جاؤ ۔"

بڑھیا اندر چلی گئی ۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں لوہے کی دو لمبی اور موٹی سلاخیں تھیں ۔ بڑھیا نے وہ آہنی سلاخیں احمد کو دکھاتے ہوئے کہا ۔" لوہے کی یہ سلاخیں گرم سُرخ کر کے طبرق نے امین کی آنکھوں میں پھیر کر اسے اندھا کر دیا تھا ۔ چوری چھپے یہ سلاخیں میں طبرق کے ہاں سے اُٹھا لائی تھی ۔

احمد نے وہ سلاخیں لے کر اُلٹ پلٹ کر غور سے دیکھیں پھر بڑھیا کو واپس لوٹاتے ہوئے اس نے کہا ۔" خاتون اپنے گھر میں آگ روشن کرو اور لوہے کی ان سلاخوں کو خوب گرم سُرخ کرو میں تمہاری موجودگی میں ہی امین کا قصاص لوں گا ۔ میں اب طبرق کی طرف جاتا ہوں اور بہت جلد لوٹ کر تمہارے پاس آؤں گا ۔"

احمد پیچھے ہٹ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور قدیما کے ساتھ چلا گیا ۔ بڑھیا نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا ۔ برف باری جاری تھی ۔ سورج غروب ہو گیا تھا اور فضاؤں میں اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا ۔

ایک حویلی کے سامنے احمد نے اپنے گھوڑے کو روکا اور قدیما کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا ۔" تم باہر ہی رُکے رہنا ، میں اکیلا اندر جا کر طبرق سے بات کروں گا ۔"

قدیما نے اپنا گھوڑا نزدیک لاتے ہوئے کہا ۔ لیکن تم نے تو اسے دیکھا ہوا ہی نہیں ۔ تم اسے پہچانو گے کیسے ؟"

احمد نے سوچتے ہوئے کہا ۔" ہو سکتا ہے اندر زیادہ آدمی ہوں اور طبرق کو لے کر مجھے یہاں سے فرار ہونا پڑے ، ایسی حالت میں تمہارا اندر جانا خطرناک ہو گا ۔ اگر تم باہر ہی اپنے گھوڑے پر سوار رہے تو ہمارے لیے بہتر ہو گا ۔ تم فکر مند نہ ہو ، میں کوئی ایسا پکا ہوا پھل نہیں ہوں جسے طبرق منہ میں ڈال لے گا ۔ تم ایک بار مجھے طبرق کا حلیہ پھر کہو اور باہر ہی کھڑے رہو اور دیکھو میں ان کے لیے کیسی داستان کی ابتدا کرتا ہوں ۔"

قدیما نے احمد کی بات مانتے ہوئے کہا ۔" میں ایسے ہی کروں گا جیسے تم کہو گے ۔ سنو ! طبرق جسم کا خوب کڑا اور سڈول ہے ، قد بھی لمبا ہے ۔ بائیں گال پر زخم کا ایک لمبی لکیر جیسا نشان ہے ۔ دونوں کان ٹوٹے ہوئے ہیں اور بد تہذیب جنگلیوں کی طرح اُجڈ اور کھردرے لہجے میں گفتگو کرتا ہے ۔"

احمد گھوڑے سے اُتر گیا اور آگے بڑھ کر اس نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا ۔" تم ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ ۔"

قدیما نے فوراً اپنے گھوڑے کو ہانکا اور دروازے کے سامنے سے ہٹ کر

وہ دیوار کے سائے کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد حویلی کا دروازہ کھلا اور ایک جوان جس نے دروازہ کھولا تھا دروازے کے ایک پٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا "تم کون ہو اور کس غرض سے تم نے اس حویلی کے دروازے پر دستک دی ہے"۔

احمد نے اندھیرے میں اس جوان کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "میں قرطاجنہ سے آیا ہوں۔ مجھے فی الفور طبرق سے ملنا ہے۔ میں بڑی دشواری سے تلاش کرتے کرتے یہاں تک پہنچا ہوں۔ سنو! مجھے طبرق کے بڑے بھائی نے بھیجا ہے اور میں اس کے لیے ایک بُری خبر لے کر آیا ہوں"۔

اس جوان نے چونک کر پوچھا "کیسی بُری خبر تم لائے ہو"؟

احمد نے کہا "وہ خبر طبرق کی بہن ثما کے اغوا سے متعلق ہے۔ ایمن نام کی وہ لڑکی جسے طبرق قرطاجنہ سے یہاں لے آیا تھا اس کے منسوب نے طبرق کی بہن ثما کو اُٹھا لیا ہے۔ کیا تم مجھے طبرق کے پاس لے کر نہ چلو گے کہ میں اسے اس کے بھائی کا پیغام دوں اور کھل کر اس سے بات کروں"۔

اس جوان نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "اندر آجاؤ، گو تم ہمارے لیے ایک بُری اور نہایت کریہہ خبر لائے ہو پھر بھی تم قابلِ احترام ہو"۔

احمد اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے اندر داخل ہو گیا۔ برف باری ابھی تک جاری تھی اور رات کے تاریک سرد سناٹے میں زمین پر پڑی برف دُور دُور تک چمک رہی تھی۔

اس جوان نے پہلے احمد سے اس کا گھوڑا لے کر اصطبل میں باندھا پھر اس سے نزدیک آکر اس نے کہا "میرے ساتھ آؤ"۔

احمد نے سر پر رکھے آہنی خود کو درست کیا۔ کندھے پر لٹکتی کمان اور پشت پر لٹکتی ڈھال کا جائزہ لیتا ہوا وہ اس جوان کے پیچھے ہو لیا تھا۔

دونوں آگے پیچھے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ اندر دو جوان بیٹھے میخوری

کے علاوہ باتوں میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک جوان کے بائیں گال پہ لکیر نما زخم کا نشان تھا اور اس کے کان ٹوٹے ہوئے تھے۔

احمد نے اسے مخاطب کر کے کہا "اگر میں غلطی پہ نہیں تو تم ہی طبرق ہو۔ سنو! میں تمہارے لیے ایک بُری اور منحوس خبر لے کر آیا ہوں۔ ایمن کے منسوب نے جس کا نام احمد ہے اور جو مسلمان ہے۔ تمہاری بہن کو تمہارے گھر سے اٹھا لیا ہے۔ وہ طوفان کی طرح تمہارے گھر میں آیا۔ تمہارے بڑے بھائی کو بُری طرح اس نے زخمی کر دیا اور تمہاری عزیز بہن ثما کو اُٹھا کر وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ جاتے ہوئے وہ تمہارے بھائی سے کہہ گیا تھا کہ جب ایمن لوٹاؤ گے ثما کو لے جانا"۔

طبرق غیض و غضب کی حالت میں کھڑا ہو گیا اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے غضب ناک حالت میں کہا "کیا بکتے ہو، وہ اتنی بڑی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر اس نے ایسا کر ہی لیا ہے تو میں اسے اس کی کڑی اور بھیانک سزا دوں گا"۔

احمد نے پھر کہا "جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں پہلے وہ سن لو۔ یہ سلسلہ یہیں تک ختم نہیں ہوا۔ مجھے چونکہ خبر نہ تھی کہ تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو لہٰذا مجھے تمہارے بھائی نے کہا تھا کہ طبرق کے متعلق حلیم شہر کے یونانی کمان گر امیتس سے پوچھ لینا۔ یہاں آکر امیتس نے مجھے اس سے بھی ایک بُری خبر سنا دی ہے"۔

طبرق نے پریشان حالت میں پوچھا۔ امیتس نے تم سے کیا کہا ہے"؟

احمد نے طبرق سے نزدیک ہوتے ہوئے کہا "وہ کہہ رہا تھا کہ وہ مسلمان جو ایمن کا منسوب ہے قرطاجنہ شہر کے ایک زرگر قدیا کو ساتھ لے کر کریٹ پہنچ چکا ہے۔ تمہارے وہ دو ساتھی جو حلیم شہر میں ایمن اور لمحان یہودی پر نگاہ رکھنے کے لیے شہر کی جنوبی سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے، ان دونوں کو اس نے قتل کر دیا ہے اور آج ہی اس نے حلیم شہر سے یہاں پہنچ کر اس بوڑھی یہودن کے ہاں قیام کرنا تھا جس کا شوہر ایمن کو لے کر روپوش ہو گیا ہے۔

امیتس سے اسے ایمن کے اندھا ہونے اور روپوش ہو جانے کے سارے واقعات

کی خبر ہو گئی ہے۔ اب وہ یہاں کندناس شہر میں تم سے انتقام لے گا۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ قبل اس کے وہ ہمیں نقصان پہنچائے ہم پہلے ہی اس کے خلاف حرکت میں آ کر اس کا کام تمام کر دیں۔ ہم ابھی اور اسی وقت اس بوڑھی یہودن کے گھر پر دھاوا بول دیں اور وہیں اسے ختم کر کے اس کے ٹکڑے جھیل لیوکا میں پھینک دیں۔"

غصے اور انتقام کے جذبے میں طبرق کا رنگ تانبا ہو گیا تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی تلوار کے دستے کو اس نے مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔ "اگر ایمن کا منسوب یہاں پہنچ گیا ہے تو بچ کر نہ جا سکے گا۔ ایمن کا غصہ میں اُسی پر اتاروں گا۔ اس کے علاوہ ایمن کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ ایک بار جب میں نے قرطاجنہ شہر کے اندر ایمن کو اس کے گھر میں محصور کر کے اس پر اپنے چار ساتھیوں کا پہرہ لگا دیا تھا۔ یہی احمد نام کا مُسلمان میرے چاروں ساتھیوں کو قتل کر کے ایمن کو قرطاجنہ سے اس کی ماں سمیت لے بھاگا تھا۔ آج اس سے میں اپنے مرنے والے اُن ساتھیوں کا انتقام بھی لوں گا۔"

احمد نے پھر طبرق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اے جوان! جوش سے زیادہ ہوش میں رہو۔ احمد نام کا وہ مُسلمان جس سے تم انتقام لینے کی ٹھان چکے ہو، طوفانی انداز میں جنگ کرنے کا عادی ہے۔ پہلے تم مجھے یہ بتاؤ اس حویلی میں تمہارے پاس کتنے آدمی ہیں جنہیں ہم احمد سے نمٹنے کے لیے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ یاد رکھو! یہ مہم بڑی ترکیب اور ترتیب سے طے ہو گی۔"

طبرق نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "حویلی میں میرے ساتھ یہی دونوں ہیں اور ان پر میں ہر طرح سے بھروسہ بھی کر سکتا ہوں کیونکہ یہ دونوں میرے ذاتی محافظ بھی ہیں۔"

احمد آنکھ کے جھپکنے کی طرح حرکت میں آیا اپنی تلوار اس نے کھینچی اور بائیں طرف ہٹ کر اس نے طبرق کے دونوں ساتھیوں پر حملہ کر کے ان دونوں کی گردنیں کاٹ دی تھیں۔

طبرق نے غصے کی حالت میں احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے کیا کر دیا۔ قتل ہونے والے میرے دونوں عزیز ترین ساتھی تھے۔ تم جو کچھ بھی ہو، میں تمہاری حیثیت بھول جاؤں گا اور تم سے بھیانک انتقام لوں گا۔"

احمد چند قدم آگے بڑھا اور اپنی خون آلود تلوار اس نے ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ "ذلیل کتے! اپنے آپ میں رہ کر گفتگو کر۔ میری طرف دیکھ اور مجھے پہچان کہ میں ہی ایمن کا منسوب احمد بن حشم ہوں۔ دیکھ میں کیسے تیری موت بن کر کریٹ میں داخل ہو چکا ہوں۔"

طبرق نے فوراً ہی اپنی تلوار سونت کر احمد پر حملہ کر دیا۔ احمد نے اس کا وار اپنی ڈھال پر روکا اور جارحیت پر اُترتے ہوئے اس نے طبرق پر طوفانی حملے شروع کر دیئے تھے۔

احمد کے حملوں میں ایک سحر آفریں قوت اور ماورائے ادراک کا جذبہ تھا۔ طبرق جو اپنے آپ کو بے بدل تیغ زن اور لاثانی شجاع سمجھتا تھا احمد کے حملوں کی تیزی اور درشتگی کے سامنے اپنی رُوح کو مضمحل، اپنے جذبوں کو پگھلتے اور اپنے اعضا و جوارح کو ٹوٹتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

کمرے کے اندر جہاں طبرق کے ساتھیوں کی لاشیں پڑی تھیں فرش کو سُرخ کر رہی تھیں وہاں اب طبرق احمد کے مہلک اور جان لیوا حملوں کے سامنے اُلٹے پاؤں بھاگ رہا تھا۔ طبرق چاہتا تھا کہ کسی جگہ وہ پاؤں جما کر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے اور دفاع سے نکل کر جارحیت میں داخل ہو لیکن مغلوب الغضب احمد کے سامنے وہ اپنے آپ کو خام و بے عمل محسوس کر رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ ایسے طوفانی حریف و مقابل کے روبرو ذرا سی غفلت بھی اس کے لیے انتہائی مہلک اور جان لیوا ثابت ہو گی لہٰذا وہ اُلٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور تھا۔

اچانک جیسے کسی سامری نے کسی فسوں خیز عمل کے لیے اپنا طلسماتی ہاتھ فضا میں بلند کر دیا ہو، ایسے ہی احمد طبرق کو دھکیلتا ہوا کمرے کے ایک کونے میں لے گیا اور

وہاں اس نے تلوار کا ایک خطرناک وار کرنے کے بعد طبرق کے شانے پر پوری قوت سے اپنی ڈھال دے ماری۔

تکلیف کی شدّت کے باعث طبرق کراہ اُٹھا اور اپنا شانہ سہلانے کی خاطر وہ دیوار سے ٹیک لگا کر ذرا سا جھک گیا۔ احمد نے فوراً ڈھال پھینک دی اور ایک ہاتھ سے طبرق کی گردن کو گرفت میں لے کر اس نے طبرق کی تلوار چھین لی اور اس کے مرنے والے دونوں ساتھیوں کی طرف پھینکتے ہوئے اس نے غراتے ہوئے کہا۔ "تو تم طبرق ہو"۔

طبرق نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ خوفزدہ نگاہوں سے احمد کو دیکھے جا رہا تھا جس کے ہاتھ میں خون آلود تلوار تھی اور آنکھوں میں قہر آلود جھکڑ چل رہے تھے۔

احمد طبرق کی حالت دیکھ کر ذرا سا مسکرایا اور پھر وہ اپنی تلوار نیام میں ڈالتے ہوئے کچھ کہنے والا تھا کہ طبرق نے اس پر چھلانگ لگا دی اور پھر لگاتار ایک دو تین مکّے اس نے احمد کے پیٹ، چھاتی اور پسلیوں پر دے مارے تھے۔ احمد ذرا سا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

طبرق دوبارہ آگے بڑھ کر جب احمد پر مکّے برسانے لگا تو احمد سنبھلا اور فوراً جھک کر نیچے ہو گیا۔ طبرق کا وہ ہاتھ جو اس نے مکّہ مارنے کو آگے بڑھایا تھا احمد نے پکڑ لیا پھر وہ سیدھا ہوا اور طوفانی انداز میں ایسے ہی تین مکّے طبرق کے دے مارے جیسے طبرق نے اسے مارے تھے۔

درد اور تکلیف کی شدّت سے کراہتا ہوا طبرق گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنے پیٹ کو پکڑ لیا تھا۔ احمد نے ایک اور آہنی مکّہ طبرق کے دائیں کندھے پر مارا اور طبرق فرش پر اوندھے منہ گر گیا۔

احمد نے جلدی جلدی بستر کی چادر سے طبرق کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیئے پھر اس نے اپنی ڈھال اُٹھا کر پشت پر باندھ لی اور کمرے کے دروازے پر آ کر اس نے زور سے پکارتے ہوئے کہا۔ "قدیما! قدیما! اندر آ جاؤ"۔

قدیما اپنے گھوڑے کو اندر لایا۔ گھوڑے کو اس نے چھت دار راہداری میں کھڑا کر دیا اور تقریباً بھاگتا ہوا وہ احمد کے پاس آیا اور ہانپتے ہوئے پوچھا کیا طبرق یہاں نہیں ہے؟ احمد نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "تم میرے ساتھ تو آؤ"۔

قدیما کو احمد اپنے ساتھ کمرے میں لایا اور فرش پر بیٹھتے ہوئے طبرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا "کیا یہی طبرق ہے"۔

قدیما نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "قسم یعقوبؑ و موسیٰؑ کی یہی طبرق ہے لیکن یہ تو اپنے آپ کو جنگلی سانڈ کی طرح سرکش اور کسی قلعے کی طرح ناقابلِ تسخیر جانتا تھا اب یہ کیسی یتیمانہ اور بے بسی کی حالت میں فرش پر پڑا ہے اور یہ دونوں مرنے والے بھی اس کے ساتھی ہیں میں ان کو بھی جانتا ہوں"۔

طبرق نے ایک بار گردن اُٹھا کر قدیما کی طرف دیکھا اور پھر شرمساری میں اس نے اپنی گردن دوبارہ جھکا لی تھی۔

احمد آگے بڑھا اور طبرق کی ران پر اپنے دائیں پاؤں کی ایک سخت ٹھوکر مارتے ہوئے اس نے کہا۔ "اٹھو چلیں"۔

طبرق کھڑا ہو گیا اور خوفزدہ انداز میں احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا "تم مجھے کہاں لے جاؤ گے"۔

احمد نے غضب ناک لہجے میں پوچھا "جب امین کو تم نے قرطاجنہ سے یہاں لانے کے لیے اٹھایا تھا تو اس نے بھی تم سے پوچھا ہو گا کہ تم مجھے کہاں لے جاؤ گے۔ پھر تم نے اسے کیا جواب دیا تھا"۔

طبرق نے اپنی گردن جھکائے ہوئے کہا "میں نے اسے کہا تھا۔ میں تمہیں کریٹ لے جا کر تم سے شادی کروں گا لیکن اس نے انکار کر دیا اور میں نے غصّے کی حالت میں اسے آنکھوں سے محروم کر دیا۔ حقیقتاً میں ایسا نہ چاہتا تھا۔ بعد میں مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں اسے پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ کاش وہ مان گئی ہوتی۔ اس نے انکار نہ کیا ہوتا تو وہ اندھی نہ ہوتی اور میں تمہارے سامنے یوں بے بس و مجبور نہ کھڑا ہوتا"۔

احمد نے بے پناہ غصّے میں کہا۔"تم بھی فکرمند نہ ہو۔ میں تمہیں لمحان کی بیوی کے پاس لے جاؤں گا اور وہاں تجھے میں تیرے تاریک گناہوں کی سزا دوں گا۔" احمد نے پھر طبرق کو پاؤں کی ٹھوکر ماری۔"چلو میرے ساتھ" طبرق چُپ چاپ احمد کے آگے آگے چل دیا۔

احمد کے کہنے پر قدیما اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ طبرق کو لے کر احمد اصطبل میں آیا۔ پہلے طبرق کو اپنے گھوڑے پر بٹھایا پھر وہ خود بھی اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور قدیما کے ساتھ وہ رات کی تاریکی اور برف باری میں اس حویلی سے باہر نکل گیا تھا۔

تیز برف باری میں احمد نے اپنا گھوڑا لمحان کے مکان سے باہر روکا۔ اپنے گھوڑے سے وہ اُترا۔ طبرق کو بھی اس نے نیچے اتار لیا پھر آگے بڑھ کر اس نے دروازے پر دستک دی تھی۔ اتنی دیر تک قدیما بھی اپنے گھوڑے سے اُتر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ چند ہی ثانیوں بعد اس بوڑھی خاتون نے دروازہ کھولا جس کا نام رَملہ تھا اور جو لمحان کی بیوی تھی۔

احمد کو دیکھتے ہی اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔"تم آ گئے بیٹے! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ میں نے تمہارے اور تمہارے ساتھی کے لیے کھانا بھی تیار کر رکھا ہے۔" تم اندر آؤ نا باہر کیوں کھڑے ہو۔ ایمن بہت اچھی بچّی تھی اس کی نسبت سے تم بھی اب ہمارے لیے عزیز ہو۔ اندر آ جاؤ کہ باہر ابھی برف باری جاری ہے۔ اپنے دونوں گھوڑوں کو بھی اندر لے آؤ۔ میں نے ان کے چارے اور دانے کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ اچانک رَملہ کی نگاہ گردن جھکائے اور پشت پر ہاتھ باندھے طبرق پر پڑی اور اس نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"یہ تو طبرق ہے۔ اس کے ہاتھ بھی اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔ کیا تم اس مردود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ اسے بھی اندر لے آؤ۔ آتش دان میں آگ روشن ہے اور لوہے کی وہ سلاخیں جنہیں آگ میں سُرخ کر کے اس بدطالع و کم ذات نے ایمن کی آنکھوں میں پھیر کر اس اندھا اور بے بس کر دیا تھا۔ وہی سلاخیں۔ ہاں قسم مجھے موسٰے و ہارون کے رب کی وہی سلاخیں میں نے تمہارے کہنے پر آتش دان میں رکھی ہوئی ہیں اور وہ خوب سُرخ ہو رہی ہیں۔ اسے اندر لے آؤ کہ اس سے قصاص لیا جائے

۔ یہ اپنے مکافاتِ عمل کو پہنچ کر ایسے بدبخت انسان کی تصویر کشی کرے جس کی زندگی ...ں کوئی نغمہ کوئی منظر نہ ہو۔ اس جذبات کے عاری اور کڑے، بے اصول انسان کو اندر ...ؤ کہ اس کی سزا شروع ہو۔

احمد طبرق کو لے کر مکان میں داخل ہوا۔ دونوں گھوڑوں کو ... ین پکڑے قدیما بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ بڑھیا احمد اور طبرق کو اس کمرے میں لائی جس میں آتشدان روشن تھا اور کمرہ خوب گرم ہو رہا تھا۔ احمد نے دیکھا لوہے کی وہ سلاخیں بھی جو آتش دان میں رکھی ہوئی تھیں جنہیں ایمن کی آنکھوں میں پھیرا گیا تھا اور وہ خوب سُرخ ہو رہی تھیں۔ گھاس پھونس کے بنے ہوئے چھپّر تلے گھوڑے کو باندھ کر قدیما بھی وہاں آ گیا تھا۔

رملہ بھی جو احمد اور قدیما کے گھوڑے کو چارہ دانہ ڈالنے چلی گئی تھی، لوٹ آئی احمد کے قریب آ کر اس نے غصّے کے عالم میں طبرق کی طرف دیکھتے ہوئے احمد سے کہا۔ "لوہے کی سلاخیں اب خوب سُرخ ہو رہی ہیں انہیں اُٹھاؤ اور اس کی آنکھوں میں پھیر دو تاکہ اسے احساس ہو کہ انسانیت کیا شے ہے۔"

طبرق نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے منت کرنے کے سے انداز میں کہا۔"میری آنکھوں میں سلاخیں پھیر کر مجھے اندھا نہ کرنا یہ ظلم ہے۔ یہ زیادتی ہے۔ مجھے میری آنکھوں سے محروم نہ کرنا۔ میں یہ تاریک زندگی بغیر آنکھوں کے کیوں کر بسر کر سکوں گا۔"

احمد نے خراشوں کی جلن جیسے لہجے میں کہا۔"جب تم نے ایمن کی آنکھوں میں سلاخیں پھیری تھیں تو ایمن نے بھی ایسے ہی انداز میں تمہاری منت و سماجت کی ہو گی پھر بتاؤ کیا تو نے اس کی پکار کو سُنا۔ کیا تو نے اس کی سماجت پر کان دھرے تھے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اپنے اس نقصان پر فکرمند کیوں ہوتے ہو۔ ازل سے لے کر اب تک تم جیسے ابلیس نما انسان پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور قدرت ان کی بداعمالیوں کی سزا اُنہیں دیتی رہے گی۔ تم ایک جذبات سے عاری انسان ہو۔ اور تم نے ایسے گناہ اور ایسی زیادتیاں کی ہیں جن کا کوئی علاج، کوئی مداوا نہیں ہے۔ آ

حقیر مخلوق! تیری رُوح کو میں ضرور تپش دوزخ اور دل کو آتش سے، واد یار سے رہتا
کر دوں گا۔

احمد نے طبرق سے قریب ہوتے ہوئے کہا۔" سنو! تم نے ایمن کو آنکھوں سے
محروم کیا ہو ابھی میں بھی تجھے تیری بصارت سے محروم کر دوں گا پھر میں تمہیں اپنے ساتھ
افریقہ لے جاؤں گا۔ وہاں اگر ایمن مجھے مِل گئی اور اس نے اس امر کی تصدیق کر دی
وہ تمہارے ہاتھوں بے آبرو نہیں ہوئی تو میں تجھے اس کے حوالے کر دوں گا۔ وہ تجھے
چاہے سزا دے اور اگر وہ تمہارے ہاتھوں بے آبرو ہو چکی ہوئی تو قسم مجھے اس ذات کی
جس نے چھ یوم میں آسمان و زمین کو تخلیق کیا میں قصاب بن کر تجھے بکرے کی طرح ذبح کر
دوں گا۔"

احمد پیچھے ہٹا اور آتش دان سے اس نے لوہے کی سُرخ سلاخیں اُٹھالی تھیں۔
طبرق خوف و دہشت سے تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ احمد آگے بڑھا طبرق کا سر اس نے اپنے
دونوں گھٹنوں میں دبا کر اس نے لوہے کی سلاخیں اس کی آنکھوں میں پھیر کر اسے اندھا کر
دیا تھا۔ چند ثانیوں تک طبرق ذبح ہونے والے بکرے کی طرح ممیاتا رہا پھر ایک سِسکتی ہوئی
دلدوز چیخ مار کر وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

بوڑھی رملہ کے چہرے پر گہرا سکون تھا۔ شاید وہ ایمن کے قصاص لیے جانے
پر مطمئن تھی۔ جلدی جلدی اس نے کھانا نکال کر آتش دان کے پاس لگا دیا اور احمد قدیما کے
ساتھ وہاں بیٹھ کر خاموشی سے کھانا کھانے لگا تھا۔ اس دوران بوڑھی رملہ نے ان کے لیے
بستر لگا دیئے تھے۔ کھانے کے بعد احمد نے طبرق کے ہاتھ کھول دیئے اور اسے اُٹھا کر
بستر میں ڈال دیا۔ خود بھی آتش دان کے قریب وہ قدیما کے ساتھ لیٹ کر گہری نیند سو گیا
رات کے پچھلے حصّے میں احمد اچانک نیند سے بیدار ہو کر بیٹھ گیا۔ آتش دان کے
دوسری طرف لحاف میں دبکی ہوئی رملہ بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی اور احمد کو مخاطب کرتے ہوئے
اس نے بڑی شفقت سے پوچھا" کیا بات ہے بیٹے! تم جاگ کیوں گئے ہو"۔
احمد نے آنکھیں مَلتے ہوئے کہا۔" میں طبرق کو لے کر اب یہاں سے روانہ ہو جاتا ہوں"

رملہ نے اپنے آپ کو لحاف میں اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا۔" رات کے وقت اس
سردی میں تم کُوچ کرو گے! سورج طلوع ہونے دو پھر میں تمہارے لیے کھانا اور
زادِ راہ تیار کروں گی اور تم دن کے وقت یہاں سے روانہ ہونا۔ ہو سکتا ہے برف باری
تھم جائے اور دھوپ نکل آئے"۔

احمد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔" میں آپ کا ممنون ہوں لیکن مجھے اندھیرے
ہی یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ مجھے ابھی طبرق کے ان چار ساتھیوں سے بھی
نمٹنا ہے جن میں سے دو بالخورہ شہر میں اور دو سفناری میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ اس
کے گناہ میں پوری طرح شریک ہیں لہٰذا میں اُنہیں بھی سزا دوں گا تاکہ ان جیسا ان کا کوئی
اور بھیڑیا ایسی حرکت کرنا چاہے تو اسے عبرت ہو۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے اس شہر
میں طبرق کا کوئی جاننے والا ہو لہٰذا اندھیرے ہی اندھیرے اسے یہاں سے نکال کر مجھے دُور
چلے جانا چاہیے۔ تم فکر نہ کرو میں ایمن کو تلاش کروں گا اور بہت جلد تمہارے شوہر
کو تمہارے پاس واپس بھیجوں گا۔ ہو سکتا ہے وہ دونوں چوری چھپے کسی جہاز میں بیٹھ
کر افریقہ روانہ ہو گئے ہوں اور وہاں ایمن قدیما کے گھر یا اپنے کسی اور عزیز کے ہاں چلی
گئی ہو۔ میں دیکھتا ہوں برف باری رُکی ہے یا نہیں پھر میں قدیما اور طبرق کو جگاتا ہوں
یہاں سے کُوچ کریں"۔

احمد کمرے کے اس دروازے پر آیا جو باہر گلی میں کُھلتا تھا۔ پھر دروازہ کھول
کر جب وہ باہر نکلا تو اس نے دیکھا برف باری تھم چکی تھی۔ چاند کسی دخترِ صحرا کی طرح
مسکراتا ہوا آسمان کے وسط میں چمک رہا تھا۔ سمن اندام چاندنی زمین کے بھیگے بدن
سے لپٹ کر اسے آہنگِ زبور جیسی پریت ریت کا کوئی آسمانی پیغام سُنا رہی تھی۔
سُود و زیاں کے جذبوں سے ماورا نیند و خوابیدگی سے رشتۂ محکم جوڑے ہوئے تھی
ٹھنڈی سرد رات عروس بدی کی طرح اپنے سوزِ نہاں جذبوں کے ساتھ نرم نرم اُجالے
بازم آرائی کر رہی تھی۔ چاند کسی سرچشمۂ آبِ بقا کی طرح چاروں طرف چاندنی بکھیر
رہا تھا اور وقت کا سیل بڑی تیزی سے بھاگتا جا رہا تھا۔

احمد دوبارہ کمرے میں آیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے پکارا ”قدیما! اُٹھ جاؤ برف باری تھم چکی ہے اور ہمیں فوراً یہاں سے کوچ کر جانا چاہیئے۔“

قدیما اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بوڑھی رملہ بھی اُٹھی اور اس نے آتش دان کی مدھم ہوتی آگ میں اور لکڑیاں ڈال کر اسے خوب بھڑکا دیا تھا۔

احمد نے کمرے کے دوسرے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ”قدیما! قدیما! میں دونوں گھوڑوں پہ زینیں ڈالتا ہوں۔ اتنی دیر تک تم طبرق کو اُٹھا کر باہر لاؤ۔“ احمد تیز قدم اُٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ بوڑھے قدیما نے بھی جلدی جلدی لحاف ایک طرف پھینکا اور طبرق کو جگانے کے لیے اس کی طرف بڑھا تھا۔

قدیما نے آگے بڑھ کر طبرق کا شانہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اُٹھ جاؤ کوچ کا وقت ہو گیا ہے۔ ہم یہاں سے رخصت ہو رہے ہیں۔ شاید اس کی آنکھوں کی تکلیف میں کمی ہو گئی تھی اور وہ قدرے سکون میں تھا۔ اپنے ہاتھ ہوا میں ادھر اُدھر مارتے ہوئے اس نے پوچھا۔ کیا تم قدیما ہو۔ قدیما نے کہا ”ہاں میں قدیما ہوں۔ اٹھو ہم کوچ کر رہے ہیں۔“

طبرق نے درد بھری آواز میں کہا ”تمہارا ساتھی کہاں ہے جس کا نام احمد ہے۔“ قدیما نے کہا ”وہ باہر گھوڑوں پہ زینیں ڈال رہا ہے۔“ طبرق نے زخمی لہجے میں کہا ”تمہارے اس ساتھی نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ اس نے مجھے آنکھوں سے محروم کر کے ایک مجبور و بے بس انسان بنا دیا ہے۔“

قدیما نے غصے میں کہا۔ ”امین کو اندھا کرتے وقت تم نے کیوں نہ سوچا کہ وہ بے چاری بھی لاچار اور مجبور ہو جائے گی۔“

طبرق دُکھتے الفاظ میں کہہ رہا تھا ”میں اپنے آپ کو ایک بے بدل تیغ زن اور بے تمثیل شجاع سمجھتا تھا لیکن اس احمد نے مجھے زیر کر کے میری برہمی کے سارے رنگ اور میرے گھمنڈ کے سارے ریگِ سراب بکھیر کر منتشر کر دیے ہیں۔ کاش کوئی اسے بھی ایسے ہی زیر کر کے مارے جس طرح اس نے مجھے مارا ہے۔ میری آنکھیں ہوں اور میں اس کی یہ بے بسی اور لاچاری دیکھوں اور قہقہے لگاؤں۔“

قدیما نے طبرق کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”ان بُرے خیالوں اور ادھورے خوابوں کو چھوڑ دو۔ اُٹھو چلیں۔ باہر احمد دونوں گھوڑوں پر زینیں ڈال کر ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ اپنی حالت پہ افسوس نہ کرو۔ اسے اپنی تقدیر کا نوشتہ اور اپنے اعمال کا خمیازہ سمجھ کر قبول کر لو۔“

طبرق اُٹھ کھڑا ہوا۔ قدیما اسے باہر لایا۔ رملہ بھی ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ تینوں گھاس پھوس کے اس چھپر میں آئے جس میں گھوڑے بندھے تھے۔ وہاں احمد گھوڑوں پر زینیں ڈالے قدیما اور طبرق ہی کا انتظار کر رہا تھا۔

احمد آگے بڑھا اور طبرق کو اٹھا کر اس نے اپنے گھوڑے پہ بٹھایا اور اسے ایک نرم اُونی کمبل اوڑھا دیا تھا۔ طبرق نے ایک ہاتھ سے زین کا ہنا پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کمبل کے کنارے پکڑ لیے تھے جو احمد نے اس پہ ڈال دیا تھا۔ پھر اس نے غمگین سی آواز میں کہا۔ اب جب کہ میں بے ضرر اور بے عمل ہو چکا ہوں تم مجھے کہاں لے جاؤ گے۔“

احمد نے اپنے گھوڑے کی باگ تھامتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو مجھے تمہارے ان ساتھیوں سے بھی نمٹنا ہے جو لحیان اور امین کی تلاش میں سفناری اور بالخورہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یاد رکھو اگر تم نے مجھے ان کی غلط نشاندہی کی تو میں تمہیں اُلٹا لٹکا کر تمہاری چمڑی اُتار دوں گا۔“ پھر احمد نے اپنے گھوڑے کی خرجین سے نقدی کی ایک تھیلی نکال کر بوڑھی رملہ کو تھماتے ہوئے کہا ”یہ اپنے پاس رکھو۔ ان میں سنہری سکے ہیں اور تم اپنی زندگی کے بقیہ دن ان سکوں سے بڑی خوشحالی اور سکون سے گزار سکو گی۔“

رملہ نے تھیلی لے لی۔ احمد اور قدیما اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور وہاں سے کوچ کر گئے تھے۔



ایک روز جب کہ سورج کسی طفلِ شیر خوار کی طرح کائنات کو غم گساری اور تنگ باری سے دیکھتا ہوا غروب ہو رہا تھا۔ احمد، قدیما اور طبرق کے ساتھ کریٹ کے

جنوب مغربی ساحلی شہر بالخورہ سے صرف ایک میل کے فاصلے پر اس شاہراہ کے قریب تھا جو بالخورہ سے مغربی ساحلی شہر اور بندرگاہ سفاری کی طرف جاتی تھی۔

احمد نے شاہراہ کے کنارے اپنے گھوڑے کو ایک ایسے بلند ٹیلے پر چڑھا دیا۔ جو گھاس سے اٹا ہوا تھا۔ قدیا بھی اس کے پیچھے پیچھے اُوپر آ گیا تھا۔

ٹیلے کے اُوپر آ کر احمد نے طبرق کو گھوڑے سے نیچے اُتارتے ہوئے کہا۔ "ہم اس وقت بالخورہ شہر کے قریب ہیں۔ بولو تمہارے دو ساتھی یہاں کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔

طبرق خاموش رہا اور کچھ سوچنے لگا۔ احمد نے بھرتی اور سخت آواز میں کہا۔ "خاموش رہو گے تو نقصان اُٹھاؤ گے۔ اگر تم نے چُپ سادھے رکھی یا غلط بیانی سے کام لیا تو یاد رکھو میں تمہیں زندہ کھال میں سی کر کریٹ کے سمندر میں پھینک دوں گا۔"

طبرق نے جھٹ کہہ دیا میں غلط بیانی سے کام نہیں لوں گا۔ بالخورہ شہر کے شمال میں چار سرائیں ساتھ ساتھ اکٹھی ہیں۔ ان میں دائیں سے دوسری سرائے میں میرے دونوں ساتھی ہوتے ہیں۔ اس سرائے کے سامنے اکثر گھوڑوں کی نعل بندی کرنے والے بیٹھے رہتے ہیں۔ اسی سرائے میں میرے دونوں ساتھی ٹھہرے ہوں گے۔"

احمد نے پھر پوچھا۔ "ان دونوں کے نام بھی کہو"۔ طبرق نے جھٹ کہہ دیا۔ "ان میں سے ایک کا نام یوآسن اور دوسرے کا نام تولو ہے۔ دونوں حبشی ہیں اور میرے پرانے خادموں میں سے ہیں۔ یوآسن کا قد ذرا لمبا ہے اور چہرے اور پیشانی پر کئی داغ بھی ہیں۔ وہ دونوں ہی اچھے تیغ زن اور خونخوار ہیں۔ تم ان دونوں کی طرف جاؤ۔ اتنی دیر تک میں یہاں قدیا کے ساتھ بیٹھ کر دُعا مانگوں گا کہ میرے وہ دونوں ساتھی تم پر شک کریں۔ تمہیں پہچان جائیں کہ تم ہی احمد ہو اور پھر تمہیں ایسی ہی کڑی سزا دیں جیسی تم نے مجھے دی ہے۔ کاش میری آنکھیں ہوتیں اور میں تمہاری بے بسی دیکھتا۔"

احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم ضرور دُعا مانگو۔ پر یاد رکھو ایسی دعائیں جو تم جیسے غلیظ ذہن سے نکلی ہوں قبول نہیں ہوتیں۔ میں تمہارے دونوں ساتھیوں کو بھی تمہارے پاس لا کر بے بسی کی موت ماروں گا۔"

پھر احمد نے طبرق کے دونوں ہاتھ اس کی پُشت پر باندھ دیئے اور قدیا سے کہا۔ "قدیا! قدیا! میں شہر کی طرف جاتا ہوں۔ اپنے کھانے کے سامان کے علاوہ میں گھوڑوں کے توبرے بھی خوراک سے بھرا لاؤں گا۔ تم طبرق کا خیال رکھنا۔ اگر یہ شور کرنے کی کوشش کرے یا بھاگنا چاہے تو تمہیں اجازت ہے تم اس کی گردن کاٹ سکتے ہو۔ میں دیر نہیں لگاؤں گا بہت جلد لوٹ آؤں گا۔" زقند لگا کر احمد اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور ٹیلے سے نیچے اتر کر وہ اسے شہر کی طرف سرپٹ دوڑا رہا تھا۔

احمد بالخورہ شہر میں داخل ہوا۔ پہلے اس نے کھانے کا سامان خرید کر چرمی خرجین میں ڈال لیا تھا پھر ایک جگہ سے اس نے گھوڑے کے لیے دانے کے دونوں توبرے بھرا لئے اور زین سے باندھ لیے تھے۔ اس کے بعد اس نے ان شمالی سراؤں کا رُخ کیا تھا جس کی نشاندہی طبرق نے اسے کی تھی۔ وہ اس سرائے میں داخل ہوا جس کے سامنے نعل بندی کرنے والے بیٹھے تھے۔ سورج چونکہ اب غروب ہو چکا تھا لہٰذا وہ سب اپنا اپنا سامان سمیٹ کر اپنے گھروں کو جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

احمد اپنے گھوڑے کو باہر باندھ کر سیدھا سرائے کے مالک کے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں اس سے پوچھا۔ "کیا تمہاری سرائے میں دو ایسے جوان ٹھہرے ہوئے ہیں جن میں سے ایک کا نام یوآسن اور دوسرے کا نام تولو ہے"۔

سرائے کے مالک نے کہا۔ "ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تم کہاں سے آئے ہو، اور ان سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔ کیا تم ان کے جاننے والے ہو۔"

احمد نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "تم خواہ مخواہ شک کر رہے ہو۔ تم ان دونوں کو یہیں بُلا دو۔ میرے پاس ان دونوں کے لیے ایک انتہائی اہم پیغام ہے۔ بس تم جانو کہ ان دونوں کی زندگی خطرے میں ہے اور میں اُنہیں امن و سلامتی کا پیغام دے کر موت سے دُور لے جانا چاہتا ہوں"۔

سرائے کے مالک نے اس بار بڑی ہمدردی سے کہا۔ "تمہاری باتوں میں سچائی اور تمہارے الفاظ میں خلوص کی خوشبو ہے۔ تم فکر مند نہ ہو میں ان دونوں کو ابھی بلاتا ہوں"۔

احمد وہیں کھڑا رہا۔ سرائے کے مالک نے اپنے ایک خادم کو یوآسن اور تولو کو بلانے بھیج دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو خوب کڑے جوان جو دونوں حبشی تھے سرائے کے مالک کے پاس آکھڑے ہوئے۔ احمد جان گیا کہ وہ یوآسن اور تولو ہیں کیونکہ وہ دونوں حبشی تھے۔

سرائے کے مالک نے احمد سے کہا۔ "یہ یوآسن اور تولو ہیں۔ کہو تم ان سے کیا کہنا چاہتے ہو"۔ ان دونوں میں سے ایک جو قد میں لمبا اور جس کے چہرے اور پیشانی پر زخموں کے داغ تھے اسے احمد نے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جس طرح طبرق نے مجھے بتایا ہے اس کے مطابق اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تم یوآسن ہو اور تمہارا یہ ساتھی تولو ہے"۔ اس جوان نے تڑپ کر کہا۔ "ہاں میرا ہی نام یوآسن ہے۔ طبرق تمہیں کہاں ملا۔ کیا اس نے تمہیں ہمارے لیے کوئی پیغام دے کر بھیجا ہے"۔

احمد آگے بڑھا اور یوآسن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے دباتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں ذرا میرے ساتھ آؤ۔ میں علیحدگی میں تم دونوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔ یوآسن اور تولو چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیے۔

احمد دونوں کو سرائے سے باہر اس جگہ لایا جہاں اس کا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ یوآسن نے پریشان اور بکھری بکھری سی آواز میں کہا۔ "تمہارے اطوار و انداز بتاتے ہیں کہ تم ہمارے لیے کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں تم ہمیں دھوکہ دے کر کسی کڑے جال اور اندھے کنوئیں میں پھانسنا چاہتے ہو"۔

احمد نے اپنے گھوڑے کی گردن تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا گھوڑا ہے اور میں ابھی ابھی بالخورہ شہر میں داخل ہوا ہوں۔ احمق نہ بنو، میں تم دونوں کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ میری بات غور سے سنو! یہ حقیقت ہے کہ میں تمہارے لیے بری خبر لے کر آیا ہوں لیکن جو کچھ میں کہنے والا ہوں اس میں تم دونوں کی زندگی کا راز اور سلامتی کا پیغام ہے"۔

سنو! میرے عزیزو مجھے غور سے سنو! طبرق ایمن نام کی جس لڑکی کو قرطاجنہ

سے اٹھا کر لایا تھا اس کا مسلمان منسوب بھی یہاں پہنچ چکا ہے۔ وہ اپنے ساتھ قرطاجنہ کے ایک یہودی قدیما کو بھی لایا ہے۔ یہ شخص ایمن کے عزیزوں میں سے ہے اور تم سب کو جانتا اور پہچانتا ہے۔

اس مسلمان نے جس کا نام احمد ہے کریٹ میں وارد ہو کر پہلے حلیم شہر میں تمہارے ان دو ساتھیوں کو ہلاک کر دیا جو وہاں ایمن اور لمحان یہودی کی تلاش میں قیام کیے ہوئے تھے۔ یہ کام اس نے حلیم کے یونانی کمان گرامیتس سے پوری اطلاعات حاصل کرنے کے بعد کیا تھا۔ اس کے بعد وہ اچانک کندناس شہر میں نمودار ہوا وہاں اس نے لمحان کی بیوی کے ہاں قیام کیا اور طبرق کے متعلق ساری معلومات اس خاتون سے لینے کے بعد ایک رات اس نے طبرق کی رہائش گاہ پر شب خون مارا۔ وہاں بھی اس نے طبرق نے دونوں ساتھیوں کو تہ تیغ کیا اور طبرق کو اٹھا کر وہ لمحان کے گھر لے گیا وہاں اس نے لوہے کی سلاخیں گرم سرخ کر کے طبرق کی آنکھوں میں پھیر کر اسے اندھا کر دیا۔

یوآسن نے بیچ میں جلدی جلدی اور زخمی زخمی سی آواز میں پوچھا۔ "ٹھہرو! ٹھہرو! اجنبی پہلے میری بات سنو اور یہ بتاؤ طبرق اس وقت کہاں ہے"۔

احمد نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں بتا تو رہا تھا کہ تم ایسے ہی درمیان میں بول پڑے۔ سنو! میں کہہ رہا تھا لمحان یہودی کے ہاں اس احمد نے طبرق کو اندھا کر دیا اور پھر وہ تم دونوں سے نمٹنے کے لیے بالخورہ کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ طبرق کو اس نے لمحان کے گھر میں ہی اس کی بیوی کی نگرانی میں چھوڑ دیا تھا۔ اسی دوران میں وہاں پہنچ گیا۔ اور میں نے طبرق کو وہاں سے نکال لیا۔ طبرق چاہتا تھا کہ برق رفتاری سے سفر کر کے تم دونوں کی جانیں بچائی جائیں لہٰذا ہم نے ادھر کا رخ کیا۔

بالخورہ سے سفناری جانے والی شاہراہ کے کنارے طبرق تم دونوں کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ تم دونوں کو ساتھ لے کر فی الفور سفناری کی طرف روانہ ہونا چاہتا ہے۔ تاکہ وہاں ٹھہرے ہوئے دونوں ساتھیوں کی جانیں محفوظ کی جاسکیں۔ تولو نے برہمی میں کہا "تم ہمیں احمد سے یوں خوفزدہ کر رہے ہو جیسے وہ انسان نہیں وحشت کا کوئی طوفان

ہو جو اپنے ساتھ ہر چیز کو گرداوز کی طرح اڑا لے جائے گا۔

احمد نے فوراً اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے دیکھا تو نہیں پر جس طرح مجھے یونانی کمان گر امیتس اور لمحان یہودی کی بیوی نے اس کے متعلق بتایا ہے۔ ان واقعات و حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے کراں و بے پایاں سمندر کی طرح گہرا اور جادو داں و شعلہ فشاں آگ کی طرح سُبک عمل ہے۔ تمہارے دو ساتھیوں کو اس نے حلیم شہر میں یونانی کمان گر امیتس کے سامنے قتل کیا تھا۔ میں جب امیتس سے ملا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ شخص نہایت تند و تیز ہے اور اپنے دشمن پر وہ ہنگامہ خیز طوفان کی طرح حملہ آور ہوتا ہے"۔

احمد جب خاموش ہوا تو یوآسن نے پوچھا۔ "پہلے یہ بتاؤ تم کون ہو تمہارا نام کیا ہے اور کس سلسلے میں تم کریٹ میں داخل ہوتے ہو"۔

احمد نے فوراً کہا۔ "میں کوہستانِ اطلس کے نواح کا بربر ہوں۔ میرا نام سمرون ہے۔ پہلے غلام تھا پھر نیک نیتی سے اپنے آقا کی خدمت کرنے پر آزاد کر دیا گیا۔ میرا یہ داغا ہوا چہرہ میرے غلام ہونے کا ثبوت ہے۔ طبرق کا بڑا بھائی میرا جاننے والا ہے میں اس سے ملنے آیا تو وہ اپنی حویلی میں زخمی پڑا تھا اور طبیب اس کا علاج کر رہے تھے میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ احمد نام کا مسلمان اسے زخمی کر کے اس کی بہن ثما کو اُٹھا کر لے گیا ہے اور جاتے ہوئے وہ کہہ گیا تھا کہ جب امین کو لوٹاؤ گے ثما کو لے جانا۔ میں تو طبرق کے بڑے بھائی کے کہنے پر طبرق سے یہ کہنے آیا تھا کہ امین کو لوٹا کر ثما کو بچا لے لیکن یہاں آ کر مجھے اور ہی خوفناک حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اس کے باوجود اگر تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتے ہو تو نہ سہی میں واپس لوٹ جاتا ہوں اور طبرق سے جا کر کہہ دیتا ہوں کہ وہ نہیں آنا چاہتے لیکن میری ایک نصیحت یاد رکھنا کہ جب تم احمد کا سامنا کرو گے تو تمہاری حالت ان خشک پتوں جیسی ہو گی جو پت جھڑ کے طوفانوں میں بے ٹھکانہ ہو جاتے ہیں"۔ اس کے ساتھ ہی احمد ایک زہریلی جست لگا کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا۔

یوآسن نے فوراً اسے روکتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو! ہمیں تم پر اعتماد اور بھروسہ ہے۔ ہم تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ اگر تم نے ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کی تو بھی ہمیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں کہ تم ہم دونوں میں سے کسی ایک کا بھی تیغ زنی میں سامنا نہ کر سکو گے۔ تم ذرا رکو ہم اپنے گھوڑے لے آئیں پھر تمہارے ساتھ چلتے ہیں"۔ یوآسن اور تولو تقریباً بھاگتے ہوئے سرائے کے اندر چلے گئے احمد وہیں اپنے گھوڑے پر سوار ان کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد یوآسن اور تولو دونوں اپنے گھوڑوں پر سوار سرائے سے نکلے اور احمد کے قریب آ کر کہا "چلو چلیں"۔

احمد نے جواب میں ایک غلط نگاہ ان دونوں پر ڈالی پھر اس نے اپنے سر پر خود اور پشت پر لٹکتی ہوئی ڈھال اور تیروں سے بھرے ترکش کو درست کیا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس نے ہانک دیا تھا۔

شہر کے اندر وہ تینوں اپنے گھوڑوں کو دُلکی چال چلاتے رہے جب کہ شہر سے باہر نکل کر انہوں نے اپنے گھوڑوں کو بالخورہ سے نکل کر سفناری کی طرف جانیوالی شاہراہ پر مہمیز لگا کر سرپٹ دوڑا رہا تھا۔

شمال مغرب کی طرف جانے والی اس شاہراہ پر احمد نے ایسے طوفانی اور جنونی انداز میں اپنے گھوڑے کو بھگایا تھا کہ یوآسن اور تولو دونوں پریشان ہو گئے تھے کیونکہ وہ دونوں ہی گھوڑا دوڑانے میں اس کا ساتھ نہ دے سکے تھے اور کچھ پیچھے رہ گئے تھے۔

ایک میل آگے جا کر احمد نے اپنے گھوڑے کو ایک ٹیلے پر چڑھا دیا تھا جس پر طبرق کے پاس قدیما کھڑا بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اوپر جا کر احمد اپنے گھوڑے سے اُترا اور طبرق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"طبرق! طبرق! میں تمہارے دونوں ساتھیوں یوآسن اور تولو کو بھی یہاں لے آیا ہوں۔ اور یہیں اس کوہستان کی چوٹی پر انہیں موت کی دعوت دوں گا۔ وہ دونوں ٹیلے پر چڑھ رہے ہیں۔

یوآسن اور تولو بھی ٹیلے کے اُوپر آکر اپنے گھوڑوں سے اُترے۔ یوآسن بھاگ کر آگے بڑھا اور بے بسی کی حالت میں بیٹھے اندھے طبرق سے لپٹتے ہوئے اس نے کہا۔ "طبرق! طبرق! مَیں یوآسن ہوں، میرے ساتھ تولو ہے۔ مَیں اس بربر سمرون سے تمہاری بے بسی کی پوری داستان سُن چکا ہوں، کاش احمد نام کا وہ مسلمان میرے سامنے آتا تو مَیں اسے بتاتا طبرق کے محافظ اپنا حق ادا کرنا کیسے جانتے ہیں۔ قسم مجھے مقدّس آگ کی، قسم مجھے مقدّس ہیکلوں اور معبدوں کے عظیم میناروں اور سنہری کلسوں کی اس مسلمان کا اگر میرے ساتھ سامنا ہوتا تو مَیں اپنی تلوار کی نوک سے اس کی شجاعت اور خونخواری کے سارے علت و نتائج اس کے خون میں ڈبو کر اس کے مُنہ پر دے مارتا۔ کاش وہ مجھے لڑائی کی دعوت دیتا۔ کاش وہ مجھے رزم گاہ کی طرف پکارتا تو مَیں اسے اس کا عہدِ طفولیت یاد دلا دیتا۔"

طبرق نے خفگی اور تاسف انگیز لہجے میں کہا۔ "یوآسن! یوآسن! احمق نہ بنو، اس کا نام سمرون نہیں، نہ ہی یہ بربر ہے۔ یہی احمد ہے اور اس کے ساتھ جو بوڑھا ہے یہ قرطاجنہ کا زرگر قدیما ہے۔ یوآسن! یوآسن! آج تم اور تولو دونوں میری خاطر اپنی غیور طبیعت اور جوان آرزوؤں کا مظاہرہ کرو اور اس احمد کو یہاں ان ویرانوں میں شکست دے کر اس کی رُوح کو روند ڈالو اور اس کے دل کا سینہ چیر ڈالو۔"

یوآسن اور تولو نے ایک ساتھ مُڑ کر احمد کی طرف دیکھا اور دونوں دنگ رہ گئے۔ احمد ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں ڈھال اور دوسرے میں خون آلود تلوار تھی۔ اس کی آنکھیں صبح کی پلکوں کی طرح سُرخ ہو گئی تھیں اور ان میں ایک سنگ دل پاسبان کی سی تپش اور سوز اور ایک غیر مہذب کوریان کا سا غیر فانی جذبہ اور ابدی آرزو تھی۔ بالخورہ شہر کی سرائے میں ان سے گداز طبیعت، آزادی و شادابی اور مدافعانہ لہجے میں گفتگو کرنے والا احمد ان کے سامنے اس زہریلے سانپ کی طرح کھڑا تھا جو جنگل میں راہگیروں کا راستہ روک دینے کا عادی ہو۔ اس کی حالت اس درندے کی طرح خونخوار تھی جو کسی دریا کے بتن پر کسی جانور کی بُو پا کر چوکنا ہو گیا ہو۔

یوآسن کچھ کہنے ہی والا تھا کہ طبرق کی آواز پھر بلند ہوئی۔ "یوآسن! یوآسن! تم

دونوں خوب چوکنے ہو کر اور دیکھ بھال کر اس کا سامنا کرنا۔ یہ تیغ زنی کے فن کا شیطان ہے اور ہر حالت میں تم دونوں پر غالب ہونے کی کوشش کرے گا۔"

یوآسن اور تولو دونوں نے اپنی تلواریں کھینچ لی تھیں۔ قدیما احمد کے کہنے پر پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوا۔ طبرق بڑی بے تابی سے اس مقابلے کا انتظار کرنے لگا تھا۔

رات ہو گئی تھی۔ چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ عالم سماوات میں چمکا ہوا ایسا ہی دل کش اور حسین لگ رہا تھا جیسے کوئی دخترِ حوّا اپنی رنگین پنڈلیاں برہنہ کیے کسی شفاف پانی کی ندی میں اتری ہو۔ دن بھر کے گم گشتہ ستارے ظلمات کی راہگزروں پر درد کی شمعیں روشن کرتے محبتوں کے چمن میں جدائی کی ہواؤں کے گیت گاتے ہوئے خلائے بسیط میں اپنے اپنے رنگ بھرتے جا رہے تھے۔

یوآسن نے غصّے اور قہر کے عالم میں اپنی تلوار لہراتے ہوئے احمد سے کہا۔ "تم نے اچھا کیا ہمیں یہاں لے آئے۔ اگر اس چاندنی رات میں تم سے مَیں اپنے قتل ہونے والے ساتھیوں کا انتقام نہ لوں اور طبرق کے اندھا کرنے کی پوری قیمت وصول نہ کر دوں تو مجھے طبرق کا محافظ اور تیغ زن نہیں خنزیر یا اور غلیظ کہنا۔ تم نے کریٹ آ کر دھوکہ دہی سے جو چند کامیابیاں حاصل کر لی ہیں۔ ان سب کی مَیں درکشائی کر دوں گا اور تیری ساری شان تیری ساری رفعت پھٹے کپڑے کی طرح ان گھنی فضاؤں میں بکھیر دوں گا۔"

احمد نے ایک غلط اور دُزدیدہ نگاہ یوآسن پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "مَیں نے بڑی تلخ زندگی بسر کی ہے۔ اس زندگی میں تیرے جیسے کئی کتّے مجھ پر بھونکے پر مَیں نے ہر ایک کو بھگا دیا۔ سُن رکھ مَیں اَلْوَقْتُ سَیْفٌ قَاطِعٌ کی طرح تیری ساری رگیں کاٹ کر تجھے تیری زندگی کی تنگنائے میں دفن کر دوں گا۔ جان لے کہ جس طرح سمندر کبھی نہیں سوتا اسی طرح میں بھی اپنے دُشمن کے سامنے ہمہ وقت چوکنّا رہتا ہوں۔ تُو ابھی تو بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہا ہے لیکن یاد رکھ جب میری تلوار برکھا کے دھارے کی طرح تم دونوں پر برسے گی تو تمہارے جسموں سے خوف و دہشت کے پسینے کے علاوہ تمہارے خون کی رم جھم بوندیں بھی برسیں گی اور تم دونوں اپنے آپ کو

اس غمِ شب میں دُکھ کے قفس میں گرفتار کسی راہبہ کی طرح محسوس کر رہے ہوں گے۔ میں اگر بزدل ہوتا تو تم دونوں کو یہاں نہ لاتا۔ راستے میں یا اس کوہستان کے اُوپر جس وقت تم دونوں طرق سے محوِ گفتگو تھے اور میں ننگی تلوار پکڑے کھڑا تھا تم دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا لیکن تم نے دیکھا میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں تم دونوں کو اپنے دفاع کے پورے مواقع فراہم کروں گا۔ دیکھو اس کوہستان کی چوٹی پر رات کے سناٹے میں تم دونوں کو میں ایک ساتھ مقابلے کی دعوت دیتا ہوں۔"

یوآسن نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "میں اکیلا ہی تم پر بھاری ہوں۔ میرا ساتھی تمہاری بے بسی دیکھے گا سنبھلو میں تم پر حملہ آور ہوتا ہوں۔ پھر دیکھتا ہوں تم کتنی دیر تک میرے سامنے جمتے ہو۔"

یوآسن نے آگے بڑھ کر احمد پر حملہ کیا جسے احمد نے اپنی ڈھال پر روک لیا تھا۔ پھر احمد نے زور سے چلّا کر پکارا وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّی (بس میرا رب ہی باقی رہے گا) اس کے ساتھ ہی احمد نے اپنی پوری وسعت و ہمہ گیری اور جدت کی تمام فراوانی کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ بالکل یوں جیسے کوئی گھنگھور گھٹا خشک زمین پر اچانک برس پڑی ہو جیسے کوئی صیاد و نگہبان اچانک کسی پر ٹوٹ پڑا ہو۔

یوآسن کو کوہستان کے اُوپر سے دھکیلتا ہوا وہ نشیب کی طرف لے گیا تھا۔ لگتا تھا رات کے ہولناک سناٹے میں یوآسن پر حملہ آور ہوتے ہوئے وہ لہرا کر شعلہ بن جائے گا اور نبضِ فطرت روک دے گا۔

احمد کے طوفانی اور خوفناک حملوں کے سامنے یوآسن خوفزدہ ہو گیا اور گھبراہٹ کے عالم میں وہ اپنی مدد کے لیے زور زور سے چلّانے لگا۔ "تولو! تولو! تم پشت کی طرف سے اس پر حملہ کر دو ورنہ یہ مجھے کاٹ کر رکھ دے گا۔ تولو! تولو! جلدی کرو۔ میں نے اس سے اکیلے مقابلہ شروع کر کے حماقت کی ہے۔ اس پر حملہ کر دو۔ دونوں مل کر اس پر قابو پالیں گے۔" تولو اپنی تلوار لہرا کر آگے بڑھا ہی تھا کہ احمد کی تلوار یوآسن کے کندھے پر گری اور چھاتی کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

رات کی پُرفریب خاموشی میں یوآسن ایک خوفناک اور عبرت خیز چیخ مار کر گرا اور پھر نشیب میں لڑھکتا ہوا وہ دُور نیچے چلا گیا تھا۔ چاندنی رات میں اپنی خون ٹپکتی تلوار کے ساتھ احمد جب تولو کی طرف مڑا تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ کر اپنی جان بچانا چاہتا تھا کہ احمد تیزی سے آگے بڑھا اور اس پر حملہ کر دیا تھا تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ کر اپنی جان بچانا چاہتا تھا کہ احمد تیزی سے آگے بڑھا اور اس پر حملہ کر دیا تھا۔ تولو مقابلے سے جان چھڑا کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ ایسا بھی نہ کر سکا کیونکہ بھاگ جانے کا نتیجہ بھی احمد کی تلوار ہو سکتا تھا۔

تولو جو پہلے ہی احمد کے خونخوار حملوں کے سامنے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ صرف چند لمحوں تک ہی احمد کا سامنا کر سکا۔ احمد کی تلوار اس کی گردن پر گری تھی اور تولو کو خون میں نہلاتی ہوئی نکل گئی تھی۔ رات کی نازک مزاج خاموشی ایک بار پھر محروم راحت ہو کر خاموش ہو گئی تھی۔

احمد اپنی تلوار لہراتا ہوا طرق کے پاس آیا اور اپنی تلوار کی نوک اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے یوآسن اور تولو کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اب تمہارے ان ساتھیوں کی باری ہے جو سفاری شہر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ دیکھو پھر پہلے کی طرح سچ کہنا ورنہ نہایت کڑی سزا دوں گا۔ بولو وہ کہاں ہیں اور ان کے نام کیا ہیں۔"

طرق نے رُکے بغیر کہہ دیا ان کے نام طیفور اور کمنیز ہیں اور سفاری شہر کے ساحلی علاقے کی ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس سرائے کا مالک وینس کا رہنے والا ہے اور اس کا نام ہالیس ہے۔"

احمد نے مطمئن انداز میں کہا۔ "اب مجھے تمہارے آخری دو ساتھیوں کو تلاش کرنے میں دقت نہ ہوگی۔ میں سرائے کے مالک اس وینسی بوڑھے کو جانتا ہوں اور کریٹ میں داخل ہونے کے بعد ایک رات اس کی سرائے میں قیام کر چکا ہوں۔ طرق! طرق! تم نے دیکھا برائی اور بدی کا انجام کیسا عبرت ناک ہوتا ہے۔ جب تک امین نہیں تھی میں غم اور دُکھ کو تمہاری زندگی کا جزوِ اعظم بنائے رکھوں گا سنو طرق!

زندگی ایک نیند ہے اور موت اس کی بیداری اور میں تمہاری زندگی کو ان دو عوامل کے درمیان تکلیف دہ حالت میں منتظر رہنے پر مجبور کر دوں گا۔"

طبرق خاموش رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ یوآسن اور توتو کی موت نے اس کی رہی سہی ساری امیدوں پر سیاہی پھیر دی تھی۔

احمد نے اس بار قدیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" قدیا! قدیا! تم میرے گھوڑے کی خرجین سے کھانے کی چیزیں نکال کر طبرق کے قریب لگا دو۔ اتنی دیر تک میں دونوں گھوڑوں کو خوراک کے توبرے لگاتا ہوں۔"

احمد نے جلدی جلدی خوراک کے توبرے دونوں گھوڑوں کے منہ سے باندھ دیئے۔ اتنی دیر تک قدیا نے کھانے کی چیزیں اور پانی کا مشکیزہ پتھریلی زمین پر رکھ دیا تھا۔ احمد نے قدیا اور طبرق کے ساتھ کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر وہاں ستا کر اس نے گھوڑوں کو چارہ کھانے کا موقع دیا پھر وہ تینوں رات کے پردے میں سفناری شہر کی طرف کوچ کر گئے تھے۔



احمد جان بوجھ کر ایسی درمیانہ روی سے سفر کرتا رہا کہ اگلے روز وہ اس وقت سفناری شہر میں داخل ہوا۔ جب سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ اس بوڑھے وینیسی ہالپس کی سرائے میں داخل ہوا تھا جہاں وہ ایک رات اس وقت بھی قیام کر چکا تھا جب کریٹ میں وارد ہوا تھا۔

سرائے میں داخل ہونے کے بعد قدیا اور طبرق کے ساتھ وہ سیدھا اصطبل کی طرف گیا اور پہلے دونوں گھوڑوں کے چارے کا بندوبست کیا۔ پھر اس نے قدیا کو طبرق کے پاس اصطبل میں ہی چھوڑ کر خود وہ سرائے کے مالک کی طرف گیا۔ وہ اس وقت اپنے دو گاہکوں سے محوِ گفتگو تھا۔ احمد کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔" آؤ! آؤ! میں تمہیں سرائے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔"

بوڑھے ہالپس کو بے تکلفانہ انداز میں گفتگو کرتے دیکھ کر پہلے سے باتوں میں

ن دونوں شخص وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ احمد اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

ہالپس نے اس بار اس سے رازداری برتتے ہوئے مدھم اور خفیہ سے لہجے میں
ب کیا تم اپنے مقصد میں کامیاب لوٹتے ہو۔ کیا تم اپنے دشمن سے انتقام لے چکے ہو۔"
نے اپنا چہرہ اس سے قریب لاتے ہوئے کہا۔" میں اپنے دشمنوں سے نمٹ چکا ہوں
اب واپس لوٹ رہا ہوں۔ تم یہ بتاؤ یہاں سے کوئی ایسا جہاز کب روانہ ہوگا جو افریقہ
ساحل کی طرف روانہ ہونے والا ہو۔"

ہالپس نے سوچتے ہوئے کہا۔" تم بہت خوش قسمت ہو۔ کل ہی ایک چھوٹا
جہاز اس سمت روانہ ہوں گے۔ کل اندھیرے منہ یہاں سے ایک جہاز روانہ ہوگا جو
بدھا قرطاجنہ کی بندرگاہ تک جائے گا۔ اگر تم صبح سویرے اندھیرے منہ کوچ نہ کر سکو
یک جہاز دوپہر کے وقت یہاں سے روانہ ہوگا لیکن وہ مالٹا تک جائے گا۔ وہاں مالٹا
ا افریقہ جانے والے جہاز کثرت سے مل جاتے ہیں۔ اگر تم اس پر بھی روانہ نہ ہونا
ہو تو کل شام کو ایک جہاز اور روانہ ہوگا جو خلیج مسینا کی بندرگاہ کی طرف جاتا ہے
وہاں سے افریقہ کی طرف روانہ ہوتا ہے۔"

احمد نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔" میرے لیے وہی جہاز مناسب
ہے گا جو کل اندھیرے منہ یہاں سے روانہ ہوگا۔ تم فکر نہ کرو، میں بڑا شب خیز ہوں
ے اندھیرے ہی اندھیرے روانہ ہونے والے اس جہاز کو پکڑنے میں کوئی دقت نہ ہوگی
رات بھر آرام کرنے کے تم میرے لیے ایک اچھے اور صاف ستھرے کمرے کا بندوبست
ر دو۔"

ہالپس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔" کیا تم اکیلے ہی ہو؟
لی بار جب تم میری سرائے میں آئے تھے تو تمہارے ساتھ ایک بوڑھا یونانی بھی تھا
م اسے کہیں چھوڑ کر جا رہے ہو؟"

احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔" نہیں وہ میرے ساتھ ہی ہے اور اصطبل میں
ے گھوڑوں کے پاس کھڑا ہے۔ تم ہمارا ایک کام اور کرو۔ ہمارے گھوڑے رکھو۔ نے

کا بھی انتظام کر دو۔"

ہالپس نے معنی خیز نگاہوں سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" اگر یہ گھوڑے ہیں جو تم نے یہاں سے خریدے تھے تو ان کی اصل قیمت میں سے ایک تہا ہنہا کر دو تو میں دونوں گھوڑے خود لے لوں گا اور بعد میں انہیں بیچ دوں گا ہم ہی ہو عجلت میں سفر کرنے والے مسافر اکثر بے قیمت ہی میرے پاس اپنے گھوڑے جاتے ہیں۔ تم چونکہ اجنبی ہو اور راستے میں تمہیں رقم کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے تمہارے ساتھ رعایت برت رہا ہوں۔"

احمد نے غور سے ہالپس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے ہی ہو کہ نے یہ دونوں گھوڑے کتنے کے خریدے تھے۔"

ہالپس نے فوراً اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں مجھے علم ہے"

احمد نے کہا تو پھر اس میں سے ایک تہائی کے علاوہ میرے سرائے کے قیام کی رقم کاٹ لو اور بقیہ میرے حوالے کر دو۔"

ہالپس نے لوہے کے ایک صندوقچے سے ایک تھیلی نکالی۔ اس میں سے گن کر سنہری سکے نکالے اور احمد کو تھما دیئے۔

احمد نے وہ سکے اپنی تھیلی میں ڈال لیے اور دوبارہ ہالپس کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "کیا تمہاری سرائے میں دو ایسے جوان ٹھہرے ہوئے ہیں جن کے طیفور اور کمنیز ہوں۔"

ہالپس نے فوراً کہہ دیا۔ "ہاں، یہ دونوں جوان میری سرائے میں ہیں اور نیچے والی دائیں قطار کے کمروں میں سے شمال کی طرف سے وہ تیسرے کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کیا وہ تمہارے جاننے والے ہیں اور تم ان سے ملنا چاہتے ہو۔ تو اپنا آدمی بھیج دونوں کو یہیں بلا لوں لیکن اکثر و بیشتر یہ دونوں جوان سرائے سے باہر ہی وقت گزارتے ہیں۔ وہ دونوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی کو تلاش کر رہے ہوں

احمد نے فوراً اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں میں ان دونوں کو

جانتا بلکہ میرے ساتھ جو بوڑھا یونانی ہے اس کے وہ جاننے والے ہیں اور وہی دونوں سے ملنا چاہتا ہے۔ ان دونوں کو یہاں بلانے کی ضرورت نہیں۔ اب جب نے ان دونوں کا کمرہ بتا دیا ہے تو میرا یونانی ساتھی انہیں ان کے کمرے میں ہی جا کر لے گا۔ تم اپنا کوئی آدمی میرے ساتھ بھیجو جو مجھے میرا کمرہ بتا دے۔"

ہالپس نے اپنے ایک خادم کو آواز دے کر احمد کے ساتھ روانہ کر دیا جب خادم نے احمد کو اس کا کمرہ دکھا دیا تو احمد دوبارہ اصطبل میں آیا اور وہاں کھڑے پاس اس نے کہا۔ "قدیما! قدیما! میں نے کمرہ حاصل کر لیا ہے اور یہ دونوں رے بھی بیچ ڈالے ہیں۔ ان سے اپنے بستر کھول لو اور سامان کی خرجینیں اتار لو۔"

قدیما دونوں گھوڑوں کی زینوں سے سامان اتارنے لگا۔ احمد نے اپنا خنجر ل کو طبرق کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں اپنی زبان بند رکھنا۔ اگر ایک بھی نامناسب ظ تمہاری زبان سے نکلا تو قسم اپنے اس رب کی جو تقصیر و انفعال سے ماوراء ہے آنکھوں کی طرح تمہاری زبان کاٹ کر تمہیں گویائی سے بھی محروم کر دوں گا۔"

طبرق کے چہرے پر کسی منقطع خواب جیسی ویرانی اور محروم بہار خشک پودے ی افسردگی بکھر گئی تھی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے کوئی گزند نہ پہنچانا، اپنی زبان بند رکھوں گا۔ کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ اس وقت ہم کہاں ہیں؟"

احمد نے پھر سخت لہجے میں غراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس کے متعلق جاننے قطعاً ضرورت نہیں کہ تم اس وقت کہاں ہو، خاموشی سے ہمارا ساتھ دیتے رہو۔"

طبرق خاموش رہا۔ احمد دونوں کو لے کر سرائے کے کمرے میں آیا۔ پہلے تینوں ل کر کھانا کھایا پھر احمد قدیما کو کمرے کے ایک کونے میں لے گیا اور اس کے کان میں گوشی کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"قدیما! قدیما! میں نے سرائے کے مالک سے پتہ کیا ہے۔ طبرق کے آخری نوں ساتھی اسی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ سنو! مجھے غور سے سنو! قدیما! اس رائے میں یا ان کے کمرے کے اندر ان سے نمٹنا ہمارے لیے کئی خطرات کھڑے کر

دے گا اور ہمارے پکڑے جانے کا اندیشہ ہے۔ اب رات ہو گئی ہے اور باہر اندھیرا گہرا ہو گیا ہے۔ میں ان دونوں کو چکر دے کر باہر لے جاؤں گا اور رات کی تاریکی میں سمندر کے کنارے لے جا کر ان کا خاتمہ کر دوں گا۔ تم یہیں رہ کر طبرق کا خیال رکھنا اس پر کڑی نگاہ رکھنا اور کمرے کا دروازہ بند رکھنا۔"

قدیمانے بھی سرگوشی کرتے ہوئے کہا "تم طبرق کے متعلق کوئی فکر نہ کرو میں اسے سنبھال لوں گا۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ وہ دو ہیں اور تم اکیلے کسی طریقے سے انہیں ٹھکانے لگا کر جلدی لوٹ آنا۔"

احمد نے اپنے آپ کو مسلح کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ قدیمانے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

احمد اس کمرے کے دروازے پر آیا جس کی نشاندہی سرائے کے مالک ہابیل نے اس سے کی تھی۔ ایک بار اس نے اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے آپ کا جائزہ لیا پھر اس نے دروازے پر ہلکی اور رازدارانہ سی دستک دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک جوان نے دروازہ کھولا اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا "کہیں تم نے غلطی سے اس دروازے پر دستک تو نہیں دے دی"۔

احمد نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "اگر اس کمرے میں طیفور اور کمنیز نام کے دو جوان رہتے ہیں تو پھر میری دستک غلط نہیں"۔

اتنی دیر میں ایک اور جوان دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ دروازہ کھولنے والے نے حیرت و استعجاب سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرا ہی نام طیفور ہے اور یہ میرا ساتھی کمنیز ہے۔ کہو تمہیں ہم سے کیا کہنا ہے"؟

احمد نے لجاجت سے کہا "کیا تم مجھے کمرے میں داخل ہونے کو نہ کہو گے۔ میں تم دونوں کو طبرق کے متعلق کچھ کہنے آیا ہوں۔"

طیفور نے دروازہ پورا کھول دیا اور ایک طرف ہٹتے ہوئے اس نے خوش طبعی سے کہا "اگر تم طبرق کی طرف سے آئے ہو تو اندر آ جاؤ۔" احمد کمرے کے اندر داخل

ہوا اور اپنے پیچھے اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "میں طبرق کی طرف سے نہیں آیا بلکہ طبرق بھی میرے ساتھ ہے"۔

اس بار کمنیز نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اگر طبرق بھی تمہارے ساتھ ہے تو پھر وہ کہاں ہے"۔

احمد نے کھڑے ہی کھڑے کہا۔ میں طبرق کے متعلق ہی تمہارے لیے ایک تکلیف دہ خبر لے کر آیا ہوں۔ سنو! میرے ساتھیو! سنو! ایک جوان اچانک قرطاجنہ سے کریٹ میں داخل ہوا۔ اس کا نام احمد ہے اور وہ اس امین کا منسوب ہے جسے طبرق لے کر آیا تھا اور جسے اب تم سب لوگ تلاش کر رہے ہو۔ سنو! میرے عزیزو! میرا نام سمرون ہے۔ مجھے طبرق کے بھائی نے قرطاجنہ سے یہاں طبرق کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ امین کو واپس کر دیا جائے کیوں کہ طبرق کی غیر موجودگی میں احمد نام کے جوان نے طبرق کی بہن کو اس کے گھر سے اٹھا لیا تھا اور یہ شرط پیش کی تھی کہ اپنی بہن لے جاؤ اور امین کو لوٹا جاؤ"۔

میں یہ پیغام دینے جب یہاں کریٹ میں آیا تو مجھے تکلیف دہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے یہاں آنے سے قبل ہی احمد نام کا وہ جوان کریٹ پہنچ چکا تھا۔ اس نے حلیم شہر میں یونانی کمان گر سے تم سب کے متعلق ساری معلومات حاصل کر لیں۔ اس نے یہ بھی جان لیا تھا کہ طبرق اور اس کے ساتھی کہاں کہاں ہیں۔ لہٰذا وہ حرکت میں آیا۔

پہلے اس نے حلیم شہر میں تمہارے دو ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اس کے بعد وہ کندتاس شہر میں داخل ہوا وہاں اس نے لمحان یہودی کے ہاں قیام کیا اور ایک رات اس نے طبرق کی حویلی پر شب خون مارا۔ اس نے ان دونوں جوانوں کو قتل کر دیا جو وہاں طبرق کے محافظ تھے۔ پھر وہ طبرق کو اس کی حویلی سے اٹھا کر لے گیا اور لمحان یہودی کے گھر جا کر اس نے طبرق کی آنکھوں میں لوہے کی سلاخیں گرم کر کے پھیر دیں اور اسے اندھا کر دیا۔ اس نے طبرق کو لمحان یہودی کے گھر پر ہی چھوڑا اور خود وہ طوفانی انداز

میں بالخورہ شہر کی طرف چلا گیا جہاں یوآسن اور تولو ٹھہرے ہوئے تھے۔"

طیفور نے فوراً درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرے ہوئے تھے سے تمہارا کیا مطلب، کیا وہ دونوں اب وہاں نہیں ہیں۔"

احمد نے اسے ملامت کرنے کے انداز میں کہا۔ "پہلے مجھے پوری طرح سن لو پھر بعد میں سوال کرنا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا وہ احمد نام کا جوان بالخورہ کی طرف بڑھا میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ میں چاہتا تھا کسی طرح یوآسن اور تولو کی جان بچائی جائے، لیکن وہ ہماری امیدوں سے کہیں زیادہ خوفناک ثابت ہوا۔

جس وقت وہ بالخورہ شہر میں داخل ہوا یوآسن اور تولو بندرگاہ کی طرف گئے ہوئے تھے۔ اس نے سرائے سے ان کا پتہ کیا اور بندرگاہ کی طرف چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہاں اس نے یوآسن اور تولو کو جا لیا اور ان دونوں پر حملہ کر دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر یوآسن اور تولو کی پوری مدد کی لیکن وہ ہم تینوں پر بھاری ثابت ہوا اس نے یوآسن اور تولو کو قتل کر دیا۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا اور سیدھا کندناس گیا وہاں سے میں نے طبرق کو ساتھ لیا اور ادھر چلا آیا۔

احمد کا بھی یہی ارادہ تھا وہ بھی یوآسن اور تولو سے نبٹ کر اور کندناس سے اندھے طبرق کو لے کر سفناری کی طرف ہی آنا چاہتا تھا۔ میں آج ہی طبرق کو لے کر یہاں پہنچا ہوں۔ احمد بھی آج یا کل یہاں پہنچنے والا ہے اور پھر یوآسن اور تولو کی طرح تم دونوں کی گردنیں بھی کاٹ دے گا۔

میں طبرق کو سمندر کے کنارے ایک محفوظ جگہ بٹھا آیا ہوں اور اس نے مجھے تم دونوں کو بلانے بھیجا ہے۔ وہ شہر کی کسی سرائے میں قیام نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس طرح احمد پھر ہم پر حملہ آور ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔ طبرق چاہتا ہے، یہ رات سمندر کے کنارے کھلی فضاؤں میں بسر کی جائے۔ گو سردی ہے لیکن ہمارے پاس سردی کا انتظام ہے۔ اس نے تم دونوں کو بھی وہیں بلایا ہے۔ اندھیرے ہی اندھیرے کل صبح یہاں سے ایک جہاز قرطاجنہ کی طرف روانہ ہو گا۔ طبرق تم دونوں کے ساتھ اس

جہاز سے قرطاجنہ کی طرف روانہ ہونا چاہتا ہے۔ وہ اندھا ہے اور نہایت بے بس ہو گیا ہے۔

طیفور نے طنز کرتے ہوئے احمد سے کہا۔ "تم باتیں تو بہت کرتے ہو لیکن تم سے یہ نہ ہو سکا کہ تم یوآسن اور تولو کے ساتھ مل کر اس احمد کا خاتمہ کر دیتے۔ یوآسن اور تولو کی موت کے بعد بھاگ جانے سے بہتر تھا تم اس سے جنگ کرتے یا اس پر غالب آتے یا یوآسن اور تولو کی طرح مارے جاتے۔"

احمد نے سخت آواز میں کہا۔ "اس پر غالب آجانے کا خیال خام ہے۔ میں گو تم دونوں سے ایک ساتھ مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہوں اس کے باوجود اس احمد کے سامنے میں ٹھہر نہ سکا تھا۔"

طیفور نے غصے کی حالت میں پوچھا۔ "تم نے یہ اندازہ کیونکر لگا لیا کہ تم ہم دونوں سے مقابلہ کرنے کی سکت رکھتے ہو۔ یاد رکھو تمہیں اب ایسا ثابت کرنا ہو گا۔ ورنہ میں طبرق سے بات کر کے تمہاری گردن کاٹ دوں گا۔"

احمد نے بھی غصے کی حالت میں کہا۔ "پہلے طبرق کے پاس چلو اس کے بعد میں تم پر یہ بھی ثابت کر دوں گا کہ میں تم دونوں پر بھاری ہوں۔"

طیفور کا چہرہ غصے میں آگ ہو گیا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور کمنیر کے ساتھ اپنا سامان سمیٹ کر وہ احمد کے ساتھ ہو لیے تھے۔

تینوں اصطبل میں آئے۔ طیفور اور کمنیر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ احمد نے گو اپنا گھوڑا سرائے کے مالک ہاپس کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا پھر بھی اس نے اپنے گھوڑے پر زین ڈالی اور ان دونوں کے ساتھ ہو لیا تھا۔

شہر سے نکل کر وہ تینوں سمندر کے کنارے آئے اور شمال کی طرف اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑانے لگے۔ احمد آگے آگے، طیفور اور کمنیر اس کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ شہر سے تقریباً دو میل دور سمندر کے کنارے ایک ویران جگہ احمد نے اپنے گھوڑے کو روک لیا اور اپنی تلوار ڈھال سنبھال کر وہ مستعد ہو گیا تھا۔

طیفور اپنا گھوڑا اس کے قریب اور غصیلی آواز میں اس نے کہا۔ "یہاں کیوں رک گئے ہو۔ چلو کہاں ہے طبرق؟"

احمد نے اپنی تلوار لہراتے ہوئے کہا۔ میرا اور تم دونوں کا فیصلہ سمندر کے کنارے ہی ویران جگہ ہوگا۔ یہاں میں تم دونوں پر ثابت کروں گا کہ کیسے میں تم دونوں پر بھاری ہوں

طیفور نے اور زیادہ سختی سے کہا۔ "احمقوں والی باتیں نہ کرو۔ پہلے طبرق کے پاس چلو اس کے بعد ہمارا تمہارا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔"

احمد نے غیر مغلوب اور غیر مفتوح آواز میں کہا۔ "غلیظ انسانو! میرا نام سمرون نہیں میں احمد ہوں اور ان ویرانوں میں تم دونوں کو میں شکم گرسنہ اور تشنہ جگر کر کے مار دوں گا۔ تم دونوں آگ کے پھول ہو اور اس سمندر میں ڈبو کر تمہیں میں بجھا دوں گا۔

طیفور نے دانت پیستے ہوئے غصے میں کہا۔ "بے ایمان، جھوٹا، فریبی، مکار، بے وفا حیلہ گر تو بھول رہا ہے۔ تو بوآسن اور تولو پر ہی غالب آگیا تھا۔ میں اور کمنیز دونوں مل کر تیری شخصیت کا الاؤ اور تیرے نفس کی حرارت کو بجھا دیں گے۔"

احمد نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے ہی ہو کہاں قرطاجنہ اور کہاں کریٹ میں اگر کوہستانوں کا جگر شق کر کے اور سمندر کا سینہ چیر کر طبرق اور اس کے چھ ساتھیوں سے نبٹ سکتا ہوں تو اے دریدہ دہن وحشیو! میں تم جیسے اغیار کے جور اور غم کی یلغار سے کیونکر خوفزدہ ہو سکتا ہوں۔ سنو! سنو! اس سیاہ گوشۂ شب میں تم دونوں کے اندر سبی افعال شنیعہ کی میل اور سرور انگیز شرابوں کی ساری تحریص میں دھو ڈالوں گا۔ آگے بڑھ کر مجھ پر حملہ کرو تاکہ میں تمہارے اخلاقی زوال، نفس کی بھوک، گندے رنگ و روغن اور جوئے قلب کا سدِباب کروں۔

حرص و ستم کے بندو! حریصِ بشریت کے ہوس خیز نگار خانو! آگے بڑھ کر مجھ پر حملہ کرو کہ میں تم دونوں کو کسی کاروان کی بے نشان راہوں کا غبار بنا کر اڑا دوں۔ آگے بڑھ کر اپنی شجاعت و خصائلِ انسانیت کا اظہار کرو اور میری ریاضت و ہنر کا امتحان لو۔"

طیفور اور کمنیز دونوں نے اپنی تلواریں کھینچ لی تھیں اور دائیں بائیں سے احمد پر حملہ آور ہونے کے لیے وہ آگے بڑھے تھے۔

اچانک احمد نے چلا کر پکارا یَغْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ساتھ ہی اس

نے اپنے گھوڑے کو ایک سخت ایڑ لگائی اور دوبارہ اپنا وہی نعرہ مارتا ہوا وہ کمنیز پر حملہ آور ہوا۔ کمنیز نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور قبل اس کے طیفور اس کی مدد پہنچتا احمد کی تلوار کمنیز کو شانے سے ران تک کاٹتی چلی گئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں کمنیز کی کرب انگیز چیخ بلند ہوئی اور ڈوب گئی۔ وہ اپنے گھوڑے سے گر کر دم توڑ گیا تھا۔

احمد اپنے گھوڑے کو پیچھے ہٹا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کمنیز کی مدد کو تیزی سے آگے بڑھتا ہوا طیفور بھی رک گیا تھا۔

احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پھر کہا۔ "طیفور! تمہارا ساتھی تو گیا، اب تمہاری باری ہے۔ یاد رکھو تم بھاگنا چاہو تو بھی بھاگ نہ سکو گے کہ میرے ترکش میں زہریلے تیر ہیں کمان میرے گھوڑے کی زین سے لٹک رہی ہے اور میرا نشانہ بے خطا ہے۔ تمہیں میری تلوار کی پیاس بجھانا ہوگی۔ سنو! جب میں اپنی دال سے بے پرواہ ہو کر تم پر حملہ آور ہوں گا تو تم اپنی نوائے پریشان اور صدائے بے ہنگم میں پکارتے پھرو گے لَيْتَ يَعُوْدُ الشَّبَابُ (کاش جوانی لوٹ آئے) لیکن اس وقت تک میں تمہارے ذوقِ جاہ و حشم کو خاک میں ملا دینے کا عزم کر چکا ہوں گا۔ سنبھلو طیفور! میں تم پر حملہ آور ہوتا ہوں اور تمہارے مزاج کو مستقیم کرتا ہوں۔

طیفور سنبھل گیا اور اپنی تلوار اپنے سامنے کر کے لہرانے لگا تھا۔ احمد نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اپنی ڈھال اپنے سامنے اور خون آلود تلوار فضا میں بلند کرتے ہوئے اس نے گھوڑے کو پھر مہمیز لگائی ساتھ ہی اس نے تکبیر بلند کرتے ہوئے زور سے اللہ اکبر پکارا۔

طیفور نے احمد کا وار اپنی تلوار پر روکا لیکن اسی لمحہ احمد کی ڈھال اس کے منہ پر پوری قوت سے پڑی۔ طیفور لڑکھڑا کر گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ احمد نے بھی نیچے چھلانگ لگائی اور طیفور کے جسم کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اندھی اندھیری فضاؤں میں ایک بار پھر کربناک چیخ بلند ہوئی اور سمندر کی شور کرتی موجوں میں ڈوب کر رہ گئی۔

احمد نے دونوں لاشوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ ہراساں کھڑے دونوں گھوڑوں کو اس نے مار کر بھگا دیا۔ پھر وہ اپنے گھوڑے پہ سوار ہوا اور اسے ایڑ لگا کر شہر کی طرف سرپٹ دوڑا رہا تھا۔

احمد پھر سرائے میں داخل ہوا۔ گھوڑا اس نے اصطبل میں باندھ کر اس کی زین اُتاری اور خود سرائے کے اندر چلا گیا۔ جب وہ اپنے کمرے کے سامنے آیا تو اس نے دروازہ اندر دبا کر دیکھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ دروازے پر اس نے ہلکی سی دستک دی۔ جس کے جواب میں اندر سے بوڑھے قدیما کی آواز سنائی دی "کون ہے؟"

احمد نے مدھم آواز میں جواب دیتے ہوئے کہا "قدیما! قدیما! دروازہ کھولو۔ میں احمد ہوں۔"

قدیما نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ احمد اندر داخل ہوا۔ دروازہ اس نے خود پہلے کی طرح اندر سے بند کر دیا۔ جب وہ آگے بڑھنے لگا تو قدیما نے پوچھا جس مہم پر گئے تھے اس کا کیا کر آئے ہو۔"

احمد نے اپنے بستر پہ لحاف اوڑھے اور خاموش بیٹھے طرق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں انہیں یہاں سے سیدھا شمال کی جانب سمندر کے کنارے لے گیا تھا۔ وہاں میں نے اُن پر چھپ کر یا دھوکہ دہی سے حملہ نہیں کیا بلکہ دونوں کو آزادی سے اپنا دفاع اور جنگ کرنے کی اجازت دے کر میں دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار آیا ہوں اور ان کی لاشیں سمندر میں پھینک آیا ہوں"۔

قدیما نے تحسین آمیز لہجے میں کہا "احمد! احمد! رب لایزال کی قسم! میں نے آج تک تم جیسا جوان نہیں دیکھا۔ تمہارا حوصلہ اپار اور بے کراں اور تمہاری شجاعت لامحدود و ناپید کنار ہے۔ تم ان جوانوں میں سے ہو جو جلیل و جمیل ہیں اور دلوں کا قاتل بننے کا فن جانتے ہیں"۔

احمد صرف مسکرا کر رہ گیا۔ قدیما کی کسی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آہستہ آہستہ چلتا وہ طرق کے پاس آیا اور اپنی تلوار برہنہ کر کے اس نے اس کی ناک کے

قریب لے جاتے ہوئے کہا "طرق! طرق! میری تلوار سے لگا ہوا یہ خون سونگھو اور پہچانو کس کا ہے۔"

طرق نے سونگھا پھر تکلیف دہ احساس میں اس نے کہا "میں نہیں جانتا تم کس پر وارد ہوئے ہو۔ حالات نے مجھے تمہارے سامنے بے بس اور مجبور کر دیا ہے۔ ورنہ میں کسی کے سامنے یوں جھکنے اور مات تسلیم کرنے والا نہ تھا۔"

احمد نے اپنی تلوار نیام میں کرتے ہوئے کہا "میں نے تمہارے دو آخری ساتھی طیفور اور کمیز کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اب تم سکون کی نیند سو جاؤ۔ تمہیں کسی کے متعلق فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا فیصلہ اب امین ہی کرے گی۔ سو جاؤ کہ رات گہری ہو چکی ہے اور صبح سویرے تمہیں جاگنا بھی ہو گا کہ ہم یہاں سے کوچ کریں گے۔"

طرق لیٹ گیا اور اپنے آپ کو اس نے لحاف میں چھپا لیا تھا۔ احمد نے بھی اپنا جنگی لباس بدل لیا تھا پھر وہ بھی اپنے بستر میں گھس گیا تھا۔ تینوں نے وہ رات بوڑھے ڈینسی ہالپس کی سرائے میں بسر کی اور اگلے روز منہ اندھیرے ہی اندھیرے روانہ ہونے والے جہاز سے وہ قرطاجنہ کی طرف کوچ کر گئے تھے۔



سائرِ آفاق سورج ظلمات کی دنیا میں لعلِ بدخشاں کی طرح غروب ہو رہا تھا۔ جہاز سے اُتر کر احمد اور قدیا اپنا سامان اُٹھائے قرطاجنہ شہر میں داخل ہوئے تھے۔ سردی کے باعث دونوں نے اپنے آپ کو موٹے اُونی کمبلوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک چوک پر آکر احمد جب طبرق کا ہاتھ تھامے شہر کے مشرقی حصّے کی طرف مڑا تو قدیا نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"احمد! احمد! اِدھر کہاں جا رہے ہو۔ سیدھا آگے چلو جس طرف تم مڑے ہو یہ راستہ ہمارے گھر تو نہیں جاتا۔ ہمیں فوراً گھر پہنچنا چاہیے۔ میرا دل کہتا ہے امین یہیں میرے گھر میں ہی ہو گی اور بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔

احمد نے مُڑ کر قدیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مَیں سب راستے جانتا ہوں۔ تم میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور دیکھو مَیں کیا کرتا ہوں"۔ قدیا خاموشی سے احمد کے پیچھے ہو لیا تھا۔

مشرق کی طرف آگے بڑھتے ہوئے احمد سیدھا طبرق کی حویلی میں داخل ہوا۔ قدیا نے پریشان آواز میں پوچھا "یہاں اب کیا کرو گے"۔ احمد نے لاپروائی سے کہا "واپس جانے کے لیے یہاں سے گھوڑا حاصل کروں گا۔ اس کے علاوہ طبرق کے بڑے بھائی سے بھی مجھے کچھ کہنا ہے"۔

قدیا خاموش رہا۔ احمد سیدھا حویلی کے اصطبل میں گیا۔ اپنا سامان اس نے زمین پر رکھا۔ طبرق کو ایک طرف کھڑا کیا اور وہاں کھڑے گھوڑوں کو چند ثانیوں تک غور سے دیکھنے کے بعد وہ ایک گھوڑے پر زین ڈالنے لگا تھا۔ قدیا بھی اپنا سامان رکھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ شہر کے کسی دور افتادہ کونے میں مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

اتنے میں حویلی کا ایک خادم بھاگتا ہوا اصطبل کی طرف آیا اور احمد کے ساتھ طبرق کو دیکھ کر وہ حیرت و پریشانی میں چونک سا گیا تھا۔ احمد نے اسے پکارتے ہوئے کہا "واپس جاؤ اور طبرق کے بڑے بھائی کو باہر بھیجو۔ اسے کہو امین کا احمد کریٹ سے طبرق کو لے کر آیا ہے اور تمہیں باہر بلاتا ہے"۔

وہ خادم بھاگتا ہوا واپس چلا گیا تھا۔ احمد اب گھوڑے کا تنگ کس چکا تھا۔ لہٰذا وہ سیدھا کھڑا ہوا اور اس گھوڑے کی گردن پر اپنا بازو رکھ کر انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد طبرق کا بھائی حویلی سے نکلا۔ وہ غیر مسلح تھا۔ شاید اس بار وہ احمد سے ٹکراؤ نہ چاہتا تھا۔ جب وہ نزدیک آیا تو احمد نے اسے مخاطب کرتے ہوئے طبرق کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "کیا تم اسے جانتے ہو"۔

اس نے مدھم اور بوسیدہ سی آواز میں کہا "ہاں یہ میرا چھوٹا بھائی طبرق ہے"۔ احمد نے اس سے نزدیک ہوتے ہوئے کہا "کیا یہ وہی ہے جس کے متعلق تم نے مجھے کہا تھا۔ "اے اجنبی! طبرق تم سے مات نہ کھائے گا کہ وہ خوب توانا اور طاقتور ہے اور اس کے ساتھ اس کے چند جان نثار بھی ہیں"۔

اس نے دُکھ سے کہا "ہاں یہ وہی طبرق ہے"۔ احمد نے غصیلی آواز میں کہا "تو پھر سنو! مَیں نے اس کے سارے جان نثاروں کا خاتمہ کر دیا ہے اور اس کی

آنکھوں میں گرم سلاخیں پھیر کر میں نے اسے اندھا کر دیا ہے۔ اس لیے کہ ایمن کے ساتھ بھی اس نے ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ سنو! میں تمہارا ایک گھوڑا لے جا رہا ہوں۔ اور طبرق بھی میرے ساتھ ہو گا۔ میں ایمن کو تلاش کروں گا اور وہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔"

طبرق کے بھائی نے دکھ سے پوچھا "میری بہن کہاں ہے؟" احمد نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تم سے ایمن کا پتہ پوچھا تھا لیکن تم نے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا۔ اب تم مجھ سے یہ امید کیونکر رکھتے ہو کہ میں تمہیں بتاؤں کہ وہ کہاں ہے۔ میں تمہیں پہلے ہی کہہ چکا ہوں ایمن اگر مجھے مل گئی تو وہ لوٹ آئے گی ورنہ میں اپنی مرضی سے اسے کسی کے ساتھ بیاہ دوں گا۔"

طبرق کا بھائی خاموش رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ احمد نے گھوڑے کو دہانہ چڑھایا۔ پہلے طبرق اور قدیما کو اس پر بٹھایا پھر وہ خود بھی سوار ہوا اور حویلی سے باہر نکل گیا تھا۔

زرگروں کے بازاروں گزرتے ہوئے احمد نے اپنے گھوڑے کو اچانک روک لیا تھا۔ اس نے دیکھا قدیما کے دونوں بیٹے اپنی دکان بند کر کے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ احمد اور قدیما نیچے اتر گئے۔ طبرق کو انہوں نے گھوڑے کے اوپر ہی بیٹھا رہنے دیا۔ قدیما کے دونوں بیٹوں نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ بھاگ کر ادھر آئے اور باری باری دونوں سے مصافحہ کرنے لگے تھے۔

قدیما نے پر تجسس نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "میرے بچو! کیا تمہاری بہن ایمن گھر پہنچ گئی ہے۔"

قدیما کے بڑے لڑکے نے مایوسی میں کہا "وہ تو ہمارے ہاں نہیں آئی۔ آپ دونوں اس کی تلاش میں گئے تھے کیا وہ آپ کو نہیں ملی؟"

احمد کی طرف دیکھتے ہوئے قدیما نے اس کی ڈھارس بندھانے کی خاطر کہا "شاید وہ سیدھی اپنے گھر چلی گئی ہو۔"

احمد نے تکلیف دہ احساس میں کہا "بہت مشکل ہے۔ اندھا ہو جانے کے بعد وہ وہاں اکیلی کیسے اور کیونکر رہ سکتی ہے۔"

قدیما کے بڑے بیٹے نے پھر کہا "ہم وہاں بھی چکر لگاتے رہے ہیں وہ وہاں بھی نہیں۔ میں آج بھی ادھر گیا تھا۔ مکان کو اسی طرح باہر سے قفل لگا ہوا ہے۔ جواب زنگ آلود ہو گیا ہے۔ بابا! یہ جوان جو گھوڑے پر بیٹھا ہے کیا یہ طبرق نہیں ہے۔ قدیما نے دکھ میں کہا۔ ہاں بیٹے یہ طبرق ہی ہے۔ اس نے ایمن کو شادی سے انکار کرنے پر آنکھوں کی بینائی سے محروم کر دیا تھا لیکن وہ بچاری اپنی عزت بچا کر ایک بوڑھے یہودی کی مدد سے اس کے چنگل سے بھاگ گئی تھی۔ اب وہ مل ہی نہیں رہی کہاں گئی ہے۔ احمد نے طبرق کے ساتھیوں کو ختم کر کے اسے بھی اندھا کر دیا ہے۔"

قدیما نے اس بار احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چلو بیٹے گھر چلیں۔"

احمد نے مایوسی اور کرب میں کہا "میں اب قرطاجنہ شہر میں ٹھہر کر کیا کروں گا۔ میں اب جاتا ہوں۔ طبرق کو اپنے عزیزوں کے ہاں چھوڑ کر میں ایک نئے ولولے کے ساتھ ایمن کی تلاش کروں گا۔ اس کی تلاش میں ان صحراؤں کا میں ٹیلہ ٹیلہ چھان ماروں گا۔ مجھے اب اجازت دیں میں جاتا ہوں۔"

قدیما خاموش رہا۔ احمد نے باری باری تینوں سے مصافحہ کیا پھر وہ طبرق کے پیچھے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔



سورج مغرب کی گہری، اتھاہ اور بے پایاں گرد آلود فضاؤں میں کھو گیا تھا۔ صحرا جو تخم ریزی اور نقش پا سے خالی رہتا ہے، اس چرواہے کی طرح خاموش اور پرسکون تھا جو سخت گرمی میں کسی پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں کیلے کے پتوں پہ گہری نیند سو گیا ہو۔ سورج غروب ہوتے ہوتے کسی نقش گر کی طرح آسمان کے حاشیوں پر شفق کے نقش و نگار اور قوس و قزح کے رنگوں جیسے خاکے بناتے چلا گیا تھا۔

قرطاجنہ شہر سے نکل کر احمد صحرا کے اندر اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا رہا تھا۔ وہ اُداس تھا اس خزاں رسیدہ بوڑھے درخت کی طرح جو صحرا میں تنہا کھڑا ہو۔ اسی وقت مشرق سے چاند طلوع ہُوا۔ روشنی کی پہلی ہی کرن نے تاریکیوں کے منفی خیالات کا راستہ روک دیا تھا اور چہار سو ویرانوں کا دل روشن ہو گیا تھا۔

احمد نے ایک بار نہایت کرب سے طلوع ہوتے چاند کو دیکھا پھر وہ اپنی بلند و پُرسوز آواز میں گا رہا تھا۔

فِی بُعدِھَا عَذَابٌ فِی قُربِھَا سَلَامَۃٌ

اس سے دوری میں عذاب اور اسکے قرب میں سلامتی ہے

احمد گاتا رہا۔ اس کے سامنے بیٹھا طرق خاموشی سے سُنتا رہا اور گھوڑا صحرا کے اندر اپنے عارضی نقشِ پا چھوڑتا ہوا سانولی مٹی کی اس بستی کی طرف بھاگ رہا تھا جس میں حسین ارتمیس رہتی تھی۔

احمد جب بستی میں داخل ہوا اور اپنے گھوڑے کی رفتار اس نے کم کر دی تو طرق نے چونک کر پوچھا "تم نے گھوڑے کی رفتار کم کر دی ہے کیا تم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہو؟" احمد جس نے بستی سے دُور ہی گانا بند کر دیا تھا۔ مدھم سی آواز میں بولا "ہاں تمہارا اندازہ درست ہے۔"

طرق نے منت کرنے کے انداز میں کہا "کیا اب تک مجھے کم سزا ملی ہے جو تم مجھے اپنے ساتھ گھسیٹ رہے ہو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو کہ میں اپنے بھائی کے پاس زندگی کے بقیہ دن گزار سکوں۔"

احمد نے غصے میں غُراتی ہوئی آواز میں کہا "میں نے تو تم سے ایمن کو اندھا کرنے کا قصاص لیا ہے۔ ابھی تمہارے کندھوں پر کسی لڑکی کو زبردستی اُٹھا لے جانے کا گناہ باقی ہے اور اس کی سزا تمہیں ایمن دے گی۔ ایمن تو مل ہی نہیں رہی، میں اسے تلاش کروں گا۔" ذرا رُک کر طرق نے پھر پوچھا "اگر وہ نہ ملی پھر۔"

احمد نے غصے اور جھلاہٹ میں کہا "تب میں تیری گردن خود کاٹ دوں گا۔"

طرق نے خوفزدہ سی آواز میں پوچھا "اس وقت تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔"

ارتمیس کا گھر آگیا تھا اور اس کے سامنے اپنے گھوڑے کو روکتے ہوئے اس نے طرق سے کہا "تجھے میں تیری بہن ثما کے پاس لایا ہوں۔"

طرق کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ احمد نے دروازے پر دستک دی۔ سورج کے نقشِ پا کی تلاش میں چاند اب کافی اُوپر آگیا تھا۔ اندھیرے لَیتَ یَعُودُ الشّبَاب (کاش جوانی لوٹ آئے) پکارتے ہوئے تحلیل ہو گئے تھے۔ چاروں طرف مصوّرِ فطرت نے حریرِ گل جیسی نرم پُرسکون چاندنی بکھیر دی تھی۔ احمد اپنے گھوڑے سے نیچے اتر کر دروازہ کھُلنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہرمن نے دروازہ کھولا۔ احمد کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ پہلے آگے بڑھ کر وہ احمد سے گلے ملا۔ پھر وہ زور زور سے پکارنے لگا۔ "ارتمیس! ارتمیس! بھاگ کر باہر آؤ۔ احمد بھائی آئے ہیں۔"

ارتمیس کسی صحرائی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی کمرے سے نکلی اور احمد کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے پوچھا "آپ آگئے؟ آپ کیسے ہیں؟" احمد نے مسکراتے ہوئے ارتمیس کی طرف دیکھا۔

احمد کے آجانے کی خوشی میں ارتمیس کے لب میگوں پر لالۂ شیراب سُرخ گلگوں چہرے پر طراوتِ شبنم اور غنچۂ گل کے گھونٹ بھرتے بھنورے جیسی سیاہ آنکھوں میں شادابی اور رونق تھی۔ احمد نے آہستگی اور تمکین سے کہا "میں ٹھیک ہوں۔"

اتنی دیر تک زیوس اور طرق کی بہن ثما بھی وہاں آگئے تھے۔ زیوس نے آگے بڑھ کر احمد کو گلے لگایا اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا "تم آگئے بیٹے! لیکن ایمن کہاں ہے؟"

احمد نے دُکھ سے کہا "وہ نہیں ملی میں نے بہت تلاش کیا۔"

زیوس نے پریشان لہجے میں کہا "وہ کہاں چلی گئی ہے اور گھوڑے پر بیٹھا یہ جوان کون ہے؟"

احمد نے ثما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”یہ ثما کا بھائی طبرق ہے۔ یہی اپنے آٹھ ساتھیوں کے ساتھ ایمن کو اُٹھا کر لے گیا تھا۔ اس نے شادی سے انکار پر ایمن کو بینائی سے محروم کر دیا تھا اور اس کے قصاص میں اس کے آٹھ ساتھیوں کو ختم کر کے میں نے اسے بھی بینائی سے محروم کر دیا ہے۔ یہ اندھی ایمن سے بھی زبردستی شادی کرنا چاہتا تھا لیکن کریٹ کا ایک بوڑھا یہودی جس کا نام لمحان ہے وہ ایمن کے کام آیا اور طبرق کے چنگل سے ایمن کو نکال کر کہیں لے گیا۔ اب خبر نہیں ایمن کہاں ہے۔ وہ قرطاجنہ بھی نہیں آئی۔ میرا دل کہتا ہے میں اسے ضرور تلاش کر لوں گا۔“

احمد رکا پھر ثما کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا ”ثما! ثما! یہ تمہارا بھائی طبرق ہے“۔ ساتھ ہی احمد نے طبرق کو گھوڑے سے نیچے اُتار کر کھڑا کر دیا تھا۔ طبرق نے بھی اپنے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ ثما! ثما! تم کہاں ہو میرے قریب آؤ“۔

ثما نے روتی ہوئی آواز میں کہا ”میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ وہ شخص جس سے کسی کی آبرو محفوظ نہیں میرا اس سے کیا تعلق۔ میرے بھائی آج تک مجھے یہی تاثر دیتے رہے ہیں کہ مُسلمان وحشی، ظالم اور بے رحم ہوتے ہیں لیکن یہاں مُسلمانوں کے اندر رہ کر مجھے علم ہوا کہ اخلاق و کردار اور عمل و فعل میں مسلمان دوسری قوموں سے بہت آگے ہیں۔ میں تسلیم کرتی ہوں انہوں نے تلوار سے نہیں اپنے کردار سے سحرِ اسرائیل، طلسمِ نصرانیت اور جادوئے زرتشت کو توڑا ہے۔ طبرق سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں کسی کی بہن نہیں میں اسلام قبول کر چکی ہوں۔ اب میں ایک مسلمان لڑکی ہوں“۔

احمد حیرت اور پریشانی میں ثما کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ثما نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”احمد! احمد! کیا آپ کو میرے اسلام قبول کرنے پر حیرت ہو رہی ہے۔ بخدا میں مُسلمان ہوں۔ نہیں بلکہ اب میں ایک کٹر مُسلمان لڑکی ہوں۔ اگر آپ کو یقین نہیں آ رہا ہے تو کوئی ایسا طریقہ کار بتایئے جس سے میں آپ کو یقین دِلا سکوں کہ بحمداللہ میں مسلمان ہوں“۔ احمد کچھ کہنے والا تھا کہ ارتمیس نے اسے پیار سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”آپ ثما کو شک کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ یہ واقعی اسلام قبول کر چکی ہے۔ اب باقاعدگی سے عبادت کرتی ہے اور روزانہ بابا سے قرآنِ مقدس کی تعلیم لیتی ہے۔ یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اب یہ واقعی کٹر مسلمان لڑکی ہے“۔

احمد کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے اپنی بے پایاں خوشی پر قابو پاتے ہوئے کہا ”ثما! ثما! میں تمہیں اسلام قبول کرنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ اب تم ایک مُسلمان لڑکی کی حیثیت سے اپنے گھر واپس جانا چاہو تو میں تمہاری راہ نہ روکوں گا“۔

ثما کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جنہیں اس نے پونچھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تھا کہ احمد نے پہلے ہی بولتے ہوئے پوچھا ”ثما! ثما! تم رو رہی ہو۔ کیا تمہیں ——

ثما نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔ آپ پریشان نہ ہوں، خدا کی قسم یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ میں خوش ہوں کہ ایک مُسلمان کی حیثیت سے میں اب آزاد ہوں لیکن میں اب گھر واپس نہ جاؤں گی۔ جہاں اس وقت میں رہ رہی ہوں اور جہاں میں نے اسلام قبول کیا ہے۔ یہی میرا گھر ہے“۔

احمد کے چہرے پر وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (جب صبح سانس لیتی ہے) جیسا سکون بکھر گیا تھا۔ اس دوران ہرمس احمد کا گھوڑا لے کر اصطبل میں باندھ آیا۔ پھر وہ سب اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں آتش دان کے اندر آگ جل رہی تھی۔ طبرق کو بھی وہ اپنے ساتھ اندر لے گئے تھے۔

پہلے آتش دان کی بھڑکتی آگ کے پاس بیٹھ کر سب نے کھانا کھایا پھر احمد انہیں کریٹ میں پیش آنے والے حالات بڑی تفصیل اور وضاحت سے سُنا رہا تھا۔

احمد جب اپنی داستان سُنا چکا تو ارتمیس فوراً اٹھی اور ساتھ والے کمرے میں جا کر وہ اپنے اور احمد کے لیے مسہریوں پر بستر لگا آئی تھی۔ جب وہ ثما کے ساتھ مل کر اوروں کے لیے اس کمرے میں بستر لگانے لگی جس میں آتش دان جل رہا تھا تو احمد نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ارتمیس! ارتمیس! میری بات سنو! ارتمیس بچاری بھاگتی ہوئی آئی اور اپنے باپ اور بھائی کے قریب احمد کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

احمد نے اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے صبح سویرے جگا دینا ارتمیس! میں اندھیرے ہی اندھیرے یہاں سے کوچ کر دوں گا۔ ارتمیس نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اس کا چہرہ ماند پڑ گیا تھا۔ احمد کے کوچ کا سن کر وہ لالہ رو لڑکی بے جان ہو کر رہ گئی تھی اور برگ زیتون کی طرح تازہ اس کے چہرے پر غم اندر غم دکھوں کے کئی آسیب نزول کر گئے تھے۔ فوری طور سے احمد سے کچھ نہ کہہ سکی تھی۔ تاہم اس کے باپ زیوس نے بڑی شفقت سے احمد کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم کل صبح ہی صبح کہاں کے لیے کوچ کر دو گے بیٹے!"

احمد نے گہری آواز میں کہا۔ "اپنے لشکر میں واپس جاؤں گا۔ مجھے اپنے لشکر سے نکلے کئی روز گزر چکے ہیں۔ امیر حسان یقیناً شہر سے باہر ہر روز کسی ٹیلے پر کھڑے ہو کر مغرب کی طرف سے میری راہ دیکھتے ہوں گے۔"

زیوس نے بڑی فراخدلی سے کہا۔ "احمد! احمد! اگر تم کہیں اور جاتے کو کہتے تو میں ضرور تمہیں رک جانے پر اصرار کرتا۔ لیکن لشکر میں واپس جاتے ہوئے میں تمہاری راہ نہ روکوں گا۔ صبح میں تمہیں خود رخصت کروں گا۔ خدا کی قسم میرے لیے تمہیں رخصت کرنا بھی ایک سعادت ہو گی کہ تم اپنے لشکر کے ساتھ مذہب و ملت کی خاطر ایک نئی جنگ کا آغاز کرو گے۔

زیوس رکا پھر اس نے ارتمیس کو مخاطب کر کے کہا۔ "ارتمیس! ارتمیس! تو خوش قسمت ہے بیٹی! کہ تو اس لشکر کے نائب امیر کی بیوی ہے۔ جس کا انتخاب قدرت اس لیے کر چکی ہے کہ وہ اس لشکر سے نیل کی وادی سے لے کر بحر محیط تک محیر العقول معجزات کا ظہور کرے۔ جاؤ بیٹی! احمد کو اپنے کمرے میں لے جاؤ اسے آرام کی ضرورت ہے اور صبح اس نے کوچ بھی کرنا ہے۔"

ارتمیس نے منہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ چپ چاپ وہ بے چاری احمد کو ساتھ والے کمرے میں لے گئی تھی۔



صبح ہونے سے تھوڑی دیر پہلے سکون کی گہری نیند سوئے ہوئے احمد نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کسی نے نہایت نرم روی سے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا تھا۔ اس نے دیکھا حسین ارتمیس اس کے پہلو میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

احمد نے لحاف ایک طرف ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ کیا صبح ہو گئی؟"

ارتمیس نے چوڑیوں کی جل ترنگ جیسی رسیلی آواز میں کہا۔ "نہیں ابھی فجر کی نماز میں تھوڑی دیر باقی ہے۔ آپ اٹھ کر وضو کر لیں۔ میں آپ کے گھوڑے پر زین ڈالنے کے علاوہ آپ کے سفر کی تیاری مکمل کر چکی ہوں۔ بابا اور تما بھی آپ کو الوداع کہنے کے لیے جاگے ہوئے ہیں۔"

احمد اٹھ کر باہر آیا اور وضو کرنے لگا۔ ارتمیس اس کا بستر درست کرنے لگی تھی۔ پھر وہ مطبخ سے احمد کے لیے تیار کیا ہوا زادِ راہ اصطبل میں کھڑے اس کے گھوڑے کی خرجین میں ڈالنے لگی تھی۔ وضو کر کے احمد جب اصطبل میں آیا تو اس نے دیکھا حسین ارتمیس اس کے گھوڑے کے پاس خانہ ماتم کی طرح اداس اور ویران کھڑی تھی۔

احمد قریب آیا اس نے دیکھا۔ ارتمیس کے چہرے کی اداسیاں اور اس کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو اس کے غمِ دل کو بے نقاب کر رہے تھے۔ اس کی حالت اس جگر سوختہ مسافر جیسی تھی جو اپنی منزل سے بہت دور دکھوں کے جال میں پھنس گیا ہو۔

احمد اور قریب آیا اور پیار سے اس نے ارتمیس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ارتمیس! ارتمیس! میں جانتا ہوں میرا یہاں سے کوچ تمہیں شاک گزرتا ہے۔ اگر جہاد جیسا مقدس فریضہ مجھے درپیش نہ ہوتا تو میں کبھی بھی تمہیں یوں چھوڑ کر نہ جاتا۔ تم ایک حدود شناس اور خود فراش بیوی ہو۔ مجھے تمہاری محبت پر فخر اور تمہاری رفاقت پر ناز ہے۔"

ایک وجدانی خود گرفتگی اور ایک دلفریب یگانگت میں حسین ارتمیس نے اپنا سر احمد کی چھاتی پر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے جنہیں اس نے پونچھتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے یہی اعتماد بہت بڑا انعام اور سہارا ہے کہ آپ میرے ہیں۔

مجھے کسی عظمت کی خواہش نہیں - میں تو آپ کے شب و روز کی اسیر ہوں - آپ ہی میری عظمت اور آپ ہی میرا فخر و سربلندی ہیں - اجنبی دیس اور انجانی راہوں میں آپ مجھے بھول نہ جائیے گا - ورنہ میں ان صحراؤں کے اندر ریشم کے کیڑے کی طرح گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔"

احمد نے ارتمیس کو اس کے شانوں سے پکڑ کر علیحدہ کرتے ہوئے کہا" ارتمیس! ارتمیس! تم فکر مند نہ ہو - ہماری چاہت کا چاند ہمیشہ چمکتا رہے گا اور تم ایک حسین موڑ کی طرح میرے ذہن میں تازہ بہ تازہ اور ایک خوش کن فرض کی طرح میرے دل میں نو بہ نو رہو گی - تمہاری رفاقت میرے دل کا سکون اور تمہاری محبت میری رُوح کی غذا ہے۔

پھر اچانک احمد نے بات کا رُخ بدلا اور ارتمیس کے شانے ہلاتے ہوئے اس نے کہا" ارتمیس! ارتمیس! میرے بعد تم ہرمس اور بابا طرق کا خیال رکھنا - وہ یہاں سے کہیں جانے نہ پائے - جہاد سے لوٹ کر میں اس کا حساب بیباق کروں گا - مجھے کچھ فراغت ہوئی تو ایک بار پھر میں ایمن کی تلاش شروع کروں گا۔"

ارتمیس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا - آپ کے لیے میرے پاس ثما کا بھی ایک پیغام ہے - وہ خود آپ سے کہتی لیکن وہ شرما رہی تھی - آپ نے ایک بار اسے کہا تھا کہ میں تمہیں اپنے چھوٹے بھائی سے بیاہ دوں گا - وہ کہہ رہی تھی میں اپنی خوشی سے آپ کے چھوٹے بھائی خصیب کے ساتھ شادی پر رضامند ہوں - جہاد سے فارغ ہو کر جب آپ گھر آئیں تو خصیب کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں - ثما کو ہم اس سے بیاہ دیں گے اور پھر ہم چاروں اکٹھے مصر کی طرف روانہ ہوں گے - میں آپ کے ماں باپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔"

احمد نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا" میں خصیب کو ضرور اپنے ساتھ لے کر آؤں گا۔"

اتنے میں صحن کے دُوسری جانب کھٹکا ہوا اور ارتمیس نے احمد کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا" شاید بابا اور ثما ادھر آ رہے ہیں - آئیے اصطبل سے نکل کر صحن میں چلتے ہیں - میں نے آپ کے گھوڑے کی خرجین میں کھانے کا سامان اور زین سے پانی کا مشکیزہ بھی کر باندھ دیا ہے ——— میری دُعائیں آپ کے ساتھ ہیں، خُدا آپ کو ہمیشہ عافیت کی سرزمین میں رکھے گا۔"

احمد نے اپنے گھوڑے کو کھولا - چارے سے بھرا ہوا توبرہ اس نے زین سے باندھ لیا اور گھوڑے کی باگ تھامے وہ ارتمیس کے ساتھ اصطبل سے صحن کی طرف چل پڑا -

بیرونی دروازے کے پاس ہی زیوس اور ثما کھڑے تھے - احمد اور ارتمیس ان کے پاس آئے - زیوس نے احمد کو گلے لگاتے ہوئے کہا" میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں بیٹے! خدا تمہارا حامی و ناصر ہو گا اور وہ ہر میدان میں تمہیں فوز مند و سرخرو رکھے گا۔"

احمد نے علیحدہ ہو کر زیوس سے مصافحہ کیا - ارتمیس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور احمد اپنے گھوڑے کی باگ تھامے گھر سے باہر گلی میں آ کھڑا ہُوا - ارتمیس، زیوس اور ثما دروازے پر کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے تھے - احمد ایک زقند کے ساتھ اپنے گھوڑے پر سوار ہُوا اور اسے ایڑ لگا دی تھی - ارتمیس نے شیون و ماتم کرتی آواز میں دھیرے سے کہا -" خدا آپ کا حافظ اور معین ہو"۔

احمد کے چلے جانے پر ارتمیس پر عجیب طرح کی وحشتِ نیم خوابی طاری تھی اور اس کی آنکھوں میں اَن گنت بے نوا پیغام تھے - بنات نیل کی طرح حسین و درخشاں چاند مرادِ یزدانی کے اتباع میں اور اپنے رب کی حاکمیتِ اعلیٰ کے سامنے جھکتا ہُوا مغرب میں غروب ہونے کو اُتر رہا تھا - آسمان کے شمالی کناروں پر سُرمئی بادلوں کے دبیز ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے - احمد جب اندھیرے میں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو تینوں گھر کا بیرونی دروازہ بند کر کے اندر چلے گئے تھے -



ایک روز جب کہ سُورج غروب ہو رہا تھا احمد برقہ شہر سے باہر خیمہ زن اپنے لشکر میں داخل ہُوا تھا - جہاں تک نگاہیں کام کرتی تھیں لشکر کے خیمے نصب تھے -

احمد کے آنے پر لشکر میں خوشی کے باعث ایک شور سا مچ گیا۔

حسان بن نعمان کے خیمے کے پاس آ کر احمد نے اپنے گھوڑے کو روکا۔ پھر وہ نیچے اُترا۔ گھوڑے کو اس نے خیمے کی طناب سے باندھ دیا اور خیمے میں داخل ہُوا۔ اندر حسان بن نعمان مغرب کی نماز کے لیے وضو کرنے کے بعد انگوچھے سے ہاتھ منہ صاف کر رہا تھا۔ احمد کو اپنے خیمے میں داخل ہوتے دیکھ کر حسان نے انگوچھا اپنے کندھے پر رکھا اور آگے بڑھ کر وہ احمد سے بغل گیر ہو گیا تھا پھر اس نے احمد کو اپنے بستر پر بٹھاتے ہوئے کہا " احمد! احمد! کہاں رہے تم! مَیں نے تو کہا تھا شادی کر کے جلدی آجانا لیکن تم نے مجھے طویل انتظار میں ڈال دیا ہے۔ خیموں سے باہر نکل کر اور ریت کے ٹیلوں پر کھڑے ہو کر مَیں ہر روز تمہاری راہ دیکھا کرتا تھا۔

دمشق سے ایک نوجوان صالح کمک لے کر پہنچ چکا ہے۔ وہ اپنے ساتھ خلیفہ عبدالملک کا ایک حکم نامہ بھی لایا ہے جس کی رُو سے ملکہ جرارہ سے فیصلہ کن جنگ کرنے کے بعد مجھے دمشق میں واپس طلب کر لیا گیا ہے۔ میری جگہ اب ان صحراؤں کا سالار کمک لے کر آنے والا جوان صالح ہو گا۔"

احمد نے پریشان لہجے میں پوچھا " آپ کو کیوں واپس بُلا لیا گیا ہے "

حسان نے لاپروائی سے کہا " ہو سکتا ہے مجھے کہیں اور فرائض سونپے جائیں یہ بھی ہو سکتا ہے افریقہ کے ان صحراؤں میں میری کارکردگی دمشق کے ایوانوں میں رہنے والوں کو پسند نہ آئی ہو۔ یا وہاں میرے حامیوں کی تعداد کم اور حاسد زیادہ ہو گئے ہوں بہرحال میری واپسی سے کوئی فرق نہیں آتا۔ تمہیں لشکر کے نائب امیر کی حیثیت سے بحال رکھا گیا ہے۔ ملکہ جرارہ سے نمٹنے کے بعد مجھے اُمید ہے تم پہلے کی طرح اپنے فرائض انجام دیتے رہو گے۔"

احمد نے دُکھ سے کہا " صحراؤں کی اس ساحرہ سے جنگ کے بعد مَیں امین کو تلاش کرنے نکلوں گا۔"

حسان نے چونک کر کہا " امین کو تلاش کرنے؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا تم

نے امین اور ارتمیس سے شادی نہیں کی۔ اگر ایسا ہے تو پھر اتنے یوم تم کہاں رہے؟"

جواب میں احمد حسان کو ارتمیس سے شادی، امین کے اغوا اور وہاں سے کریٹ جا کر طبرق اور اس کے ساتھیوں سے نمٹنے کی پُوری داستان سُنا رہا تھا۔

احمد جب خاموش ہُوا تو حسان نے دُکھ سے کہا " یہ تو بہت بُرا ہُوا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تمہیں امین کو ضرور تلاش کرنا چاہیے۔ تمہارے قرطاجنہ چلے جانے کے بعد ہمارے دو جاسوس ملکہ جرارہ کے متعلق کچھ خبریں لے کر آئے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ جنگ کے دوران جن مسلمان مجاہدین کو ملکہ جرارہ نے زندہ گرفتار کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک کے سوا دیگر سب کو اس نے تہ تیغ کر دیا ہے۔

زندہ بچنے والے جوان کا نام خالد ہے سنا ہے وہ بے حد حسین ہے۔ ملکہ جرارہ نے اسے پسند کیا ہے۔ اس نے خالد کو اپنے بیٹوں کے ساتھ ایک ہی برتن میں دودھ پلا کر اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔

تمہاری غیر موجودگی میں ایک نوجوان جس کا نام خصیب ہے اکثر میرے پاس آتا رہا ہے۔ وہ تمہارے متعلق بہت پریشان تھا۔ ہر بار تمہارے متعلق پوچھا کرتا تھا اسی نے مجھے بتایا تھا کہ تم بھی خالد کو جانتے ہو۔"

خصیب کے ذکر پر احمد گہری سوچوں میں کھو گیا تھا پھر اس نے گویا چونکتے ہوئے کہا " ہاں مَیں خالد کو جانتا ہوں۔ وہ خصیب کا دوست ہے اور اس کے ساتھ ایک بار مجھ سے ملنے میرے خیمے میں آیا تھا۔ اس وقت ہم صطفورہ شہر سے باہر جنوبی صحرا میں پڑاؤ کیے ہوئے تھے۔ وہ بہت اچھا جوان ہے۔ اس کی مدد سے ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

حسان نے احمد سے اور قریب کھسکتے ہوئے پوچھا " بہت کچھ سے تمہارا کیا مطلب ہے"۔ احمد نے رازداری میں کہا " اس کی مدد سے ہم کم از کم ملکہ جرارہ کی ذات کے خلاف حرکت میں آ سکتے ہیں۔ حسان نے بڑی شفقت کے ساتھ احمد کے شانے پہ

ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "احمد! احمد! میرے محسن! میرے دوست! تمہاری سوچیں میری سوچوں سے مختلف نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کسی طرح خالد سے رابطہ قائم کیا جائے اور اس کی مدد سے ملکہ جرارہ کو قتل کر دیا جائے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں اس کے قتل ہوتے ہی صحراؤں کے اندر وحشی بربروں کی ساری قوت اور عسکری مہارت، تیز طوفانوں میں تنکوں کی طرح بکھر کر رہ جائے گی۔ جرارہ نے اپنے سحر کے زور سے بربروں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا رکھا ہے۔ وہ اس کے سحر سے خوفزدہ ہیں۔ اسے اپنی سب سے بڑی دیوی تسلیم کرتے ہیں اور میدانِ جنگ میں اس کی خاطر آنکھیں بند کر کے موت سے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ ملکہ جرارہ کے قتل ہونے کے بعد ان کے عقیدے کو ٹھیس پہنچے گی۔ ان کے عسکری جذبوں کا مرکزی حصار ٹوٹ جائے گا اور کوہستان اور اس کے باہر ہر جگہ ہم انہیں بکریوں اور اونٹوں کے گلوں کی طرح ہانک کر رکھ دیں گے۔"

حسان چند ثانیوں تک رکا پھر وہ بڑی رازداری سے کہہ رہا تھا۔ "احمد! احمد! یہ کام تمہارے سوا اور کوئی انجام نہیں دے سکتا۔ بچپن سے ان صحراؤں اور بربروں کے اندر رہ کر تم ان کی مقامی زبان میں خوب مہارت رکھتے ہو۔ پھر ان صحراؤں نے بربروں کی طرح تمہارا رنگ بھی جلا دیا ہے اور شکل و صورت سے تم بھی بربر لگتے ہو۔ اگر تم ملکہ جرارہ کے قتل کے لیے کوہستان اور اس میں جاؤ تو کوئی تمہیں پہچان نہ سکے گا اور تم بڑی آسانی سے یہ کام انجام دے لو گے۔ اگر تم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یاد رکھو۔ ان صحراؤں کے اندر کوئی ایسی قوت نہ رہے گی جو ہمارے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو جائے۔ دمشق واپس جانے سے قبل اس مہم کو میں کامیابی کے ساتھ سر کرنا چاہتا ہوں۔"

احمد چند ثانیوں تک گردن جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "آپ کے خیال میں مجھے کب تک اس مہم کی طرف روانہ ہونا چاہیے۔"

حسان نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "تم ایک لمبی مہم سے لوٹ رہے ہو۔ چند یوم

آرام کرو۔ اس کے بعد یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔"

احمد نے ایک جذبے اور وجد میں کہا۔ "آپ میری تھکاوٹ کا خیال نہ کریں میں تازہ دم ہوں۔ میں کل ہی اس مہم پر روانہ ہو جاؤں گا۔ جب اس کام کو کرنا ہی ہے تو اس میں بے معنی تاخیر کیوں۔"

حسان کچھ کہنے والا تھا کہ لشکر میں مغرب کی اذان سنائی دی۔ حسان کھڑا ہو گیا اور احمد سے کہا۔ "آؤ پہلے نماز پڑھ لیں پھر آ کر کھانا کھاتے ہیں۔ میرے دائیں طرف حسبِ معمول تمہارا خیمہ لگا ہوا ہے اور ہر روز اس کی صفائی ہوتی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد تم آرام کر لو کہ کل تمہیں یہاں سے کوچ کرنا ہو گا۔" احمد خاموش رہا اور دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے خیمے سے باہر نکل گئے تھے۔



مغرب کی نماز ادا کرنے اور حسان کے ساتھ شام کا کھانا کھانے کے بعد احمد جب اپنے خیمے میں آیا تو اس نے دیکھا اس کے خیمے میں اس کے دونوں چھوٹے بھائی شیبان اور خصیب بیٹھے ہوئے تھے۔ احمد کو دیکھتے ہی دونوں بھائی کھڑے ہو گئے اور آگے بڑھ کر انہوں نے احمد سے مصافحہ کیا۔

احمد ان کے پاس ہی بیٹھ گیا اور شیبان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا "اے رفیقِ مہربان! تم کب یہاں آئے ہو؟"

شیبان نے ذرا کھسک کر احمد سے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "میں کئی روز سے یہاں آیا ہوا ہوں اور آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہمارے بڑے بھائی احمد کو لے کر آئیں گے۔ میرا باپ اس طویل انتظار سے تنگ آ چکا ہے۔ اب اس میں ہجر کی اس آگ اور انتظار کی اس آتش کے جذب و ہضم کی سکت نہیں ہے۔ ہمارے بھائی کی جدائی میں اس کی زندگی ایک بعد ایک بھنور اور دکھوں کے ایک عمیق سمندر جیسی ہو گئی ہے۔ اکثر شام کے وقت جب کہ پرندے اِرْجِعِی اِلٰی رَبِّکِ (اپنے رب کی طرف لوٹ چلو) پکارتے ہوئے صحراؤں کے اندر

سے گزرتے اپنی منزلوں کو لوٹتے ہیں تو وہ فرعون کے تباہ شدہ شہر منف کے کھنڈرات
میں کھڑے ہو کر اپنے رب کے حضور اِغفِر اور اِرحَم کی دُعائیں مانگنے کے
علاوہ ہمارے بھائی اور اپنے بیٹے کو زور زور سے آوازیں دے کر پکارنے لگتا ہے۔ اے
امیر! وہ کون سے عوامل کارفرما ہیں، وہ کون سا راز ہے جس کے عمل دخل میں آپ ہمارے
بھائی کی نشان دہی نہیں کرتے۔ خدا کے لیے بتلائیے وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے
اس کے بغیر ہمارے ہر حرف و حکایت، ہر تجمل و شوکت بے معنی ہے۔ اس کے بغیر ہماری ہر
شادمانی گرم بیابان کی ریت اور ہر طرف ستم بالائے ستم ہے۔ آہ ہمارا بھائی جو ہمارے
لیے دیوارِ جنت نشان تھا۔ اس کی محبت ہمارے لیے غموں سے لدا ہوا ایک سفینہ بن گئی
ہے۔ اے امیر! احمد کے بغیر ہماری زندگی اس مسافر جیسی ہو گئی ہے جو فکر و مدحت و
خرم سے بے نیاز ہو کر کسی پیاسے کی طرح سراب کو بھی دریا کہتا پھرے۔

احمد کی گردن جھکی ہوئی تھی اس کی آنکھیں آنسوؤں میں بھیگ رہی تھیں لیکن
اس نے شیبان کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

اس بار خصیب نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اے امیر! آپ لشکر
سے باہر اتنے یوم کے لیے کہاں چلے گئے تھے۔ میں بڑی بے چینی اور اضطراب کی حالت
میں آپ کا انتظار کرتا رہا۔ آقا حسان نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ آپ شادی کرنے گئے
ہیں۔ اگر آپ ایسا کر چکے ہیں تو آپ کو یہ خوشی مبارک ہو۔"

احمد نے آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر اٹھایا اور اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے
اس نے کہا۔ "میں تمہارے بھائی کو تلاش کرنے گیا تھا۔ میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں، کہ
تمہارا بھائی مل گیا ہے۔"

خصیب نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ "میرا اخی آپ کو کس جگہ ملا اور اب آپ
اسے کہاں چھوڑ آئے ہیں۔ آپ اسے اپنے ساتھ لشکر میں لے کر کیوں نہیں آئے۔" خصیب
کے خاموش ہونے پر شیبان نے منت کرنے کے انداز میں کہا۔ "یا امیر! خدا کے لیے بتائیے
وہ کہاں ہے تاکہ میں اسے اپنے ساتھ لے جا سکوں۔"

احمد نے شیبان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ کریٹ گیا ہوا تھا۔ میں نے اسے
بڑی مشکل اور انتہائی جدوجہد کے بعد تلاش کیا ہے۔ ملکہ جیراس کے خلاف جو ہم جنگ
لڑنے والے ہیں وہ اس میں حصہ بھی لے گا۔ اب تم لوگوں کو فکرمند ہونے کی ضرورت
نہیں۔ میں نے اسے تمہارے گھر کا پورا محلِ وقوع بتا دیا ہے۔ اب وہ اکیلا بھی اپنے
گھر پہنچ جائے گا۔"

خصیب نے بے چینی سے پوچھا۔ "یا امیر! آپ یہ تو بتا ہی نہیں رہے کہ
ہمارے اخی ہیں کہاں؟"

احمد نے مغموم آواز میں کہا۔ "شاید یہ انکشاف تمہارے لیے دُکھ کا باعث ہو
کہ احمد نے سطفورہ کی جنگ میں بھی حصہ لیا تھا لیکن وہ مجھے مل نہ سکا تھا اس لیے کہ
اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔"

شیبان نے بکھری اور ڈوبی ڈوبی سی آواز میں پوچھا۔ "کیسا حادثہ ہو گیا تھا
ہمارے اخی کے ساتھ۔"

احمد اپنے ہی حالات کو مناسب ترتیب دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اس کی
غیر موجودگی میں اس کی منگیتر کو کہ جس کا نام امین ہے طبرق نام کے ایک دشمن نے اغوا کر
لیا تھا اور وہ اسے کریٹ لے گیا تھا۔ لہٰذا میں بھی اس کی مدد کے لیے کریٹ پہنچ گیا۔
وہاں ہم نے طبرق اور اس کے ساتھیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ لیکن امین ہمیں نہیں ملی۔ سنا
ہے امین کو اس ظالم طبرق نے آنکھوں سے محروم کر دیا ہے اور ایک یہودی کی مدد
سے وہ طبرق کے چنگل سے بھاگ گئی تھی۔ احمد ضرور میرے ساتھ آتا لیکن وہ دو ایک
جگہ امین کو تلاش کرنے گیا ہے۔ اور عنقریب ہمارے لشکر میں آ شامل ہو گا۔"

خصیب نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "کاش! میرے اخی ہمیں ملتے اور ہم دونوں
بھائی ان کے ساتھ اپنی بہن امین کی تلاش میں نکلتے لیکن اے امیر! آپ نے تو ایک بار کہا
تھا کہ امین نام کی لڑکی سے شادی کر لی ہے اور وہ ———

احمد نے فوراً اس کی بات اُچکتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے غلطی ہوئی تھی، میں نے لوگوں

یہی سُنا تھا کہ اس نے شادی کر لی ہے لیکن اب پتہ چلا کہ اس نے ابھی ایمن سے شادی نہیں کی تھی۔ ہاں اس کی ایک اور بیوی بھی ہے۔ وہ یونانی نومسلم ہے اور اس کا نام ارتمیس ہے۔ تم دونوں بھائی فکر مند نہ ہو۔ شیبان! تم گھر لوٹ جاؤ اور اپنے گھر والوں کو جا کر خبر کرو کہ میں عنقریب خود تمہارے بھائی کو لے کر وہاں آؤں گا۔"

شیبان نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں آنے والی صبح یہاں سے کوچ کر جاؤں گا اور اپنے ماں باپ کو جا کر تسلّی دوں گا۔"

احمد نے اس بار خصیب سے کہا۔ "خصیب! خصیب! میں نے تمہارے متعلق تفصیل سے تمہارے بھائی احمد کو بتایا تھا۔ وہ خود تمہیں ملنے کو بے تاب تھا۔ سنو! اس نے ایک لڑکی بھی تلاش کر رکھی ہے جس سے وہ تمہارا بیاہ کرے گا۔"

خصیب نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے اخی بہت اچھے اور مہربان ہیں۔ کاش وہ بھی اس وقت یہاں خیمے میں ہوتے"۔

احمد نے کہا۔ "اگر وہ یہاں ہوتا تو کیا تم دونوں بھائی اُسے پہچان جاتے؟"

شیبان نے کہا۔ "کیوں نہ پہچانتے، آخر وہ ہمارے بھائی ہیں اور ہم نے ایک عرصہ ان کی شفقت میں گزارا ہے۔"

احمد نے اپنی خوشی دباتے ہوئے کہا۔ "یقیناً تم دونوں بھائی احمد کو پہچان نہ سکو گے۔ اس لیے کہ میری طرح اس کا چہرہ بھی صحرائی قزاقوں اور ان لوگوں نے جن کے ہاں ہم دونوں اکٹھے غلام تھے جلا کر بھیانک اور سیاہ بنا دیا ہے۔"

شیبان اور خصیب دونوں بھائی اُداس ہو گئے۔ احمد نے اپنی زرہ اتارتے ہوئے کہا۔ "اب تم دونوں بھائی جا کر آرام کرو۔ میں بھی اب سو جاؤں گا کہ کل مجھے اپنے لشکر کے لیے کوہستان اوراس کی طرف ایک نہایت اہم مہم پر روانہ ہونا ہے۔" شیبان اور خصیب احمد سے مصافحہ کر کے چلے گئے۔ احمد بھی اپنا جنگی لباس اُتار کر بستر میں گھس کر گہری نیند سو گیا تھا۔





رات لَقَدْ خَشِیتُ عَلٰی نَفْسِیْ پکارتی ہوئی رخصت ہو رہی تھی اور دن فَلَمَّا سَمِعَتْ حَسَّكَ فَرَّتْ گاتا ہوا اپنی ابتدا کر رہا تھا۔ پھر رات بھر کے سردی اور بھوک کے مارے ہوئے پرندے يُعْطِيكَ فَتَرْضٰى پکارتے کن کے قافلوں کی طرح رزق کی تلاش میں نکل پڑے تھے۔ زمین کا حلم اور پھولوں پر شبنم کی پھوار عیاں ہونے لگی تھی۔ قدرت کے پابند اور محرم اشیاء شعلۂ سوزاں کی طرح دن کو متاعِ نرم جانِ کمہ رات کی سانسوں کے سرگم سے نکال چکے تھے۔ ہر طرف وصل و ملاقات اور پرتجمل کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ رات کے ٹیلے رات بھر اندھیروں سے کشمکش کرنے کے بعد مشرق سے طلوع ہوتے سورج کی کرنوں میں نہا گئے تھے۔

احمد اپنے گھوڑے کو بھگاتا ہوا صحرا سے نکل کر کوہستان اوراس میں داخل ہوا تھا۔ ان ہی کوہستانوں کے اندر افریقہ کی جانی پہچانی ساحرہ ملکہ جرارہ کا مسکن تھا۔ چٹانوں کے بیچوں بیچ احمد کوئی دس میل تک اندر گیا ہو گا کہ ایک دم اس نے اپنے گھوڑے

کی باگیں کھینچ کر روک لیا تھا۔ کوہستانوں کے اندر ایک کرخت آواز اُبھری تھی اور کسی نے اسے انتباہ کرتے ہوئے کہا تھا: "ٹھہرو! تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔"

گھوڑے کو روک کر احمد اپنے دائیں طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بالکل پرسکون رکھا تھا۔ کسی خوف یا وحشت کا کوئی جذبہ اس کے چہرے سے ظاہر نہ ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پتھروں کے پیچھے سے چند بربر نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈھالیں اور ننگی تلواریں تھیں۔ ان میں سے ایک نے قریب آ کر احمد سے کہا: "نیچے اترو۔"

احمد نے گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے بڑے اطمینان اور سکون سے کہا: "فکرمند نہ ہو میرا گھوڑے پر بیٹھا رہنا تمہارے لیے خطرناک نہیں ہے۔ تم پوچھو کیا پوچھتے ہو۔"

اس بربر نے پھر پوچھا: "تم کون ہو اور کس غرض سے ان کوہستانوں میں داخل ہوئے ہو۔"

احمد نے اپنے گھوڑے کی گردن تھپتھپاتے ہوئے کہا: "تم نہیں دیکھتے میں بھی بربر ہوں۔ میرا نام سمرون ہے۔ کسی دور میں صحراؤں کے بادشاہ کسیلہ کے پاس میں غلام تھا۔ کیا میرے داغے ہوئے چہرے سے میرے غلام رہنے کی سند نہیں ملتی۔ میں ایک نہایت اہم خبر کے سلسلے میں ملکہ جرارہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

بربر نے ضد کرتے ہوئے کہا: "وہ خبر کیا ہے ہمیں بھی کہو، تاکہ اس کی نوعیت جان کر ہم تمہیں آگے بڑھنے کی اجازت دیں۔"

احمد نے اپنی سخت اور غراتی ہوئی آواز میں کہا: "میں تم سے کچھ نہ کہوں گا۔ پر یاد رکھو وہ خبر ایسی اہم ہے کہ اس کا تعلق ملکہ جرارہ اور اس کے سارے فدائین کی سلامتی سے ہے۔ سنو! مشرق کی طرف کوہستان اور اس کے اندر اس طوفان داخل ہونے والا ہے۔ میں اسی طوفان کی خبریں لایا ہوں۔"

بربر نے ایک بار اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر پریشانی میں اس نے احمد سے کہا: "کیسے طوفان کی باتیں کر رہے ہو۔"

احمد نے پھر سخت آواز میں کہا: "مجھے آگے بڑھنے دو۔ ملکہ جرارہ کو اگر خبر ہو

تم نے راستے میں بلا وجہ مجھے روک کر وقت ضائع کیا ہے تو وہ تم پر ایک سخت عذاب نازل کرے گی۔"

بربر نے کسی قدر خوفزدہ آواز میں کہا: "ہم تمہیں جاتے دیتے ہیں لیکن ہمارا ساتھی تمہارے ساتھ جائے گا جو تمہاری حرکات و سکنات پر نظر رکھ سکے اور تمہاری آمد ل مدعا کو جان سکے۔"

احمد نے پُرسکون ہو کر کہا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس بربر نے آنکھوں ھوں میں اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ بھاگ کر چٹانوں کے پیچھے چلا گیا۔ تھوڑی دیر گھوڑے پر سوار ہو کر لوٹا اور احمد سے کہا: "آؤ چلیں۔"

احمد نے اپنے گھوڑے کو اس کے پیچھے ڈال دیا تھا اور دونوں آگے پیچھے اپنے دل کو بھگاتے ہوئے جنوب کی طرف بڑھنے لگے تھے۔

کوہستانوں میں اب پہلے جیسی ویرانی نہ رہی تھی۔ اب وادیوں کے اندر بستیاں باغات اور چراگاہوں میں چرتے جانور نظر آنے لگے تھے۔ پندرہ میل اور آگے جا کر احمد بہ کے ساتھ ملکہ جرارہ کے کوہستانی شہر میں داخل ہوا تھا۔ شہر کے جس دروازے داخل ہوئے تھے اس کے پاس ایک سنگی چبوترے پر سرخ چٹانوں سے تراشا ہوا ین نسوانی مجسمہ کھڑا تھا۔ احمد نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مجسمہ ملکہ جرارہ کا ہے اور جانی کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔

اب وہ شہر کے اندر آگے بڑھنے لگے تھے۔ بربر آگے آگے تھا اور احمد پیچھے پیچھے، یہاں تک کہ وہ ملکہ جرارہ کے پتھروں سے بنے ہوئے محل کے سامنے تھے۔

احمد گھوڑے سے اُتر کر سرخ پتھر اور سنگِ ساق کی سیڑھیوں والی اس عمارت جائزہ لے رہا تھا جو ملکہ جرارہ کے محل کا کام دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ نے محل کے محافظوں کے ساتھ گفتگو کرنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بربر دوبارہ احمد کے پاس آیا اور کہا: "میں نے پہریداروں

کو تمہاری آمد کی اطلاع کر دی ہے۔ ان کا سرخیل ملکہ جرارہ سے تمہارے لیے اجازت لینے اندر گیا ہے۔ وہ اس وقت مصروف ہے اور اپنے بیٹوں کے ساتھ گفتگو کر رہی ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک وہیں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ ایک پہریدار ان کی طرف آیا اور احمد کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے اس نے کہا "چلو تمہیں اندر بلایا گیا ہے۔"

احمد کے ساتھ آنے والا بربر واپس لوٹ گیا تھا۔ پہریدار احمد کے گھوڑے کو ایک طرف لے گیا تھا۔ ایک اور پہریدار احمد کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے کہا "میرے ساتھ آؤ۔"

احمد چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ ایک دروازے کے سامنے لے جا کر اس پہریدار نے احمد سے کہا "اندر چلے جاؤ۔ تمہاری آمد کی اطلاع ہو چکی ہے۔"

احمد دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا سامنے ملکہ جرارہ اپنے تخت پر بیٹھی تھی۔ وہ ایک دیوہیکل سرخ چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا اس کی لمبائی پچیس اور چوڑائی دس فیٹ کے قریب ہو گی اور اس کے اوپر حریر و اطلس کے گدے ڈال کر اسے خوب نرم اور خوب صورت بنا دیا گیا تھا۔

ملکہ جرارہ کے دائیں اور بائیں اس کے بیٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں وہ مسلمان جوان خالد بن یزید قیسی بھی تھا جسے ملکہ جرارہ نے اپنا بیٹا بنا رکھا تھا اور جو ایک بار خصیب کے ساتھ احمد سے اس کے خیمے میں مل بھی چکا تھا۔ احمد کے اندر داخل ہوتے ہی وہ چونکا لیکن جلد ہی وہ اپنے آپ کو سنبھال گیا اور اس نے ملکہ جرارہ اور اس کے بیٹوں پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ احمد کو جانتا ہے۔

ملکہ جرارہ چند لمحوں تک غور سے احمد کو دیکھتی رہی جیسے اسے جانچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ باریک سنہری تاروں کا پتلا لباس پہنے ہوئے تھی اور جوان بیٹے ہونے کے باوجود کم عمر لگتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مادی لذتوں اور اخلاقی زوال کی چمک اور اس کے چہرے پر تشتت و اختراق اور ارادوں کو سلب کر لینے والے جذبات

تھی۔ احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے متین و نحیف سی آواز میں پوچھا "تم کون ہو اور کس غرض سے کوہستان اور اس کی ان پناہ گاہوں میں داخل ہوئے ہو؟ کیا تمہیں خبر نہ تھی کہ ان وادیوں اور کوہستانوں میں ایسا کوئی شخص داخل نہیں ہو سکتا۔ جو ہم جیسا ذوق و میلان نہ رکھتا ہو۔"

احمد نے اپنی بھرپور خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "اے ملکہ! میرا نام مروان ہے اور میں اردیہ شہر کا بربر ہوں۔ کبھی میں ان صحراؤں کے بادشاہ کسیلہ کا ذاتی غلام تھا۔ آہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک جنگ میں اپنی جرأت اور جوانمردی کا مظاہرہ کرتا ہوا مارا گیا تھا اور میں اپنے مہربان و شفیق آقا سے محروم ہو گیا تھا۔ میں اپنے ایک عزیز سے ملنے مصر کے شہر اسکندریہ گیا تھا۔ واپسی پر یہاں سے پچاس میل مغرب کی طرف مجھے ایک مشکوک بدو نظر آیا۔ اس کے حلیے، اس کی ہیئت سے مجھے شک ہوا کہ وہ مسلمانوں کا جاسوس ہے۔ لہٰذا میں نے اسے پکڑ لیا اور جب میں نے اس پر سختی کی تو اس نے سارے راز اگل دیئے۔ ابھی میں اس سے نمٹنا ہی چاہتا تھا کہ صحرا کے اندر سے اس کے دو اور ساتھی نمودار ہوئے وہ اونٹوں پر سوار تھے۔

ان تینوں نے مل کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے سخت مقابلے میں ان تینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس جاسوس سے جو مجھے خبریں ملیں اور جن کا تعلق آپ کی ذات سے ہے وہ میں آپ سے کہنے کوہستان اور اس کی ان پناہ گاہوں میں داخل ہو گیا مجھے آپ سے عقیدت اور ارادتمندی ہے ورنہ میں آپ کو اطلاع کیے بغیر جنوب کی طرف شہر اردیہ کی طرف بھی روانہ ہو سکتا تھا، کوئی مجھے روکنے والا نہ تھا اور صحرا کے اندر طوفان بھی نہ تھا کہ میں راستہ بھول کر ادھر آ نکلتا۔"

ملکہ جرارہ کی آنکھیں چمک گئیں اور اس نے بیتابی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "مسلمان جاسوس نے تمہیں کیا کہا تھا؟" احمد نے پھر پرسکون آواز میں کہا "وہ جاسوس کہہ رہا تھا۔ دمشق سے مسلمانوں کو کمک مل گئی ہے۔ انہوں نے اپنی قوت میں اضافہ کر لیا ہے اور عنقریب وہ آپ پر حملہ آور ہوں گے۔ اس بار وہ جنگ کا نیا انداز اپنائیں گے شمالی اور کوہستانی حصے کی طرف سے حملہ آور ہونے کے بجائے اس بار وہ نیا حربہ

آزمائیں گے ۔جنوب کی طرف وہ ایک لمبا کاوا کاٹیں گے اور کوہستان اور اس کے جنوب میں جو صحرا ہے اس کو عبور کر کے وہ آپ پر حملہ آور ہوں گے ۔ اس لیے کہ جنوب کی طرف کم پہاڑ ہیں اور اگر ہیں بھی تو وہ زیادہ بلند نہیں ۔اس لیے وہ اس طرف سے آئیں گے تاکہ ان کے آگے بڑھنے کی رفتار تیز رہے کیونکہ کم بلند پہاڑ اُن کے راستے میں حائل نہ ہوں گے ۔

وہ جاسوس کہہ رہا تھا ۔دمشق سے صالح نام کا سالار جو مسلمانوں کے لیے کمک لے کر آیا ہے ۔آئندہ وہ ان صحراؤں میں مسلمانوں کا سالارِ اعلیٰ ہو گا جبکہ موجودہ سالارِ اعلیٰ کوہستان اور اس کی ان پناہ گاہوں پر قبضہ کرنے کے بعد دمشق چلا جائے گا ۔ مسلمانوں کے خلیفہ نے اسے واپس بُلا لیا ہے ۔

جرارہ کے اس کمرے میں ایک دِل پسند شمیم و خوشبو اور ایک خوش کُن مہک اور باس پھیلی ہوئی تھی ۔احمد جب رکا تو ملکہ جرارہ نے کہا ۔

"اے اجنبی ! احسان بن نعمان کی واپسی، صالح کی آمد اور دمشق سے آنے والی کمک کے متعلق تمہاری معلومات بروقت اور حقیقت پر مبنی ہیں ۔ ایسی ہی خبریں میرا ایک جاسوس بھی مجھے دے چکا ہے ۔اگر تمہاری یہ اطلاعات درست ہیں تو تمہاری یہ تنبیہہ کہ مسلمان شمال کے بجائے جنوب سے حملہ آور ہوں گے سچ اور حقیقت ہو سکتی ہے لیکن تمہارا یہ کہنا کہ تم نے ایک ساتھ تین مسلمان جاسوسوں سے مقابلہ کر کے اُنہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا جھوٹ اور مبالغہ لگتا ہے ۔ میں عربوں کو بہت بہتر جانتی ہوں وہ تلوار میں اپنا ثانی نہیں رکھتے لہٰذا کسی بربر کا یہ کہنا کہ اس نے ایک ساتھ تین عربوں سے مقابلہ کر کے انہیں تہ تیغ کر دیا فہم و دانش سے بعید تر لگتا ہے ۔

احمد نے اپنا ہاتھ اپنی تلوار کے دستے پر رکھتے ہوئے کہا "اے ملکہ ! میں نے جو بات حق و انصاف کے ساتھ کی ہے ۔اس کے باوجود اگر میرے کہے پر تم مشکوک ہو تو اسی کمرے میں اپنے کوئی تین تیغ زن بلا لو ۔ اگر میں ان کو زیر کر گیا تو سمجھنا میں سچا ہوں، اگر میں ہار گیا تو میری مہار تمہارے ہاتھ میں ہے جو چاہے سزا دو ۔

اے ملکہ ! میں نے موسموں کا گرم سرد، طوفانوں کی تنگی اور صحراؤں کی فراخی دیکھی ہے

میں غلام تھا اور آزادی حاصل کی ۔ یاد رکھو آزادی کا حصول بچوں کا کھیل نہیں ۔میں نے جو کچھ کہا اسے عملی صورت میں پیش کرنے کی جرأت بھی رکھتا ہوں ۔"

جرارہ نے لکڑی کا ایک دستہ اٹھایا اور اسے ایک طلائی طشت پر مارا، پورا کمرہ ایک بلند گونجتی آواز سے بھر گیا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد ایک پہرہ دار دروازہ کھول کر اندر آیا اور جرارہ کی طرف منہ کر کے وہ گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا ۔ جرارہ نے تیز گونجتی آواز میں کہا ۔" انگائی کو بلاؤ "۔

پہریدار باہر نکل گیا ۔جرارہ نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔" میں نے ان کوہستانوں کے ایک ایسے تیغ زن کو طلب کیا ہے جس کا میرے پورے لشکر میں کوئی بھی مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا ۔ اگر تیغ زنی میں تم تھوڑی دیر بھی اس کے سامنے ٹھہر گئے تو میں آنکھیں بند کر کے تمہاری ہر بات کا یقین کر لوں گی"۔

احمد نے متین لہجے اور بھرپور خود اعتمادی میں کہا ۔"اگر میں اس بلائے جانے والے انگائی کو زیر کر لوں پھر"؟

جرارہ نے چونک کر پریشان آواز میں کہا ۔" کیا کہا ۔تم انگائی کو زیر کر لو ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، بالکل ناممکن ہے "۔

احمد نے گونجتی آواز میں پوچھا ۔اگر میں اس کمرے میں تمہارے سامنے ناممکن کو ممکن میں بدل دوں پھر "؟

جرارہ نے فخر سے کہا ۔" اگر تم نے میرے سامنے اس کمرے میں انگائی کو زیر کر لیا تو تمہاری حیثیت میرے بیٹوں جیسی ہو گی اور تم اسی محل میں میرے ساتھ رہو گے ۔تمہیں اپنے صحرائی شہر اردیہ کی طرف جانے کی ضرورت پیش نہ آئے گی ۔اگر تم کامیاب رہے تو تمہاری ہر ضرورت اور تمہاری ہر خواہش کا احترام کیا جائے گا "۔

جرارہ خاموش ہو گئی، اس کے لڑکے اس خیال سے مطمئن اور پُر لطف ہو رہے تھے کہ انہیں تیغ زنی کا ایک اچھا مقابلہ دیکھنے کو ملے گا ۔ خالد بن یزید پریشان تھا وہ بار بار الجھن کی حالت میں کبھی احمد اور کبھی جرارہ کی طرف دیکھنے لگتا تھا ۔

تھوڑی دیر بعد اس پہریدار کے ساتھ ایک مسلح جوان داخل ہوا۔ پہریدار حسب سابق اپنا سر خم کرنے کے بعد لوٹ گیا۔ جرارہ نے اس آنے والے مسلح جوان کو مخاطب کر کے کہا۔ "انکائی! ہمارے ان کوہستانوں میں ایک اجنبی بربر داخل ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے ایک ساتھ تین عربوں کو ایک جنگ میں موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ میں اس کی ہمت، اس کی باتوں اور اس کے ان دعووں کو پرکھنا چاہتی ہوں، میں دیکھنا چاہتی ہوں یہ کیسا تیغ زن ہے۔ ایسا دعویٰ کرنے والا جوان تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ ذرا اس سے مقابلہ کر کے دکھاؤ کہ میں جانوں تیغ زنی میں اس کی مہارت کیسی گہری اور ہتھیار استعمال کرنے میں یہ کیسی مہارت رکھتا ہے"۔

انکائی آہستہ آہستہ چلتا ہوا احمد کے قریب آیا اور بڑی شفقت اور نرم لہجے میں کہا۔ "اے اجنبی! اگر تم بھول کر ایسا دعویٰ کر چکے ہو تو اب بھی وقت ہے اپنے الفاظ واپس لے لو۔ تم مقابلے اور اس کے بعد کی تنقید و تذلیل سے بچ جاؤ گے"۔

احمد نے اپنی تلوار بے نیام کرتے ہوئے کہا۔ "اے انکائی! میں نے اپنی ساری زندگی صحراؤں کی تکلیف دہ مشقت میں بسر کی ہے۔ میرے باپ نے ورثے میں مجھے تلوار کے سوا کچھ نہ دیا تھا۔ سن! مجھے اپنی سادہ بدوی زندگی پر فخر ہے اور میں جانتا ہوں کب تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھنا چاہیے"۔

انکائی نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی بھاری پھل کی تلوار بے نیام کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا جوان نہیں دیکھا جو تمہاری طرح میرے سامنے مستعد و متحد ہو کر اور بے باک و پُرسکون بن کر گفتگو کرے۔ اپنی تلوار بے نیام کرو اور میرے حصارِ محکم اور سیلِ فنا کا سامنا کرو"۔

احمد نے اپنے چوڑے پھل کی خسم دار اور وزنی تلوار ایک سخت جھٹکے سے کھینچی اور انکائی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پُراعتماد آواز میں کہا۔ "انکائی! آگے بڑھ کر مجھ پر حملہ کرو۔ میں تمہیں پہلے وار کرنے کا موقع دیتا ہوں"۔

اس نے ساتھ ہی اس نے اپنی تلوار کو اپنے سامنے لہرایا اور مدھم آواز میں اس

نے اپنے رب کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ یَا رَبِّی اِرْحَمْ عَلَیَّ (اے میرے رب مجھ پر رحم کر)۔ انکائی حملہ آور ہونے کے لیے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور احمد اپنی تلوار لیے سامنے کیے اس کا منتظر تھا۔ ملکہ جرارہ آنکھیں جھپکے بغیر ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی اس کے بیٹے بھی ایسے انہماک سے دیکھ رہے تھے گویا انھوں نے اپنی سانسیں روک لی ہوں اور پوری طرح ان دونوں کی حرکات و سکنات میں کھو کر رہ گئے ہوں۔ خالد پریشان تھا اور وہ بڑی بے بسی سے احمد کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

انکائی آگے بڑھا اپنی تلوار لہرائی اور احمد پر حملہ کر دیا۔ احمد نے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ سے دُور ہی انکائی کے وار کو روکا۔ پھر انکائی گویا درندہ صفت ہو گیا تھا اور اس نے اس قدر تیزی سے اپنے حملوں کی بھرمار کی تھی کہ وہ احمد کو دھکیلتا ہوا کمرے کی دائیں دیوار کے قریب لے گیا تھا۔ انکائی کی کارگزاری پر جرارہ کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی جب کہ اس کے بیٹے بھی آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے اطمینان اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ تاہم خالد اپنے امیر کے پیچھے ہٹنے پر اداس اور افسردہ تھا۔

دیوار کے قریب انکائی کا وار روکتے ہوئے احمد نے غصے میں غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اے انکائی! تُو اپنی پوری قوت صرف کر چکا، اپنی تلوار کی پوری مہارت اور اپنی تیغ زنی کی پوری مہارت مجھ پر آزما چکا لیکن تو نے دیکھا میں نے تیرے سارے حملوں کو کیسی جانفشانی اور اعتماد کے ساتھ روکا ہے۔ دیکھ اب میں تجھ پر اپنے حملوں کی ابتدا کروں گا اگر بچ سکو تو بچ دکھانا"۔

ایک سخت جھٹکے کے ساتھ احمد نے انکائی کو پیچھے ہٹایا پھر اس نے انکائی پر اپنے تیز و تند اور طوفانی حملوں کی ابتدا کی تھی۔ لگتا تھا کوئی سیلِ فنا ٹوٹ پڑا ہو۔ لگتا تھا کسی نے دمِ عیسیٰ اور یدِ بیضا کا اظہار کرنے کی ٹھان لی ہو۔

احمد اب انکائی کو کمرے کے چاروں اطراف میں اپنے آگے آگے بھگا رہا تھا۔ انکائی کے چہرے پر جہاں مقابلے کے شروع میں ہنستی صباح اور پُرشکوہ وقار تھا وہاں اب ذلت و مسکنت اور ذلیل و خوار کر دینے والے منطقی اثرات تھے۔ انکائی لمحہ بہ لمحہ ذلت و قلت کا شکار ہوتا

جا رہا تھا۔ دوسری طرف احمد کے حملے طوفانوں کی طرح بڑھتے جا رہے تھے۔ اس کے انتقامی جذبے تیز برف باری میں برف کی تہوں کی طرح اُٹھ رہے تھے اور اس کا جلالی اور قہری انداز چڑھتے سورج کی طرح اٹھتا پھیلتا جا رہا تھا۔

ملکہ جرارہ کے چہرے پر ڈوبتے سورج کا منظر تھا اور اس کا سارا وقار نسبتی جاتا رہا تھا۔ تاہم اس کے بیٹے حیرت و استعجاب اور خوش کن جذبوں کے ساتھ احمد کو چڑھتے طوفانوں کی طرح بپھرتے اور حملہ آور ہوتے دیکھ رہے تھے۔

خالد بن یزید کے چہرے پر اب گہری دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ وہ پُرشوق نگاہوں سے ملکہ جرارہ کے اس کمرے میں اپنے امیر کو قہر آمیز کارروائی کرتے دیکھ رہا تھا۔

احمد کے طوفانی اور تیز حملوں کے سامنے انگائی کی حالت اب ایسی ہی تھی جیسے جنگی رتھ میں جُتتے ہوئے تھکے ہارے بیل کی۔ ایک کونے میں لے جا کر احمد نے اچانک انگائی کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جس میں اس نے تلوار تھام رکھی تھی پھر اس نے برق رفتاری اور طوفانی انداز میں انگائی کے شانوں پر اپنی بھاری تلوار کے آہنی دستے کی سخت اور بھرپور ضربیں لگانا شروع کر دیں۔

انگائی کراہتا رہا اور احمد اس پر ضربیں لگاتا رہا یہاں تک کہ انگائی کے ہاتھ سے تلوار خود بخود چھوٹ کر گر گئی اور بے سُدھ سا ہو کر وہ فرش پر گر گیا تھا۔

احمد مُڑا اور جرارہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "اے ملکہ کیا یہی وہ انگائی ہے جس سے تمہارے لشکر کا کوئی بھی جوان مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر اس میں ہمت ہے تو اسے کہو اُٹھ کر مجھ سے مقابلہ کرے۔ کیا میں نے تمہارے سامنے اس کے ہنر آذر کو نہیں کاٹا۔ کیا میں نے تمہارے سامنے اس کے ارادوں کو سلب کر کے اسے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور نہیں کر دیا۔"

جرارہ نے خجل سے انداز میں کہا۔ "اے اجنبی! میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں تمہاری ذات کا مکمل احاطہ اور بھرپور خاکہ بنانے میں ناکام رہی ہوں۔ تمہارے لڑنے اور تلوار چلانے کا انداز ایسا ہی بھیانک اور خوفناک ہے جس طرح کسی نے نہایت ہیبت ناک طریقے سے

تمہارے چہرے کو جلا کر تمہاری شخصیت کے وقار اور تمہاری جوانی کے حُسن کو داغدار اور کہر آلود کر دیا ہے۔

اے اجنبی! تم نے انگائی کے سارے اتحاد کو منتشر، اس کے اعتماد کو ریزہ ریزہ اور اس کے ارادوں کی ساری گروہ بندی کو لخت لخت کر کے ثابت کر دیا ہے کہ تم ان گنتی کے چند جوانوں میں سے ہو جو طوفان کی طرح حملہ آور ہونے اور برق بن کر گرنے کا فن جانتے ہیں۔ اے اجنبی! میں تمہارا نام بھول گئی ہوں اپنا نام پھر کہو اور سنو! آج سے تم میری فکر کا مرکز اور میری تمام تر توجہ اور شفقت کا محور ہو۔ میں تمہیں اپنا ذاتی محافظ مقرر کرتی ہوں۔ یاد رکھو، یہ میرا تم پر ایسا اعتماد اور بھروسہ ہے جسے حاصل کرنے میں بڑے بڑے جوانمرد اور طلسمی شخصیت کے سرداروں نے کئی بار مجھ سے التجائیں کی ہیں۔

احمد نے گردن کو ذرا سا خم دیتے ہوئے کہا۔ "اے ملکہ! میرے لیے یہ امر باعثِ فخر اور وجۂ سعادت ہو گا کہ میں ایک ایسی ملکہ کا محافظ بنوں جس کی میلوں دُور دُور تک لوگ عقیدت میں پوجا کرتے ہیں۔ میرا نام سمرون ہے اور میں اپنی آخری سانس اور اپنے جسم میں حرکت کرنے والے خون کے آخری قطرے تک ملکہ کی حفاظت اور پاسبانی کے فرائض انجام دیتا رہوں گا۔"

جرارہ نے ایک دلآویز طریقے سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "سمرون! آج کے بعد مجھے ملکہ نہیں جرارہ کہہ کر مخاطب کیا کرو۔ میں ان لوگوں کے لیے طلسمی ملکہ اور سحر فن عورت ہوں جو لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ایک مقدس دیوی جان کر میری پوجا کرتے ہیں۔ یاد رکھو، یہاں سے کبھی بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے۔ میں تمہارے ساتھ جس قدر ہمدردی اور چاہت کا اظہار کر سکتی ہوں میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے پر میں اس سے کئی گنا زیادہ قہر اور تشتت و افتراق کا اظہار بھی کر سکتی ہوں۔

یاد رکھو، اپنے سحر کے زور سے میں دلوں کے بھید اور آئندہ رونما ہونے والے حالات کافی پہلے ہی دیکھ لیتی ہوں۔ میرا سحر و طلسم مجھے کبھی دھوکہ نہیں دیتا اور جادو کا یہ فن میں نے ایک بوڑھے مصری جادوگر سے سیکھا تھا۔ وہ میرے حُسن اور خوبصورتی سے متاثر

ہوا تھا اور اسی جستجو میں اس نے مجھے تمام طلسماتی علوم سے آگاہ کر دیا تھا۔ جو کچھ اس مصری جادوگر نے مجھے سکھایا تھا اس علم میں مصر اور قدیم بابل کا سحر شامل ہے۔ بابلی طلسم وہی ہے جو ہاروت و ماروت دونوں فرشتوں سے چل کر آگے بڑھا تھا اور مصری جادو فرعونی دور سے تعلق رکھتا ہے۔

احمد نے بڑی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اے جرارہ! میں تمہیں دھوکہ اور فریب نہ دوں گا جس کام کا بھی ارادہ کروں گا پہلے تمہاری سماعت میں لاؤں گا۔ اطمینان رکھو میں وقت بن کر ہر اس شے کو اپنے پاؤں تلے کچل دوں گا جو تمہاری طرف غلط نگاہ سے دیکھے اور ــــــ"

احمد کہتے کہتے رُک گیا کیونکہ کمرے کے ایک کونے میں بے سدھ پڑا ہوا انگائی اُٹھا۔ زمین پر گری ہوئی تلوار اُٹھا کر اس نے اپنے نیام میں ڈال لی اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے اجنبی نوجوان! میں حسد و نسلی تعصب اور بغض و کینہ رکھنے والا انسان نہیں ہوں۔ میں برملا اس کا اظہار کرتا ہوں کہ تم مجھ سے طاقت ور اور کہیں بہتر تیغ زن ہو۔ میں اپنی شکست اور تمہاری فوقیت تسلیم کرتا ہوں۔ تم یقیناً ان طوفانوں میں سے ایک ہو جنہیں شکست سے دوچار کرنا میرے جیسے جوانوں کے بس سے باہر ہے۔ میں تمہیں سلام کرتا ہوں اور تمہاری شجاعت و تیغ زنی کی توصیف کرتا ہوں۔"

جرارہ نے پرسکون لہجے میں کہا "تم اپنی شکل و صورت، اپنے علم و عمل اور اپنی حرکات و سکنات سے اخلاقی زوال اور مادی اضمحلال کی طرف مائل اور صورت پرست نہیں لگتے۔ تم میرے ساتھ کامیاب رہو گے۔ میری مشیعت اور میری ہمراہی میں تمہاری آزادی اور خود مختاری پر کوئی حرف نہ آئے گا۔"

احمد نے اپنے آپ کو اور زیادہ عاجزی میں لے جاتے ہوئے کہا "جس طرح کوئی پجاری مجسّمے کے دیوتا کے حضور اپنا پہلا عہد نامہ پیش کرتا ہے اس طرح میں بھی اپنی اطاعت و فرماں برداری اور اپنی پرستش و متابعت آج تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں۔"

جرارہ نے اپنے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا "اپنے ذہن میں کوئی اندیشہ کوئی فکر نہ لاؤ، میں تمہاری اس انکساری، تمہاری اس فروتنی کا خوب صلہ دوں گی۔"

احمد نے بھی خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میں نے بھی اپنی زندگی میں بہت اونچے خواب دیکھے تھے لیکن آج یقین ہوا کہ سب خواب جھوٹے نہیں ہوتے کچھ سچے بھی ہوتے ہیں۔"

خالد بن یزید اپنے امیر کی کامیاب سعی اور فوز مند کاوش اور عمدہ ترین صناعی پر اندر ہی اندر مسرور تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ اچانک احمد نے اپنے عمل و فعل کی طرف ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے جرارہ سے کہا "جہاں مجھ پر اس قدر نوازش و بخشش ہوئی ہے وہاں مجھ پر ایک مہربانی اور لطف اور کرو۔ چند یوم کے لیے میرے ساتھ کسی ایسے جوان کو کر دو جو مجھے یہاں کے طور، ڈھنگ اور روش طرز سکھاتا رہے تاکہ میں کسی بھی موقع پر ظاہری اور باطنی طور پر بھٹک نہ سکوں۔"

خالد سمجھ رہا تھا کہ اس کے امیر کا اشارہ کس طرف ہے۔ لہٰذا اپنے امیر کے جواب میں اپنے کردار کی ادائیگی کے لیے اس نے فوراً جرارہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیا ایسا ممکن نہیں کہ یہ اجنبی جوان جس کا نام سمرون ہے، میرے ساتھ میرے کمرے میں رہے، میں اسے یہاں کے رنگ و طرز سکھانے کے علاوہ اس سے تیغ زنی کا فن سیکھوں گا تاکہ کسی روز میں بھی ایسے ہی فن کا اظہار کر کے آپ کی نگاہوں میں ایسا ہی قرب، ایسا ہی مرتبہ حاصل کر سکوں۔" نتائج سے بے پرواہ جرارہ نے فوراً اپنے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میں خالد کی التماس کو قبول کرتی ہوں۔ سمرون تم فی الوقت خالد کے ساتھ رہو گے۔ یہ تمہاری راہنمائی کرنے کے علاوہ تم سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش بھی کرے گا۔ خالد! تم اُٹھو اور اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ لگاتار سفر کرتے ہوئے اور یہاں مقابلہ کرتے ہوئے یہ تھک چکا ہو گا۔ اسے آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔" اپنی دلی آرزو بر آنے پر خالد اُٹھا اور احمد کا ہاتھ پکڑ کر وہ جرارہ کے اس کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

احمد کو لے کر خالد ایک کمرے میں داخل ہوا۔ پہلے اس نے کمرے کا دروازہ اندر

سے بند کیا پھر احمد کو ایک نشست پر بٹھا کر خود بھی ساتھ بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔" اے امیر! ان سنگلاخ چٹانوں کے اندر آپ کس غرض سے داخل ہوئے ہیں؟"

احمد نے رازدارانہ آواز میں بلا توقف کہہ دیا۔" ملکہ جرارہ کو قتل کرنے کے لیے"۔ خالد نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔" یہ نہایت دشوار اور دوبھر کام ہے"۔ احمد نے بے پروائی سے کہا۔" میں ہر بار خطر اور دقت طلب کام کو کرتے ہوئے راحت و آسائش محسوس کرتا ہوں۔"

خالد نے سہمے ہوئے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔" اس کام کو آپ کیسے اور کب انجام دیں گے؟" احمد نے غور سے خالد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" یہ کام میں آج ہی رات جرارہ کے کمرے میں انجام دوں گا۔ تم فکرمند نہ ہو یہ کچھ مشکل کام اور دشوار فعل نہیں ہے۔"

خالد نے پھر پوچھا۔" جرارہ کے قتل ہونے سے ہمیں کیا فوائد حاصل ہوں گے۔"

احمد نے کہا۔" جرارہ کے قتل ہونے پر اس کی خاطر لڑنے والوں میں شکستگی اور بددلی پھیل جائے گی اور پھر ان کوہستانوں کے اندر صحرائے اعظم اور کوہستانِ اطلس کے بربروں کو شکست دینا سہل ہو جائے گا۔"

خالد چند لمحوں تک سوچوں میں کھویا رہا۔ دوبارہ اس نے احمد سے کہا۔" یا امیر! ایسا نہ ہو اپنے طلسم سے وہ یہ جان جائے کہ آپ اسے قتل کرنے کی نیّت سے کوہستان اور اس کی ان وادیوں اور دیولاخوں میں داخل ہوئے ہیں۔"

احمد، خالد سے قریب ہوا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا پھر وہ اسے نہایت شفقت سے کہہ رہا تھا۔" خالد! خالد! غیب کا علم میرے رب کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے۔ اگر اس کا سحر اس قابل ہوتا تو وہ میرے یہاں داخل ہوتے ہی میرے آنے کا مدعا جان گئی ہوتی، چونکہ ایسا نہیں ہے لہٰذا اس کا طلسم مستقبل کے حالات کی پیمائش کرنے سے قاصر ہے۔"

سنو! مجھے غور سے سنو خالد! ہمارا لشکر جو اب پہلے کی نسبت زیادہ انفرادی طاقت رکھتا ہے۔ اس وقت کوہستان اور ۲۱ ، کے شمال مغرب میں ان چٹانوں کے اندر خیمہ زن

ہے جو کوہستانی سلسلے سے الگ تھلگ ہو کر صحرا کے اندر دور تک چلی گئی ہیں۔ وہاں پانی کے دو چشمے بھی ہیں جن کا پانی صحرا میں تھوڑی دور جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

صحرا کے اس حصے میں جرارہ کے جس قدر گشت کرنے والے جاسوس تھے انہیں پکڑ کر ختم کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس طرف سے کوئی خبر لانے والا نہیں آیا۔ میرے آگے پیچھے کچھ مسلمان جاسوس بھی اس وادی میں داخل ہو چکے ہیں۔ جرارہ کو قتل کرنے کے بعد میں اگر اس کی موت کی خبر اپنے لشکر کو نہ پہنچا سکا تو بھی یہ کام رُکے گا نہیں کیونکہ کوئی نہ کوئی جاسوس یہ خبر ضرور پہنچائے گا اور لشکر حملہ آور ہو جائے گا۔ میرے اور حسان کے درمیان یہی طے پایا تھا کہ جرارہ کے قتل ہوتے ہی حملہ کر دیا جائے۔

چونکہ ان وادیوں کے لوگ جرارہ کی پرستش کرتے ہیں اور اسے دیوی مانتے ہیں لہٰذا اس کی موت انہیں بددل کر دے گی۔ اس موقع پر اگر ان پر حملہ ہو گیا تو وہ حملے کی تاب نہ لا سکیں گے۔ اس لیے کہ جرارہ جس کے لیے وہ لڑتے تھے ختم ہو چکی ہو گی۔

خالد نے پھر خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔" یا امیر! جرارہ کو قتل کرنے کے بعد یہاں سے بھاگ نکلنا نہایت مشکل اور دقّت طلب فعل ہو گا۔"

احمد نے پھر اس کی ڈھارس بندھائی۔" خالد! خالد! میں ان کوہستانوں میں داخل ہونے والے راستوں کو دیکھ چکا ہوں۔ جرارہ کے محافظ صرف ان راستوں پر نگرانی کرتے ہیں جو خوب چوڑے اور لشکروں کی آمد و رفت کے لیے موزوں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے گمنام اور غیر معروف راستے ہیں جن کے ذریعے طلسم کی اس وادی سے نکلا جا سکتا ہے۔"

خالد نے پوری طرح احمد سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ یا امیر! آپ جو بھی قدم اٹھائیں میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے کھانا لاتا ہوں۔" خالد اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔



رات جب آدھی کے قریب گزر گئی تھی اور ہر کوئی گہری اور میٹھی نیند سو گیا

تھا، احمد اور خالد اپنے کمرے سے نکلے - خالد راہنمائی کر رہا تھا اور احمد اس کے پیچھے پیچھے تھا - اس کمرے کے سامنے آکر خالد رُک گیا جو جرارہ کی خواب گاہ تھا وہاں دروازے پر دو مسلّح جوان کھڑے پہرہ دے رہے تھے - ایک پہریدار نے خالد سے پوچھا "رات کے اس وقت جبکہ ہر کوئی نیند سے ہم آغوش ہے تم کدھر آئے ہو۔"

خالد کے بجائے احمد نے کہا۔ "مجھے ملکہ نے رات کے وقت طلب کیا تھا تم جانتے ہو میں اس شہر میں اجنبی ہوں اور یہ شخص جس کا نام خالد ہے میری راہنمائی پر جرارہ نے مقرر کر رکھا ہے۔"

پہریدار نے تعجّب سے کہا "لیکن اس وقت تو وہ سو رہی ہیں - اس وقت وہ تمہیں کیونکر اپنے کمرے میں طلب کر سکتی ہیں۔"

احمد نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ تو مجھے خبر نہیں کیوں طلب کیا ہے۔ اگر تم مجھے اندر نہیں جانے دیتے ہو تو میں لوٹ جاتا ہوں لیکن یاد رکھو اگر جرارہ نے مجھ سے نہ آنے کی وجہ پوچھی تو میں صاف بتا دوں گا کہ تم نے مجھے اندر جانے سے روک دیا تھا پھر جو حالات ہوں اُن کا سامنا تم خود ہی کر لینا۔"

پہریدار خوفزدہ ہو گیا اور ہکلاتی آواز میں اس نے کہا - تم دونوں تھوڑی دیر رُکو، میں اندر جا کر پہلے پوچھتا ہوں -

احمد نے اپنے قریب کھڑے خالد کا کندھا دبا کر کوئی اشارہ دیا اور خالد اس پہریدار پر ٹوٹ پڑا جو جرارہ کے کمرے میں داخل ہونے لگا تھا - دوسرے پہریدار کو احمد نے فی الفور دبوچ کر بے بس اور مجبور کر دیا تھا - دونوں پہریداروں کے گلے گھونٹ کر انہوں نے ان کی لاشوں کو اُٹھا کر ایک قدرے زیادہ تاریک کونے میں ڈال دیا تھا - دونوں فوراً واپس مڑے اور جرارہ کے کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے اندر سے دروازے کو بند کر لیا تھا -

دونوں کمرے میں آگے بڑھے، انہوں نے دیکھا جرارہ بلوط کی ایک بڑی اور کشادہ مسہری پر ریشمی گدے اور حریری و اطلسی بستر پہ دراز تھی - اس کا شب خوابی کا باریک

لباس اس کے جمال خیز جسم کا ستر کرنے میں ناکام تھا -

آگے بڑھتے ہوئے احمد نے اپنی تلوار بے نیام کر لی اور مسہری کے قریب جا کر اس نے جرارہ کا سر پکڑ کر ہلاتے ہوئے اپنی کرخت اور سخت آواز میں کہا "اٹھو! تمہارے پُراسرار خواب دیکھنے کا وقت اب ختم ہو چکا ہے" - جرارہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی - اس کے بستر سے ایسی خوشبو اُٹھ رہی تھی گویا وہ خود نافہ بن کر مہک گئی ہو -

جرارہ نے احمد اور خالد کی طرف دیکھتے ہوئے پریشان آواز اور اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا "تم دونوں رات کے اس وقت یہاں میرے کمرے میں - سمرون! سمرون! مجھے یاد نہیں رہا - کیا میں نے آج رات تمہیں بلایا تھا۔"

احمد نے زہریلے لہجے میں کہا "مجھے تم نے نہیں بلایا تھا لیکن ایک اور ہستی نے مجھے رات کے اس وقت تمہاری طرف بھیجا ہے۔"

جرارہ نے اپنا لباس درست کیا اور سخت و کرخت آواز میں اس نے پوچھا - "کون ہے وہ جس نے تمہیں رات کے وقت میرے پاس بھیجا ہے۔"

احمد نے پھر پہلے جیسے انداز میں کہا "میرے رب نے مجھے اس طرف آنے کا حکم دیا ہے تاکہ میں عزرائیل بن کر تمہاری رُوح کو قبض کر لوں۔"

جرارہ نے چیختی ہوئی آواز میں کہا "سمرون! سمرون! تم ہوش میں ہو؟ کیا تمہیں خبر ہے کہ میری ایک ہی پکار پہ پہریدار اندر آئیں گے اور تمہارا کام تمام کر دیں گے۔"

احمد نے اپنی تلوار کی نوک اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا "اے جرارہ! اب نہ ہی تمہارے پہریدار اور نہ ہی تمہارا کوئی طلسم تمہارے کام آسکتا ہے - سُن جرارہ! اچھی عورت آدھا میوہ اور آدھا پھول ہوتی ہے لیکن تم وہ پیڑ ہو جس میں نہ کوئی پھول ہے نہ پھل - تمہارا کوئی ضابطہ اخلاق نہیں - تم جیسی بدن پرست اور حواس باختہ عورت کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے۔"

جرارہ نے اس بار کپکپاتی آواز میں پوچھا "ایسا کرنے سے تمہیں کیا حاصل ہو گا۔"

احمد نے غضبناک آواز میں کہا "اے اپنے ضمیر کی اسیر عورت تیری موت سے میری قوم کو

حصارِ محکم اور مجھے سعادتِ ابدی نصیب ہو گی۔" جرارہ کے چہرے پہ اضطراب و بیزاری کے آثار گہرے ہو گئے تھے۔ بے چین و پریشان آواز اور مضمحل و رنجیدہ لہجے میں اس نے پوچھا "تم کون ہو اور کس قوم کا ذکر کرتے ہو۔"

احمد نے جرارہ کی گردن پر رکھی اپنی تلوار کی نوک پہ دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سن جرارہ! میں بربر نہیں عرب ہوں اور مسلمان ہوں۔ تیری اوصاف سے عاری اور لہو و لعب سے بھرپور زندگی کو آج کی رات میں ختم کر دوں گا۔"

جرارہ کے ہونٹ تیزی سے ہلنے لگے تھے جیسے وہ کسی سحر کی ابتداء کر رہی ہو۔ احمد نے اپنا ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھا تاکہ وہ چیخ کر ان کے لیے خطرات پیدا نہ کرے اور دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنی تلوار گرا کر جرارہ کی گردن کاٹ دی تھی۔

خالد بن یزید نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے توصیفی انداز میں کہا۔ "یا امیر! تنہا ان کوہستانوں میں داخل ہو کر اور بلا جھجک افریقہ کی اس خوفناک ساحرہ کو ختم کر دینا اپنی ذات میں یہ ایک بہت بڑا معرکہ ہے۔"

احمد نے اپنی تلوار جرارہ کے بستر سے پونچھ کر میان میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "خالد! خالد! میرا یہ تجربہ ہے کہ جب انسان کسی نیک کام کے لیے ہر خوف سے بے نیاز ہو کر اپنے عمل کی ابتدا کرتا ہے تو وہ کامیاب رہتا ہے۔ آؤ اب یہاں سے نکل چلیں اور جرارہ کے اس شہر سے بچ کر بھاگ نکلنے کی کوشش کریں۔" دونوں آگے پیچھے جرارہ کے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

اب خالد بن یزید آگے رہ کر راہنمائی کر رہا تھا کیونکہ وہ اس کوہستانی محل کے پُر پیچ راستوں سے بخوبی واقف تھا۔ احمد اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ محل سے نکل کر دونوں اس سمت جا رہے تھے جدھر جرارہ کے محل کا اصطبل تھا۔ وہ ابھی تھوڑی دور ہی آگے گئے تھے کہ انہوں نے دیکھا کوئی اُن کا تعاقب کر رہا تھا۔

خالد نے فوراً احمد سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "یا امیر! محتاط رہیئے کوئی ہمارے تعاقب میں ہے۔" احمد نے مڑ کر دیکھا کوئی دُبلا پتلا سا انسان دُور رہ کر سائے کی طرح اُن

تعاقب کر رہا تھا۔ احمد نے تیزی سے قدم اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "خالد! خالد! جلدی کرو ہمیں فوراً اصطبل پہنچنا چاہیے۔ ہمیں مڑ کر تعاقب کرنے والے کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے اس وقت اگر اسے کوئی گمان نہیں ہے تو ہمارے بار بار مڑ کر پیچھے دیکھنے سے وہ اور زیادہ مشکوک ہو کر ہمارے لیے دشواریاں پیدا کر دے گا۔" دونوں نے پہلے کی نسبت اپنی رفتار تیز کر لی۔ لیکن تعاقب کرنے والا ایک گہرے تاریک ہیولے کی طرح ان کے تعاقب میں تھا۔

ابھی وہ اصطبل سے دُور ہی تھے کہ ان کے پیچھے جرارہ کے محل سے ایک شور سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر انہوں نے محسوس کیا پورے محل میں لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے تھے اور بلند آوازوں میں چیختے ہوئے وہ ایک دوسرے کو ملکہ جرارہ کے قتل کی خبر دینے لگے تھے۔

احمد نے یہ بھی سُنا کہ جرارہ کے قتل کی خبروں کے ساتھ اس کا نام سمرون بھی لیا جا رہا تھا۔ خالد نے پریشانی میں کہا۔ "اے امیر! اب یہاں سے ہمارا بھاگ نکلنا اگرچہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ محل میں شور مچ گیا ہے۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر تک محل کے ارد گرد پہرہ دینے والے اور اصطبل کے نگران بھی جاگ اُٹھیں گے اور سب اس طرف بڑھیں گے اور ہمارا پکڑا جانا یقینی ہو جائے گا۔"

احمد نے ایک جگہ کھڑے ہو کر جائزہ لیا۔ تعاقب کرنے والا وہ دُبلا پتلا آدمی اب ان سے بالکل نزدیک ہو گیا تھا۔ پہلے ان کے پیچھے ہی محل کے اندر شور کرنے اور بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اب یہ آوازیں چاروں طرف پھیل گئی تھیں اور ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ چاروں طرف سے لوگ بھاگتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ احمد نے خالد کا بازو پکڑ لیا اور ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا "خالد! خالد! میرے ساتھ آؤ۔ تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔ لوگ چاروں طرف سے بھاگ بھاگ کر ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔"

ایک جگہ جہاں دو بلند دیواریں آ کر ملتی تھیں وہاں احمد نے خالد کا ہاتھ چھوڑ

دیا اور دونوں وہاں رُک گئے کیونکہ وہاں تاریکی قدرے گہری تھی۔ اس کے علاوہ ان
کی خوش قسمتی تھی کہ چاند ابھی طلوع نہ ہوا تھا۔ گہری اندھیری رات ہونے کے باعث
وہ اندھیرے کی آڑ لے سکتے تھے۔

اچانک احمد نے اپنی تلوار کھینچ لی۔ وہ دبلا پتلا آدمی جو سائے کی طرح ان کا تعاقب
کر رہا تھا۔ اب بھاگتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا۔ قریب آکر اس نے جب دیکھا کہ احمد نے
تلوار کھینچ لی ہے تو وہ رُک گیا۔ احمد نے دیکھا وہ نہتا تھا اور اس کے پاس اپنے دفاع
کا کوئی سامان نہ تھا۔

تھوڑی دیر رکنے کے بعد تعاقب کرنے والا چند قدم اور آگے بڑھا پھر اس نے احمد
کو مخاطب کر کے کہا "سمرون! سمرون! اپنی تلوار نیام میں کر لو۔ میں دشمن نہیں دوست
ہوں"۔ احمد دنگ رہ گیا تھا۔ اس کے کانوں میں پڑنے والی وہ آواز نسوانی تھی۔ بالکل
ایسی ہی دلکش اور فرحت انگیز جیسے بے صدا رات میں ہلکے ہلکے اور دھیمے دھیمے کسی نے
نقرئی برتنوں کو آپس میں ٹکرا دیا ہو۔

احمد نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں جانتا تم کون ہو۔ اگر
تم ہماری دوست ہو تو آگے آجاؤ۔ میری تلوار سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بلا جھجک
آگے آجاؤ اور کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔ وہ لڑکی آگے بڑھی اور بڑی بے باکی سے احمد کا ہاتھ
پکڑتے ہوئے اس نے کہا "یہاں کھڑا ہونا انتہائی خطرناک ہے۔ ابھی پہرے دار ادھر
آئیں گے اور تم دونوں کو پکڑ کر لے جائیں گے۔ تم دونوں جلدی جلدی میرے ساتھ آؤ۔"

وہ لڑکی اس کونے سے نکل کر بھاگنے لگی تھی۔ احمد اور خالد بھی اس کے پیچھے
پیچھے تھے۔ ایک جگہ وہ لڑکی ایکدم رُکی پیچھے مڑ کر احمد اور خالد کی طرف دیکھا پھر اپنی
کپکپاتی آواز میں کہا "جلدی کرو وقت کم ہے۔ پہرے دار ہمارے نزدیک آرہے ہیں۔"
اب وہ لڑکی پتھریلی سیڑھیاں اتر کر نیچے جا رہی تھی۔

احمد اور خالد اس کے پہلو بہ پہلو بھاگتے ہوئے اس کا ساتھ دے رہے تھے
شاید وہ اس پر پورا بھروسہ کر کے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر چکے تھے۔ لڑکی ایک جگہ

گئی اور پتھریلے فرش پر پڑے لوہے کے ایک چھوٹے سے مگر مضبوط کڑے کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کڑے کو پکڑ کر پتھر کو اٹھاؤ۔ جلدی کرو، وقت کم ہے۔
پہرے دار لوگ بھاگتے آرہے ہیں۔ اگر تم دونوں ان کے ہاتھ چڑھ گئے تو وہ تمہیں عبرتناک
موت ماریں گے۔"

احمد نے لوہے کے اس کڑے میں ہاتھ ڈال کر جب اسے کھینچا تو ایک پتھر
اوپر اٹھ گیا اور اس کے نیچے ایک راستہ نمودار ہوا جس کے اندر سیڑھیاں تھیں جو نیچے
کسی تہ خانے کی طرف جا رہی تھیں۔ لڑکی نے بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم دونوں
جلدی سے اتر جاؤ۔ یہ کوئی تہ خانہ نہیں سرنگ ہے اور اگر تم ہمت اور جوانمردی سے
کام لو تو تم بچ کر انہی سرزمینوں کی طرف جا سکتے ہو جہاں سے تم آئے ہو۔"

سنو سمرون سنو! یہ اس محل کی حفاظتی سرنگ ہے اور شہر کی فصیل سے
دور باہر جھاڑیوں اور پودوں سے اٹی ہوئی ایک چٹان کے قریب جا کر ختم ہوتی
ہے۔ اس سرنگ کے اندر اور باہر تمہیں کئی حفاظتی پہرے داروں کا سامنا کرنا پڑے گا
اگر تم اپنی فطری شجاعت سے کام لو تو تم اپنے ساتھی سمیت بحفاظت واپس جا سکتے
ہو۔ اب تم دونوں فوراً یہ سیڑھیاں اتر کر نیچے چلے جاؤ۔"

احمد نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔ "پہلے یہ
بتاؤ تم کون ہو۔ تمہارا نام کیا ہے اور کیوں تم نے ہماری جان بچائی ہے۔ اس کے
علاوہ کیا تم اپنے چہرے سے نقاب نہ ہٹاؤ گی کہ میں دیکھ سکوں تم کون ہو۔"

لڑکی نے فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "سمرون! سمرون! دیکھو تعاقب
کرنے والے پہرے دار عنقریب ادھر بھی آنکلیں گے۔ تم سیڑھیاں اتر جاؤ۔ اگر تم جان
بچا کر اس سرنگ کے پار چلے گئے تو شاید میں تم سے دوبارہ ملوں پھر میں تمہیں بتا دوں
گی کہ میں کون ہوں، میرا نام کیا ہے اور کیوں میں نے تمہاری جان بچائی ہے"۔

احمد خالد کے ساتھ فوراً سرنگ میں جانے والے اس راستے میں اتر گیا۔ اس
لڑکی نے پتھر کو دوبارہ اپنی پہلی جگہ پر رکھ دیا اور پھر وہ بھاگتی ہوئی اندھیرے میں

روپوش ہوگئی تھی ۔

✱

احمد اور خالد نے اپنی تلواریں بے نیام کر لی تھیں ۔ احمد نے اپنی پُشت پر بندھی ہوئی ڈھال بھی اُتار کر اپنے بائیں ہاتھ میں تھام لی تھی ۔ خالد کی ڈھال پہلے ہی اس کے ہاتھ میں تھی ۔ دونوں سیڑھیاں طے کرنے کے بعد وہ ایک سرنگ میں اُتر گئے تھے احمد خالد کو لے کر تھوڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا ۔ جب اس کی آنکھیں سرنگ کی تاریکی سے مانوس ہوگئیں تو اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا ۔ وہ سرنگ کافی بلند اور چوڑی تھی اور شہر کے شمال مغربی حصّے کی طرف جا رہی تھی ۔

احمد نے سرگوشی میں خالد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ۔ "خالد ! خالد ! میرے پیچھے پیچھے آتے رہو ۔ کم سے کم کھٹکا پیدا کرنے کی کوشش کرنا ۔ مجھے اُمید ہے ہمارا رب ہمیں بے بسی کی موت مرنے کے لیے اس اجنبی شہر کی بھیانک سرنگ میں تنہا نہ چھوڑ دیگا ۔" احمد نے اپنے کندھے پر لٹکتی کمان کو درست کیا اور آگے چل پڑا تھا ۔ کافی دیر تک وہ اس سرنگ کے اندر چلتے رہے لیکن کسی بھی محافظ یا پہریدار سے ان کا کوئی تصادم نہ ہُوا تھا ۔

اچانک ایک جگہ احمد نے خالد کا بازو پکڑ کر روک لیا پھر ایک سخت جھٹکے کے ساتھ اسے اپنی طرف کھینچا اور دیوار کے ساتھ کر لیا پھر احمد نے اس کے کان میں رازدارانہ سرگوشی کی ۔ "خالد ! خالد ! دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوجاؤ ، آگے کوئی ہے ۔ میرے پاؤں نے سرنگ کے اندر اس کے چلنے کی ہلکی دھمک کو محسوس کیا ہے اور میرے کان ان کی سانسوں کا احساس کر چکے ہیں ۔ خالد ! خالد ! مَیں نہیں جانتا اس اندھی اور تاریک سرنگ کے اندر کتنے پہریداروں سے ہمارا سامنا ہوتا ہے لیکن اے رفیقِ من ! ہمت نہ ہارنا ، اپنے حوصلے بلند رکھنا ، مَیں اپنی آخری سانس تک تمہاری حفاظت کروں گا ۔"

خالد بن یزید نے رقت آمیز اور وجد آفریں آواز میں کہا ۔ "یا امیر ! مجھے

آپ کی شجاعت پر ناز اور آپ کی جوانمردی پر گمان ہے ۔ قسم ربِ عظیم کی جس کے ساتھ آپ کا یہ ہمراہی ہوا اسے موت کے سوا ہر خوف اور ہراس سے بے فکر ہو جانا چاہیے ۔ امیر ! اطمینان رکھیے مَیں مصیبت کے وقت ڈھال بن کر دشمن سے آپ کی حفاظت کروں گا ۔ میرا لڑائی میں کام آجانا اتنا اہم نہیں اس لیے کہ اس وقت میری قوم کو میری نسبت آپ کی زیادہ ضرورت ہے ۔ آپ مطمئن رہیے مَیں بد سے بدترین حالات کا سامنا کرتے ہوئے بھی آپ کو مایوس نہ کروں گا ۔ احمد نے فوراً اپنا ہاتھ خالد کے منہ پر رکھتے ہوئے کہا ۔ خالد ! خالد ! آہستہ آہستہ بولو کوئی سامنے کی طرف سے آنے کی کوشش کر رہا ہے ——

احمد کہتے کہتے رُک گیا کیونکہ سُرنگ کے اندر کسی کی کڑکتی ہوئی گونج دار آواز بلند ہوئی ۔ "کون ہو تم اور کس غرض سے تم نے اس سُرنگ میں داخل ہونے کا انتظام کیا ۔" احمد خاموش رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا ۔ تاہم وہ بڑی سرعت کے ساتھ حرکت میں آرہا تھا ۔ اب وہ اپنی کمان سنبھال چکا تھا اور پشت پر لٹکتے ہوئے ترکش سے اس نے تیر نکال کر چلّہ پہ چڑھا لیا تھا ۔ پھر چند ثانیوں تک وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا ۔ یہاں تک کہ اس نے تیر چلا دیا ۔ سُرنگ کے اندر ایک بار نہایت کریہہ اور جگر دوز چیخ بلند ہوئی اور پھر چاروں طرف خاموشی بکھر گئی تھی ۔

احمد کا تیر کھا کر مرنے والے کی دلدوز چیخ کے بعد دُور کہیں ایک آواز سنائی دی کیا ہُوا یہ تم نے چیخ کیوں ماری ہے ۔" احمد نے کچھ سوچا پھر اس نے خالد کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ۔ خالد ! خالد ! میرے ساتھ آؤ اور جتنی تیزی سے بھاگ سکتے ہو بھاگو ۔"

خالد نے احمد کا بھرپور ساتھ دیا اور دونوں تیزی سے آگے کی سمت بھاگنے لگے تھے ۔ جب وہ تھوڑی دُور آگے گئے تو اُنہوں نے دیکھا سامنے سے کوئی مشعل بردار آرہا تھا ۔ آنے والے کا جسم نظر نہ آرہا تھا بس مشعل کی لہر لیتی لو تھی جو سرنگ کے اندر بڑھتی آرہی تھی ۔

احمد نے فوراً خالد کو روک لیا اور دونوں دیوار کے ساتھ لگ گئے مشعل بردا

قریب آگیا تھا اور ان دونوں نے اپنی سانس تک روک لی تھی۔ جب وہ ان کے قریب سے گزرنے لگا تو اچانک احمد اس پر جھپٹا اپنا ایک ہاتھ اس نے آنے والے کے منہ پر رکھا اور دوسرا ہاتھ اس کی شہ رگ پر رکھ کر اسے دبا لیا تھا۔ خالد نے فوراً آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے مشعل چھین لی تھی۔ سرنگ کا محافظ تھوڑی دیر تک احمد کی آہنی گرفت میں پھڑپھڑاتا رہا۔ پھر اس کی سانس رُک گئی۔ اس کی گردن ڈھلک گئی اور وہ ختم ہو گیا۔

احمد نے اس کی لاش کو دیوار کے ساتھ رکھ دیا اور خالد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "خالد! خالد! اس مشعل کو اپنے پاس ہی رکھو۔ سرنگ کی گہری تاریکی میں یہ ہمارے کام آئے گی۔ دونوں پھر آگے بڑھنے لگے تھے۔

تھوڑی ہی دور آگے جا کر احمد پھر رُک گیا اور خالد کو بھی اس نے روک لیا۔ ان سے چند قدم آگے سرنگ کی دیوار کے اندر آتش دان میں آگ جل رہی تھی ایک پہریدار آگ کے پاس بیٹھا جاگ رہا تھا جب کہ آگ کے قریب ہی اس کے چار اور ساتھی سوئے ہوئے تھے۔ ایک بار پھر احمد نے اپنی کمان سنبھالی اس پہ تیر چڑھایا اور تاک کر مارا۔ تیز منہ اور بھاری سرے کا تیر آگ کے پاس بیٹھے محافظ کا دِل چیرتا ہوا نکل گیا تھا۔ اس محافظ نے بھی تکلیف اور درد کی شدّت اور کسی قدر خوف کے باعث بھیانک چیخ ماری اور آگ کے پاس گِر کر وہ دم توڑ گیا تھا۔

خالد نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے احمد سے کہا۔ "یا امیر! مَیں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسا بے خطا نشانہ دیکھا ہے۔ واللہ جنگوں میں آپ کی تیغ زنی تو قابلِ تعریف تھی ہی لیکن آپ نے تیر اندازی میں بھی اپنے آپ کو بے مثل ثابت کر دیا ہے۔"

ایک محافظ کے مرنے سے اس کے چار ساتھی جو آگ کے پاس لیٹے ہوئے تھے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ اور پریشانی کے عالم میں آگ کے پاس مُردہ پڑے اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگے۔ جس کی چھاتی سے خون کی تیز دھار سرنگ کے فرش کو رنگین بنا رہی تھی احمد نے ایک بار پھر اپنی کمان سنبھالی اور جاگنے والوں پر اپنے تیروں کی تیز

بوچھاڑ ماری۔ ان میں سے تین وہیں ختم ہو گئے چوتھا اُٹھ کر بھاگا اور قریب ہی لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جانے لگا۔ احمد نے اس کا نشانہ لے کر بھی تیر چلا دیا اور وہ آخری محافظ بھی سیڑھیاں سے لڑھکتا اور واویلا کرتا ہُوا اپنے مرنے والے ساتھیوں کے پاس گر گیا تھا۔ اسی لمحے دُور آگے کی طرف سے کسی نے بلند آواز میں پوچھا تھا "کیا ہوا؟" اور پھر خاموشی چھا گئی۔

احمد نے خالد سے کہا۔ "آؤ اب آگے بڑھیں۔ ان کا اب صرف ایک ہی ساتھی زندہ رہ گیا ہے جو ہمارے سامنے آوازیں دے کر ان کا حال معلوم کر رہا ہے۔ خالد نے پریشانی میں پوچھا۔ "یا امیر! آپ نے یہ اندازہ کیونکر لگا لیا کہ ان کا ایک ہی ساتھی زندہ رہ گیا ہے؟"

احمد نے خالد کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری رزم گاہ کی ممارست اور جنگی تجربہ ابھی کم ہے۔ سنو! مَیں تمہیں اپنے اندازے کی بنیاد بتاتا ہوں۔ تم نے دیکھا آتش دان کے قریب چار محافظ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ان کا سونا اس امر کی نشاندہی ہے کہ وہ اپنے پہرے کے انتظار میں آرام کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے جب چار آدمی اگلے پہرے کے لیے سو رہے ہیں تو موجودہ پہرے پر بھی چار جوان ہوں گے جن کی جگہ سونے والے اُٹھ کر سنبھالیں گے۔"

خالد مطمئن ہو کر خاموش رہا۔ دونوں تیز تیز چلتے ہوئے اس جگہ آئے جہاں آتش دان جل رہا تھا اور اس کے قریب لاشیں پڑی تھیں۔ انہوں نے دیکھا وہاں لکڑی کی سیڑھیاں تھیں جو سرنگ کی چھت پہ ایک کافی بڑے روشن دان کی طرف جا رہی تھیں۔ اس روشن دان کا منہ کھُلا تھا اور اس میں تازہ ہَوا اور روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

احمد نے خالد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم آخری بچنے والے محافظ کی طرف سے چوکنے رہنا۔ وہ شمال کی طرف ہے۔ شاید ادھر آنے کی کوشش کرے کیونکہ ایک بار وہ اپنے ساتھیوں کے متعلق آواز دے کر پوچھ بھی چکا ہے۔ مَیں سیڑھیوں کے اُوپر چڑھ کر روشن دان میں سے دیکھتا ہوں کہ ہم اس وقت کہاں ہیں۔

خالد ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ڈھال اور مشعل تھامے چوکس کھڑا ہو گیا تھا۔ احمد لکڑی کی سیڑھیوں سے اُوپر چڑھا اور روشندان سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ آسمان پر اب چاند طلوع ہو چکا تھا۔ چاروں طرف خاموشی اور چاندنی تھی۔ وہ اس وقت شہر سے باہر کوہستانوں سے گھرے ہوئے کسی ویرانے میں تھے اور وہ روشندان جس میں سے احمد نے دیکھا تھا۔ ایک اُونچی چٹان کی اوٹ میں بنایا گیا تھا اور اس کا مُنہ بند کرنے والا پتھر بھی قریب ہی پڑا تھا جس کے اندر لوہے کا ایک کنڈا لگا ہوا تھا۔

احمد دوبارہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "خالد! خالد! میں تمہیں ایک خوش خبری دیتا ہوں۔ ہم دونوں اس وقت شہر سے باہر ہیں۔ یہ روشندان شاید محافظوں کے آنے جانے اور تازہ ہوا کے لیے ویرانے میں ایک چٹان کی اوٹ میں بنا ہوا ہے۔ آؤ اب اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھیں۔ ہم خوش قسمت ہیں۔ قدرت ہماری مدد اور رہنمائی کر رہی ہے۔ ہمیں اپنے رب کی اس عنایت اور مہربانی کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

خالد نے احمد کو یاد دہانی کراتے ہوئے کہا۔ "اے امیر! ابھی ایک محافظ زندہ اور باقی ہے اور وہ شمال میں اسی طرف ہے جدھر ہم نے جانا ہے۔"

احمد نے اس بار لاپرواہی سے کہا۔ "اس کے متعلق تم فکر مند نہ ہو کیونکہ وہ ——"

احمد رُک گیا کیونکہ شمال کی طرف سے غار کے اندر ایک مشعل آتی دکھائی دی تھی۔ احمد نے خالد سے سرگوشی میں کہا۔ "لو وہ آ گیا۔ میں اسے بھی رخصت کرتا ہوں۔"

احمد نے چلّا پر تیر چڑھایا نشانہ لیا پھر غار کے اندر اس کے تیر کی سنسناہٹ ہوئی اور آنے والا محافظ ایک تکدّر اور دل آزار چیخ مار کر گر گیا تھا۔ احمد نے اپنی کمان اپنے کندھے سے لٹکا لی اور دونوں سرنگ کے اندر شمال کی طرف بھاگنے لگے تھے۔

کافی دیر تک وہ بھاگتے رہے یہاں تک کہ انہیں اپنے سامنے ایک پتھریلی چٹان نظر آئی۔ دونوں رُک گئے اور حالات کا جائزہ لینے لگے کیونکہ سُرنگ وہاں آ کر ختم ہو گئی تھی اور سامنے سیاہ رنگ کی ایک سخت چٹان آ گئی تھی۔ احمد اس سیاہ چٹان کے ساتھ ساتھ جب بائیں طرف بڑھا تو اس نے دیکھا وہاں سیڑھیاں تھیں جو اُوپر کی طرف جا رہی تھیں اور یہ سیڑھیاں

اس سیاہ رنگ کی چٹان کو کاٹ کر بنائی گئی تھیں۔

احمد وہ سیڑھیاں طے کر کے اُوپر جانے لگا تھا۔ خالد بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا بارہ چھوٹی چھوٹی وہ سیڑھیاں تھیں جو انہوں نے طے کیں۔ اس کے بعد سیڑھیوں کا وہ سلسلہ ختم تو نہ ہوا تھا۔ سیڑھیاں اُوپر جاتی تھیں لیکن ان کے سر سرنگ کی چھت سے چھونے لگے تھے۔ احمد نے مُڑ کر خالد کو مخاطب کر کے کہا۔ "خالد! خالد! میرے ساتھ آ کر کھڑے ہو جاؤ۔ میں زور لگا کر سرنگ کے مُنہ پر رکھے پتھر کو اُٹھاتا ہوں۔ تم اپنی ڈھال میرے سر کے اُوپر پکڑ کر رکھو تاکہ سرنگ کے مُنہ پر پہرہ دینے والا اگر کوئی ہو اور وہ ہم پر حملہ کرے تو اس کی تلوار کو ڈھال پر روکا جا سکے۔"

خالد فوراً اس سیڑھی پر آیا جس پر احمد کھڑا ہوا تھا اور اپنی ڈھال کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس نے احمد کے سر کے اُوپر کر لی تھی۔ جلتی ہوئی مشعل جو خالد نے تھام رکھی تھی وہ چونکہ اس نے سیڑھیوں پر رکھ دی تھی لہذا انہیں سرنگ کی چھت صاف دکھائی دے رہی تھی۔

احمد نے جب سرنگ کے مُنہ پر رکھے پتھر کے نیچے اپنے دونوں ہاتھ جما کر زور لگایا تو پتھر اُوپر اُٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ احمد آہستہ آہستہ پتھر کو اُوپر اُٹھاتا رہا اور اگلی سیڑھیاں چڑھتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ خالد بھی احمد کے سر پر ڈھال رکھے اُوپر چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ احمد نے اپنا آدھا جسم سرنگ سے باہر نکال لیا اور اس پتھریلے ڈھکن کو اس نے آواز پیدا کیے بغیر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر وہ سرنگ سے باہر نکلا۔ اس نے دیکھا سُرنگ کے اس مُنہ کے چاروں طرف دُور دُور تک خشک گھاس، جھاڑیاں اور سرکنڈے تھے۔ ایک دم احمد چونک پڑا اس نے دیکھا جس چٹان کے اُوپر وہ کھڑا تھا اس سے تھوڑی ہی دُور دائیں جانب ایک پتھر کے قریب آٹھ دس کے قریب مسلح جوان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں گھاس اور جھاڑیوں کو کاٹ کر تھوڑی سی جگہ صاف کر لی گئی تھی اور وہیں ان کے بستر لگے ہوئے تھے۔ شاید وہ سرنگ کے اس مُنہ کی حفاظت کرنے والے پہریدار تھے۔

احمد نیچے بیٹھ گیا اور سرگوشی کے انداز میں اس نے کہا۔ "خالد! سرنگ سے

باہر آجاؤ۔ سنو! جلتی ہوئی مشعل بھی باہر لے آؤ۔ یہ ہمیں یہاں بہت کام دے گی۔ خالد جلتی ہوئی مشعل لیے باہر آگیا۔

سورج اب کافی چڑھ آیا تھا اور دھوپ پہاڑوں کی چوٹیوں سے اتر کر وادیوں میں بھی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ احمد نے ایک بار پھر غور سے ان پہریداروں کی طرف دیکھا جو سردی سے بچنے کے لیے دھوپ میں ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ احمد نے اپنے کندھے پہ لٹکتی ہوئی کمان سنبھالی۔ ترکش سے کچھ تیر نکال کر اس نے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ پھر اس نے ایک گھٹنا زمین پہ جمایا اور دوسرا سیدھا کھڑا کر کے اس نے تیر چلانے کا انداز بنا لیا تھا۔ پھر اس نے انہیں گنا وہ تعداد میں دس کے قریب تھے۔

احمد نے چلّا پہ تیر چڑھایا پھر یکے بعد دیگرے بڑی برق رفتاری اور طوفانی انداز میں اس نے ان پہریداروں پہ تیروں کی بارش کر دی تھی۔ جب ان کے پانچ آدمی تیروں سے چھد کر زمین پر لوٹنے اور واویلا کرنے لگے تو ان کا ایک ساتھی ایک چٹان کی اوٹ میں جانے کے لیے بھاگنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ شور بھی کرنے لگا تھا "بھاگ جاؤ میرے ساتھیو! بھاگ جاؤ! شاید مسلمانوں نے ہم پر حملہ کر دیا ہے"۔

احمد نے تاک کر اسے تیر مارا اور وہ دہرا ہو کر پتھریلی زمین پہ گر گیا تھا۔ باقی بچنے والے چار بھی اپنے مرنے والے ساتھی کی تقلید میں اسی چٹان کی اوٹ میں جانے کو بھاگے تھے لیکن احمد نے انہیں بھی اپنے تیروں سے چھید کر ختم کر دیا تھا۔

احمد نے بچ جانے والے تیر اپنے ترکش میں ڈال لیے کمان اس نے کندھے سے لٹکالی اور پتھر کو اٹھا کر اس غار کے منہ پہ رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے خالد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "خالد! خالد! آؤ دونوں مل کر کوئی بڑا سا پتھر اٹھائیں اور اسے اس پتھر پہ رکھ دیں جو غار کے منہ پر پڑا ہے تاکہ سرنگ کے اندر اگر کسی کو مرنے والے پہریداروں کی خبر لگ گئی کہ ان کے ساتھیوں کو قتل کر کے کوئی شمال کی طرف گیا ہے تو وہ ضرور ہمارا تعاقب کریں گے آؤ کوئی بڑا اور وزنی پتھر اس سرنگ کے منہ پہ رکھ دیں تاکہ تعاقب کرنے والے اسے اٹھا کر سرنگ سے باہر نہ آسکیں۔

دونوں نے مل کر قریب ہی پڑا ہوا وزنی پتھر لڑھکا کر سرنگ کے منہ پر رکھ دیا پھر احمد اپنے ہاتھ جھاڑتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا تھا کہ قریب ہی چٹانوں کے اندر اسے کسی گھوڑے کے نتھنے پھڑ پھڑانے کی آواز سنائی دی۔ احمد نے خالد کا بازو پکڑ کر فوراً نیچے بیٹھ گیا اور جلدی جلدی کندھے سے کمان اتار کر اس پہ تیر چڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ "خالد! خالد! یہاں ابھی تک ہمارے لیے خطرات ہیں۔ گھوڑے کا نتھنے پھڑ پھڑانا اس امر کی تنبیہہ ہے کہ یہاں کوئی اور بھی ہے"۔

خالد نے اپنی دلیل پیش کرتے ہوئے کہا "یا امیر! کیا ایسا ممکن نہیں کہ ان مرنے والوں کے گھوڑے یہیں کہیں چر رہے ہوں اور ان ہی میں سے کسی کے نتھنے پھڑ پھڑانے کی آواز آئی ہو"۔

احمد نے پر تشویش آواز میں کہا۔ ایسا لگتا نہیں ہے کیونکہ مرنے والوں کے اگر گھوڑے ہوتے تو وہ انہیں چرنے کے لیے اپنے سامنے چھوڑتے کیونکہ یہاں گھاس بکثرت ہے جب کہ نتھنے پھڑ پھڑانے کی آواز اس شمالی ٹیکری کی پشت سے سنائی دی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی اور سرنگ کا منہ وہاں کھلتا ہو اور وہاں بھی پہرہ دینے والے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ——————

احمد کہتے کہتے رک گیا کیونکہ شمال کی طرف سے ایک آواز سنائی دی تھی "سمرون! سمرون! نیچے آجاؤ۔ اب یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے"۔ آواز نسوانی تھی۔ نہایت میٹھی حرص و ہوس کی تلخی سے پاک اور زندگی کی چاہت اور محبت سے بھرپور وہ آواز کسی نوجوان لڑکی کی تھی۔

احمد نے فوراً تیر ترکش میں ڈال لیے۔ اپنی کمان اس نے کندھے سے لٹکالی اور کھڑے ہوتے ہوئے اس نے کہا۔ "خالد! خالد! میں اس آواز کو پہچان چکا ہوں یہ اسی لڑکی کی آواز ہے جس نے اس سرنگ کے ذریعے بھاگنے میں ہماری مدد کی تھی۔ اس کی آواز میں خلوص اور اتحاد عمل ہے۔ تم نے سنا نہیں اس کی آواز میں مشرقی عورتوں جیسا دلفریب حسن اور طمانیت ہے۔ آؤ نیچے چلیں اور اس سے ملیں۔ وہ اب ہماری زندگی

کی محرومیوں کا باعث نہیں بن سکتی ہے۔ وہ ہمیں دھوکہ نہ دے گی۔ اس لیے کہ اگر اس کی نیت میں فتور ہوتا تو وہ رات ہی کو ہمیں تعاقب کرنے والوں کے حوالے کر سکتی تھی۔ اپنی یہ جلتی ہوئی مشعل بھی لے آؤ۔ اس کا کام ابھی شروع ہونا ہے"۔ دونوں چٹان سے اُتر کر نیچے جانے لگے تھے۔

جس پتھر کے قریب احمد نے پہرہ دینے والوں کو تیر مار کر ختم کیا تھا اس کی پشت پر چند چٹانیں چھوڑ کر جب وہ ایک چٹان کے پاس آئے تو انہوں نے دیکھا وہاں وہی لڑکی کھڑی تھی اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور رات والا ہی موٹا اُونی لباس اس نے پہن رکھا تھا۔

احمد نے اس کے قریب آکر کہا "میں نہیں جانتا تم کون ہو لیکن رات جب جرارہ کے شہر میں ہم بے ٹھکانہ بھاگ رہے تھے تم نے سرنگ کے ذریعے یہاں تک پہنچنے میں ہماری مدد کی ہے۔ ہم تمہارے مشکور ہیں لیکن تم نے یہ نہیں بتایا تم کون ہو اور کیوں تم نے ہماری اس طرح مدد کی ہے۔ میں تمہیں پہلے سے نہیں جانتا نہ ہی تمہاری آواز میری سماعت کے لیے شناسا ہے۔ کیا تم اپنے چہرے سے نقاب نہ ہٹاؤ گی کہ میں دیکھوں تم کون ہو۔ اپنے چہرے سے نقاب ہٹادو کہ میں دیکھوں ہم پر احسان کرنے والی لڑکی کون ہے اور اس کا تعلق کس سرزمین سے ہے"۔

لڑکی نے مسکراتی ہوئی آواز میں کہا "آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ نے ایک بار پہلے بھی مجھے دیکھا ہے تاہم آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ میری آواز آپ کی سماعت سے شناسا نہیں ہے اس لیے کہ جو ملاقات میرے اور آپ کے درمیان ماضی میں ہوئی تھی اس میں ہم ایک دوسرے سے مخاطب نہ ہوئے تھے۔ اپنے ماضی کے اس دور کی طرف چلے جائیے جب آپ صحرائے اعظم اور کوہستانِ اطلس کے بربر بادشاہ کسیلہ کی قید سے بھاگ کر صحرائے اوراس میں بھٹک گئے تھے اور ملکہ جرارہ کے جاسوسوں کے ہاتھ چڑھ گئے تھے۔ کیا میں نے درست کہا ہے"۔

احمد نے فوراً کہا "ہاں، تم نے درست کہا ہے"۔

لڑکی نے پھر اپنی مسکراتی پھول برساتی آواز میں پوچھا "کیا جرارہ کے ان جاسوسوں میں کوئی لڑکی بھی تھی"۔ ——— "ہاں ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی اس کا نام سیدار تھا۔ دیکھو تو مجھے ابھی تک اس کا نام بھی یاد ہے"۔

اس لڑکی نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹاتے ہوئے کہا "تو پھر پہچانیں کیا میں ہی سیدار نہیں ہوں"؟ احمد نے دیکھا وہی لمبے قد اور سُرخ و سفید رنگ کی رومن لڑکی تھی جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ایسی تھیں گویا کسی بلوری نگار خانہ میں بونۂ کُن جھلک رہے ہوں۔ چہرہ شفق شمائل اور ایسا روشن اور چمک دار جیسے وہ فسوں خیز چاندنی بن کر اندھیروں کا سینہ چھلنی کرنے اور کرنوں کا مستول بن کر صحرا کو گلزار بنانے کے لیے پیدا کی گئی ہو۔

وہ وہی رومن لڑکی سیدار تھی جسے ایک بار احمد پہلے بھی صحرائے اوراس کے اندر دیکھ چکا تھا اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر کے اسے بحفاظت جانے کی اجازت دے دی تھی۔

احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "ہم نے تو تم پر کوئی احسان نہ کیا تھا پھر تم نے ہمارے ساتھ یہ بھلائی کیوں کی"؟

لڑکی نے احسان مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "آپ کا وہ احسان کیا کم تھا کہ جب آپ نے صحرا اوراس کے اندر میرے ساتھیوں کو قتل کر دیا اور مجھے بحفاظت جانے کی اجازت دے دی۔ حالانکہ آپ مجھے بھی موت کے گھاٹ اُتار سکتے تھے! اس لیے کہ اپنے ساتھیوں کی طرح میں بھی ملکہ جرارہ کی جاسوس تھی"۔

احمد نے اس بار ہمدردی سے پوچھا "تم کون ہو اور کیسے تم جرارہ کے گروہ میں شامل ہو گئی تھی"۔

سیدار کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس نے روتی سسکتی آواز میں احمد سے کہا "یہ مجھے بچپن ہی میں کہیں سے اُٹھا لائے تھے۔ مجھے خبر نہیں میرے ماں باپ اور بہن بھائی کہاں ہیں۔ یہاں میں نے اپنے ساتھیوں کو بہت کریدا کہ میرا گھر

کہاں ہے لیکن کسی نے کچھ نہ کہا۔

احمد اداس ہو گیا، شاید اسے اپنے بچپن اور غلامی کا دور یاد آ گیا تھا اور اس نے پھر سیدار سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "ہم پر احسان کرنے کے بعد اب تمہارا کیا ارادہ ہے"۔

سیدار نے اپنے آنسو پونچھ لیے اور سنبھلتے ہوئے اس نے کہا۔ "میں یہاں کی زندگی سے تنگ تھی اور ایک عرصے سے منتظر تھی کہ کوئی ایسا ہو جو مجھ سے ہمدردی کرے میری خوب صورتی سے نہیں میری ذات سے پسندیدگی کا اظہار کرے اور میں ہمیشہ کے لیے اس کا ہاتھ تھام کر باعزت زندگی گزار دوں۔ کل آپ جب شہر میں داخل ہوئے تو میں نے آپ کو دیکھ لیا تھا۔ میں آپ کا تعاقب کرتی رہی۔ میں جان گئی تھی کہ آپ اس شہر میں ضرور کوئی طوفان کھڑا کریں گے۔

جب آپ ملکہ جرارہ کے محل میں داخل ہو گئے تو میں سمجھ گئی کہ آج رات ملکہ جرارہ کی خیر نہیں ہے۔ لہٰذا میں وہیں ادھر اُدھر منڈلاتی رہی۔ ملکہ جرارہ کے پہریداروں میں سے ایک میرا اچھا جاننے والا ہے۔ رات کا ایک حصّہ میں نے اس کے پاس گزارا۔ اس دوران میں نے اس کمرے کی طرف بھی دھیان رکھا جس میں آپ ٹھہرے ہوئے تھے۔

آدھی رات کے قریب جبکہ آپ اور آپ کا یہ ساتھی اپنے کمرے سے نکل کر ملکہ جرارہ کی خواب گاہ کی طرف گئے تھے تو میں سب کچھ سمجھ گئی تھی لہٰذا میں نے اسی وقت آپ کو بچانے اور آپ کی مدد کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اس لیے کہ میں آپ کو آپ کے کردار اور جرأت و جوانمردی کی وجہ سے پسند کرنے لگی تھی۔ جرارہ کے قتل کے بعد جو حالات پیش آئے وہ آپ کے علم میں ہیں۔

احمد نے سنجیدہ اور متین لہجے میں پوچھا۔ "اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم نے ہم پر احسان کیا ہے"۔ سیدار نے بھاری اور زخمی سی آواز میں کہا۔ "میں آپ سے کسی احسان کا بدلہ نہیں چاہتی، میں ملکہ جرارہ کے اس جہنم سے فرار چاہتی ہوں۔ ان صحراؤں کے اندر میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ میں چاہتی

ہوں آپ مجھے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیں۔ میں آپ کی خدمت کروں گی۔

میں یہاں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں باعصمت نہیں ہوں۔ ملکہ جرارہ کے جاسوسوں نے جن کے ساتھ میں کام کرتی تھی کئی بار مجھے زبردستی بے آبرو کر دیا تھا۔ اس جہنم میں میرے جیسی اور کئی لڑکیاں بھی ہیں جنہیں گوہرِ عصمت سے محروم کر دیا گیا ہے"۔

سیدار اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

خالد بن یزید آگے بڑھا اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "سیدار! سیدار! تم فکرمند نہ ہو اگر میرے امیر نے تمہارا ہاتھ نہ تھاما تو ہم تمہیں دھکے کھانے نہ دیں گے تم میرے ساتھ میری بہن کی حیثیت سے رہو گی۔ میری کوئی بہن نہیں۔ واللہ! میری ماں تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو گی"۔ سیدار نے فوراً اپنے آنسو پونچھ لیے اور سنبھلتے ہوئے اس نے خالد سے کہا۔ "مجھے آپ جیسے بھائی پر فخر ہو گا"۔

احمد کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ سیدار اور خالد دونوں پریشانی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے دیکھا احمد نے آہستہ آہستہ اپنی گردن سیدھی کی اور سیدار کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا "سیدار! سیدار! گو میں شادی کر چکا ہوں لیکن میں تمہیں مایوس نہ کروں گا۔ میں آج ہی اپنے لشکر میں واپس جاؤں گا اور آنے والی شب کو ہم ملکہ جرارہ کے اس مسکن پر حملہ آور ہوں گے۔ اس جنگ کے بعد میں تمہیں اپنی بیوی بنا لونگا"۔

سیدار کے ہونٹوں پہ آنسوؤں کی جگہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ گہری دلفریب مسکراہٹ بڑے ممنون انداز میں اس نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے فخر ہو گا کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔ میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتی ہوں اور اس مقدس جنگ میں آپ کے پہلو بہ پہلو میں بھی حصّہ لوں گی"۔

احمد کچھ کہنے والا تھا کہ خالد نے بولتے ہوئے کہا۔ "یا امیر! بخدا آپ نے یہ فیصلہ کر کے مجھے دلی سکون دیا ہے۔ میں آپ کی اس ہمدردی اور دردمند رویے کا مشکور ہوں۔ اب مجھے اجازت دیجئے کہ جب تک سیدار آپ کے نکاح میں نہیں آتی اس وقت

تک میں اسے اپنے ساتھ رکھوں کہ یہ اب میری بہن ہے اور میں اپنی بہن کی شادی بڑے عزم اور شوکت کے ساتھ کروں گا۔"

سیدار کے سُرخ آلوچے جیسے ہونٹوں پر سحر انگیز مسکراہٹ بکھر گئی تھی اس نے اپنی بے پایاں خوشی کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔" تھوڑی دیر قبل تک میں اپنے آپ کو ایک بد قسمت اور بد طالع لڑکی تصور کر رہی تھی لیکن اب میں دُنیا کی ایسی خوش بخت اور نیک نصیب لڑکی ہوں کہ جہاں ان صحراؤں کے اندر میرا کوئی نامر، کوئی مددگار نہ تھا وہاں اب میرا ہونے والا شوہر اور بھائی دونوں موجود ہیں۔ مجھے آپ دونوں کی ذات پر فخر و گمان ہے"۔

احمد نے سیدار اور خالد دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" یہاں اب زیادہ دیر رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ آؤ یہاں سے کُوچ کا انتظام کریں۔ تم دونوں تھوڑی دیر یہیں رکو میں ان شمالی چٹانوں کی اوٹ میں جاتا ہوں ادھر سے ہمیں کسی گھوڑے کے نتھنے پھڑپھڑانے کی آوازیں آئی تھیں، ہوسکتا ہے ان مرنے والے پہریداروں کے گھوڑے اس طرف ہوں۔"

سیدار نے آگے بڑھ کر احمد کو روکتے ہوئے کہا۔" آپ کو اس طرف جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان پہریداروں کے گھوڑے یہاں نہیں رہتے۔ ہر صبح کو یہ پہریدار بدلی ہوتے ہیں۔ نئے آنے والے گھوڑوں پر سوار ہو کر آتے ہیں اور جو پہلے سے یہاں موجود ہوتے ہیں وہ ان ہی گھوڑوں پر سوار ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔ آپ نے جن پہریداروں کو ختم کیا ہے۔ یہ آج صبح ہی یہاں آئے تھے۔ اب اگلی صبح تک یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ ویسے ہمیں یہاں اب زیادہ دیر نہیں رُکنا چاہیئے۔ کیا سرنگ کے اندر بھی کچھ پہریداروں سے آپ کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔"

احمد نے کہا۔" ہاں، سرنگ کے اندر میں نے اپنے تیروں سے آٹھ محافظوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔"

سیدار نے فکر مند ہو کر کہا۔ تو پھر ہمیں وقت ضائع کیے بغیر یہاں سے کُوچ کر جانا چاہیئے۔ سرنگ کے اندر جب دوسرے پہرے دار آئے اور انھوں نے اپنے پہلے

ساتھیوں کو وہاں مُردہ حالت میں دیکھا تو وہاں ایک شور مچ جائے گا اور سرنگ کے ذریعے بھی آپ کی تلاش شروع ہو جائے گی۔

آپ کو سرنگ میں داخل کرانے کے بعد میں فوراً پیچھے ہٹ کر تاریکی میں پوشیدہ ہو گئی تھی۔ پہریدار آپ کی تلاش میں وہاں تک آئے تھے پھر ناکام لوٹ گئے۔ ان کا یہی گمان تھا کہ آپ جرارہ کو قتل کر کے شہر کے اندر ہی کہیں روپوش ہو گئے ہیں۔

احمد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ آؤ یہاں سے پیدل ہی چلتے ہیں۔ میرے پاس [illegible]ہے۔ راستے میں جو بھی بستی آئی وہاں سے سواری کے لیے گھوڑے خرید لیں گے۔"

سیدار نے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی چہکتی اور میٹھی آواز میں کہا۔" آپ کو پیدل [illegible]نے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے ساتھ دو گھوڑے بھی لائی ہوں جن پر سوار ہو کر ہم [illegible]ی آسانی سے وہاں پہنچ سکتے ہیں جہاں آپ کا لشکر ہے"۔

احمد نے پیار سے سیدار کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" تم نہایت دُور [illegible]ش اور عقل مند ہو۔ تمہارے دونوں گھوڑے یقیناً ان شمالی چٹانوں کے پیچھے ہوں گے [illegible]سے ہمیں کسی گھوڑے کے نتھنے پھڑپھڑانے کی آوازیں سُنائی دی تھیں"۔

سیدار نے پہلی بار احمد کا سخت، کھردرا اور آہنی ہاتھ اپنے نرم اور گداز ہاتھ [illegible]لیتے ہوئے کہا۔" ہاں میرے دونوں گھوڑے وہیں ہیں، آئیے اب چلیں"۔

احمد نے آگے بڑھ کر خالد کے ہاتھ سے مشعل لی اور وہاں وہ جگہ جگہ گھاس اور [illegible]یوں کو آگ لگانے لگا تھا۔ جب آگ خوب بھڑک گئی تو اس نے خالد اور سیدار سے [illegible]" خوش قسمتی سے اس وقت ہوا شمال سے جنوب کی طرف چل رہی ہے اور یہ آگ [illegible]ب دُور دُور تک پھیل جائے گی اس طرح یہ رستہ صاف ہو جائے گا اور ہمیں اس [illegible]ن سے حملہ آور ہونے میں آسانی رہے گی۔ آؤ اب یہاں سے بھاگ چلیں"۔

تینوں پہلو بہ پہلو بھاگتے ہوئے وہاں آئے جہاں سیدار نے گھوڑے باندھ رکھے [illegible] سیدار احمد کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ گئی تھی جب کہ دوسرے گھوڑے پر خالد سوار ہو [illegible]ا۔

جب وہ وہاں سے رخصت ہوئے تو کوہستانوں کے اندر آگ خوب بھڑک
کر دور دور تک پھیل گئی تھی۔ وہ بھی اپنے گھوڑوں کو بھگاتے ہوئے کوہستانوں سے
نکلے پھر وہ صحرا کے اندر شمال مغرب کے رُخ پر اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا رہے تھے
اور اسی طرف اسلامی لشکر صحرا کے اندر پڑاؤ کیے ہوئے تھا۔





سہ پہر ڈھل گئی تھی، احمد حسان بن نعمان کے خیمے میں اس کے سامنے بیٹھا
جرارہ کے شہر میں داخل ہونے، اسے قتل کرنے اور وہاں سے باعافیت فرار کی داستان
نا رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوا تو حسان نے خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
ے رفیقِ محترم! مجھے تمہاری جرأت اور ہمت پر ناز ہے۔ تم نے جرارہ کو قتل کر کے اپنی
ذلت پر احسان کیا ہے۔ وہ گرم بادِ صرصر، دکھوں کا جال اور نافرمان وناشکری
اپیاس تھی۔ جب تک وہ زندہ رہی اس کی رُوح سکون اور بدن لذت کو ترستا
وہ بے آبرو بے عصمت ہونے کے باوجود ان صحرائی بربروں کے لیے اپنے جادو
رکی وجہ سے ایک قلعہ محکم، طبل وعلم اور ان کے لیے زندگی کی تلاطم خیز موج بنی ہوئی
،وہ اپنی منفعت کی غلام اور خود احترام انسانوں کے لیے پت جھڑ کی رُت تھی
ہم بربروں پر فقر وذلت اور فنا عدم طاری کر کے ان کی شیرازہ بندی کو بکھیر دیں گے
کوہستان اور اس کے اندر داخل ہونا ہمارے لیے ایک فعل غیر اہم ہوگا۔ یہ سب میرے

رب کی عنایت ہے۔ وہ صحیح سمت ہماری راہنمائی کر رہا ہے۔

حسان نے ذرا رُک کر پوچھا۔ "وہ لڑکی کہاں ہے جسے تم کوہستان اور اس سے اپنے ساتھ لائے ہو اور جس کا نام سیدار ہے"۔

احمد نے ہلکے ہلکے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ خالد کے پاس ہے، وہ اسے اپنی بہن کہہ چکا ہے۔ لہٰذا اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا ہے۔ گو آپ جانتے ہیں میں شادی کر چکا ہوں پھر بھی میں نے اس لڑکی سے شادی کا عہد کر لیا ہے۔ یہ میں نے ایک فی سبیل اللہ کام کیا ہے۔ اگر میں اس کی یہ خواہش رد کر دیتا تو شاید وہ یہ سمجھتی کہ شاید بے آبرو ہو جانے پر ایک لڑکی کی وقعت مسلمانوں کی نگاہوں میں گر جاتی ہے۔ اگر میں انکار کر دیتا تو وہ فکر و فہم کا شکار ہو جاتی اور شاید اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی۔ میں نے اس کے سامنے اسی لیے لیت و لعل نہیں کیا کہ مسلمانوں کے متعلق جو وہ اچھا تاثر رکھتی تھی۔ وہ اس کے ذہن میں قائم رہے اور پھر اب تو وہ دار سلام، بیت حرم اور اسلام کے غیر متبدل اصولوں اور اسلامی آداب و معاشرت کو اپنا کر اسم تسلیم ہو چکی ہے وہ اسلام قبول کر چکی ہے"

حسان نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے اس لڑکی کو اپنی زوجیت میں لانے کا وعدہ کر کے اسلام کی ایک اور خدمت کی ہے۔ اگر تم اسے سہارا نہ دیتے تو جرارہ کے جہنم سے نکل کر وہ بچاری بے یار و مددگار اس صحرا کے اندر جگہ جگہ اور نگر نگر دھکے کھانے پر مجبور ہو جاتی۔ تمہارا فیصلہ قابل ستائش ہے۔ احمد! احمد! تم صنوبر کا ایک گھنا سایہ ہو جس کی چھاؤں میں وہ پُر امن اور خوشحال زندگی بسر کر سکتی ہے۔ اگر تم اسے اپنانے کا وعدہ نہ کرتے تو وہ بچاری زندگی کے تیز طوفانوں اور تند آندھی میں کسی نازک شاخ کی طرح جھکتی پھر ٹوٹ کر گر جاتی۔ احمد! احمد! اب تم اپنے خیمے میں جا کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ ہم ملکہ جرارہ کے مسکن پر حملہ آور ہونے کے لیے آج عشاء کی نماز کے بعد یہاں سے کوچ کریں گے۔ ملکہ جرارہ کی موت پر بربروں میں پہلے ہی کہرام مچا ہو گا۔ اس پر ہمارا حملہ ان کے ذہنی انتشار اور شعوری قوت پر ایک تازیانہ ثابت ہو گا۔

حسان چند ثانیوں تک احمد کی طرف دیکھتا رہا۔ دوبارہ اس نے کچھ سوچتے ہو

کہا۔ "میں نے اپنے جو جاسوس باجہ اور بونہ شہروں کے لشکر کی اطلاعات حاصل کرنے کو روانہ کیے تھے وہ بھی لوٹ آئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان دونوں شہروں کے درمیان بربروں، اندلسیوں، صقلیہ، مالٹا، کریٹ، سارڈینیا اور کارسیکا والوں کا ایک متحدہ لشکر جمع ہے۔ وہ ابھی تک وہیں پڑاؤ کیے ہوئے ہیں۔

ملکہ جرارہ کے ساتھ ان کا یہ معاہدہ ہے کہ جب بھی جرارہ اپنے کوہستانوں سے باہر نکل کر صحرا کے اندر مسلمانوں سے جنگ کرے وہ مسلمانوں کی پُشت پر حملہ کر دیں۔ اگر ہم ملکہ جرارہ کے مسکن کے اندر گھُس جاتے ہیں تو وہ کوہستانوں کے اندر ہمارے تعاقب میں نہ آئیں گے بلکہ صحرا میں کسی مناسب جگہ پڑاؤ کر کے ہمیں کسی موقع پر گزند پہنچانے کی کوشش کریں گے لیکن اس بار ہم ان کی شیطنت پر نگاہ رکھیں گے اور ملکہ جرارہ کے مسکن کو تاخت کرنے کے بعد اس بار اُنہیں بھی عبرت خیز سبق دیں گے۔ اب تم اُٹھو اور اپنے خیمے میں جا کر تھوڑی دیر سستا لو"۔ احمد خاموشی سے اُٹھا اور باہر نکل گیا۔

احمد ابھی حسان بن نعمان کے خیمے سے نکل کر چند قدم ہی اپنے خیمے کی طرف بڑھا تھا کہ سامنے کی طرف سے اسے اپنا چھوٹا بھائی خصیب آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی احمد کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کی مسکراہٹ بکھر گئی۔ آگے بڑھ کر خصیب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ خصیب! تم کیسے ہو؟"

خصیب نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "یا امیر! پہلے میں آپ کو ملکہ جرارہ کو ٹھکانے لگانے کی مبارکباد دیتا ہوں۔ میں خالد بن یزید کے پاس سے اُٹھ کر آ رہا ہوں۔ وہ آپ کی بہت تعریف کر رہا تھا۔ اس کے خیمے میں سیدار نام کی ایک لڑکی بھی ہے جسے خالد اپنی بہن اور آپ کی منسوبہ کہتا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟"

احمد نے پیار سے خصیب کو لپٹا کر چھاتی سے لگاتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ تم نے سنا ہے درست ہے، اس جنگ کے بعد میں اس لڑکی سے شادی کر لوں گا۔ میں اسے ملکہ جرارہ کے جہنم سے نکال کر لایا ہوں۔ وہ حالات کی ستائی ہوئی ہے، پناہ اور سہارا چاہتی ہے۔ مسلمان بھی ہو چکی ہے"۔

قبل اس کے خصیب کچھ پوچھتا احمد نے پہلے ہی اس سے پوچھ لیا۔ کیا تمہارا بھائی احمد آچکا ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس جنگ میں ضرور حصّہ لوں گا۔"

خصیب نے مایوسی اور افسردگی میں کہا۔ "ابھی تک تو نہیں آئے۔ آپ کی غیر موجودگی میں کئی بار میں آپ کے خیمے کے بھی چکر لگا چکا ہوں اس خیال سے کہ شاید وہ پہلے آپ کے خیمے میں آ گئے ہوں لیکن ہر بار مجھے مایوسی ہوئی۔ نہ جانے میرے اخی کیوں نہیں آئے۔

احمد نے اس کا شانہ تھپتھپا کر اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "تم فکرمند نہ ہو وہ ضرور آئے گا۔ اگر وہ کسی مصروفیت کے باعث نہ بھی آ سکا تو بھی اب فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اور تم دونوں اس جنگ کے بعد اسے ملنے اس کے گھر چلے جائیں گے۔ اور پھر تم اسے اپنے گھر لے جانا۔

خصیب نے بڑے شوق سے پوچھا۔ "اخی احمد رہتے کہاں ہیں"۔

احمد نے کہا۔ "جب میں نے تمہیں اور چند ساتھیوں کو قرطاجنہ کی قید سے نکال کر ایک پہاڑی غار میں لا کر رکھا تھا تو وہاں کس شخص نے تمہارے لیے کھانے اور بستروں کا انتظام کیا تھا۔"

خصیب نے فوراً کہا۔ "ایک شخص زیوس اور اس کے بیٹے ہرمس نے"۔

احمد نے پھر پیار سے کہا۔ "خصیب! خصیب! اگر میں اس جنگ میں مارا جاؤں اور تمہارا بھائی بھی اس جنگ میں حصّہ لینے کو نہ آئے تو تم جنگ سے فارغ ہو کر سیدھے زیوس کے ہاں جانا۔ سنو خصیب! زیوس کی بیٹی تمہارے بھائی احمد کی بیوی ہے۔ اس کا نام ارتمیس ہے۔ وہ دو شادیاں کرنا چاہتا تھا لیکن اس دوران طریق اور اس کے ساتھیوں نے اس کی پہلی منگیتر ایمن کو اٹھا لیا اور ابھی تک وہ بیچارہ ایمن کو تلاش کرتا پھر رہا ہے"

خصیب نے بیتابی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یا امیر! آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ میرے اخی ہمارے محسن زیوس کے داماد ہیں اور ان کے ہاں رہتے ہیں۔ میں برقہ سے اس طرف آتے ہوئے اپنے بھائی سے مل کر آتا۔"

احمد نے پھر پیار سے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت زیوس سے تمہارے بھائی کے اس رشتے کے متعلق میں نے تمہیں اس لیے نہ بتایا تھا کہ اس وقت تم اپنے بھائی کو وہاں نہ مل سکتے تھے اس لیے کہ وہ ایمن کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔ تم فکر نہ کرو وہ اس جنگ میں حصّہ لینے ضرور آئے گا اور جنگ کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ وہ تمہارے ساتھ گھر جائے گا۔"

خصیب کچھ مطمئن ہو گیا تھا۔ احمد نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے خیمے میں بیٹھو۔ آج شام کا کھانا ہم اکٹھے کھائیں گے"۔ خصیب خاموشی سے احمد کے ساتھ اس کے خیمے کی طرف چل دیا تھا۔



عشاء کی نماز کے بعد صحرائے ادراس کی پنہائیوں سے نکل کر اسلامی لشکر نے ملکہ جرارہ کے کوہستانی مسکن کی طرف کوچ کیا تھا۔ یہ روانگی انتہائی خفیہ رکھی گئی تھی۔ سرِ شام ہی لشکر کے جاسوس گروہوں کی شکل میں چاروں طرف، دور دور تک پھیلا دیئے گئے تھے تاکہ اردگرد منڈلاتے رومنوں اور بربروں کے جاسوسوں کے علاوہ مشتبہ لوگوں کو پکڑ کر بروقت اپنی گرفت میں کر لیا جائے تاکہ کسی کو لشکر کی روانگی کا علم نہ ہو۔

حسان نے لشکر کو تین حصّوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ ہراول کے طور پر احمد کی سرکردگی میں دیا۔ دوسرا حصّہ اس نے اپنے پاس رکھا اور تیسرے حصّے پر صالح[1] کو سالار مقرر کیا۔ صبح ہونے سے کافی دیر پہلے اسلامی لشکر کوہستانِ ادراس میں داخل ہو گیا تھا۔

---

[1] حسان بن نعمان کا واپس بلایا جانا ایک انتہائی غلطی تھی۔ اس کے جانے کے بعد فتوحات کا سلسلہ رک گیا اور صالح افریقہ میں اٹھنے والی بغاوتوں کو فرو کرنے میں لگ گیا تھا۔ یہاں تک کہ ولید بن عبدالملک نے اس کی جگہ موسیٰ بن نصیر کو افریقہ کا والی مقرر کیا۔ جس نے طارق بن زیاد کے ساتھ مل کر اندلس کی فتوحات کا دروازہ کھول دیا اور افریقہ پر تسلط کو مستحکم کیا۔

احمد چونکہ ہراول کا سالار تھا اور اس کے علاوہ وہ ملکہ جرارہ کے اس کوہستانی مسکن کے محل وقوع سے بھی واقف ہو چکا تھا لہٰذا اسے پہلے حرکت میں آنے کا موقع دیا گیا۔ احمد نے اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھ کر کوہستانوں کے اندر پہرہ دینے والے بربروں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جو ماضی میں ملکہ جرارہ کو حملہ آوروں کی بروقت اطلاع کر دیا کرتے تھے۔ احمد اسی راستے جو اس کوہستانی مسکن میں داخل ہوا تھا جس طرف اس نے گھاس کو آگ لگا کر راستہ صاف کر دیا تھا۔

کوہستانوں کے اندر پہرہ دینے والوں کے خاتمے کا یہ فائدہ ہوا کہ کسی نے بروقت مزاحمت نہ کی اور اسلامی لشکر جلی ہوئی گھاس والے راستوں کو روندتا ہوا ملکہ جرارہ کے کوہستانی شہر کے سامنے جا نمودار ہوا تھا۔ اہلِ شہر جو ملکہ جرارہ کو اس کے طلسم کی وجہ سے ایک دیوی کی طرح پوجتے تھے اسے دفن کرنے کے بعد اس کا سوگ منا رہے تھے۔

جس وقت اسلامی لشکر شہر پر حملہ آور ہونے لگا اسی وقت مسلمان جاسوس یہ خبر لائے کہ باجہ اور بونہ شہروں کی طرف سے رومنوں کا ایک جرار لشکر ملکہ جرارہ کی حمایت میں مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا ہے۔

حسان نے وقت ضائع نہ کیا اور فوراً اس نے شہر پر حملہ آور ہونے کا حکم دے دیا ان کوہستانی بربروں سے نمٹ کر وہ فوراً طوفان کی طرح بڑھتے رومنوں کی سرکوبی کر لینا چاہتا تھا۔ تین اطراف سے جرارہ کے اس شہر پر حملہ کیا گیا تھا۔ مشرق کی طرف سے خود حسان، جنوب کی طرف سے احمد اور شمال کی طرف سے صالح اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ شہر کے اندر گھس کر حملہ آور ہوئے تھے۔

بربروں نے فوراً اپنے آپ کو مسلح کر کے مسلمانوں پر زوردار حملے کرتے ہوئے انہیں شہر سے نکالنے کی کوشش کی لیکن انہیں ناکامی ہوئی اور مسلمان انہیں روندتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ مسلمانوں کو جرارہ کی سرکردگی میں ایک بار پسپا کرنے کی وجہ سے بربروں کے حوصلے چونکہ بلند تھے لہٰذا انہوں نے شہر کے مغربی حصے میں ایک بار پھر جمع ہو کر اپنی قوت کو بڑھایا۔ اس بار تمام وہ بربر عورتیں جو جنگی ہتھیاروں کی تربیت رکھتی تھیں مسلمانوں سے

جنگ کرنے کے لیے اپنے لشکر میں شامل ہو گئی تھیں۔

اسلامی لشکر جب شہر کو فتح کرتا ہوا مغربی میدانوں میں پہنچا تو وہاں بربروں کے از سرِ نو مجتمع ہونے والے لشکر نے حملہ کر دیا لیکن حسان، احمد اور صالح کی سرکردگی میں مسلمانوں نے اس قدر سختی اور تندی سے جوابی حملہ کیا کہ مردوں اور عورتوں پر مشتمل اس نئے لشکر کا زیادہ حصّہ جنگ میں کام آ گیا جو باقی بچے وہ اپنے ہتھیار پھینک پھینک کر امان طلب کرنے لگے تھے۔ ملکہ جرارہ کا صرف ایک بیٹا بچا تھا باقی اس جنگ میں مارے گئے تھے۔

جب شہر مکمل طور پر فتح ہو گیا تو جرارہ کا وہ بیٹا حسان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کیا۔ حسان اس وقت جلدی میں تھا کیونکہ اسے ابھی رومنوں کے اس لشکر سے بھی نمٹنا تھا جو کوہستانِ اوراس کے بربروں کی مدد کو آ رہا تھا۔ وہ رومنوں کے اس لشکر کو کوہستانوں میں داخل نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس طرح جرارہ کے بربروں کا بغاوت کر کے رومنوں کے ساتھ مِل جانے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا وہ رومنوں کے لشکر سے صحرائے اوراس کے اندر نمٹ لینا چاہتا تھا۔

جلدی جلدی حسان اور بربروں کے درمیان یہ شرائط طے پائیں کہ بربر مسلمانوں کے مطیع و فرمانبردار رہیں گے۔ ایک معقول رقم سالانہ خراج ادا کریں گے اور بارہ ہزار مسلح بربر ہر وقت اسلامی لشکر کی مدد کے لیے اس کے ساتھ رہیں گے۔ جرارہ کے بیٹے نے یہ شرائط بخوشی قبول کر لیں اور حسان اپنے لشکر کے ساتھ شہر سے نکل کر رومنوں کی سرکوبی کے لیے پھر صحرائے اوراس کی طرف روانہ ہوا تھا۔ یہ سارے معاملات برق کی سی سرعت کے ساتھ طے پا گئے تھے اور بربر مطمئن تھے کہ مسلمان ان سے صلح کی شرائط طے کر کے شہر کو خالی کر گئے ہیں۔



صحرائے اوراس کے اندر رومنوں اور فرانسیسیوں کا متحدہ لشکر برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا یہاں تک کہ کوہستانوں میں داخل ہونے سے قبل ہی صحرا کے اندر مسلمانوں نے اُن کا راستہ روک دیا۔ رومنوں اور فرانسیسیوں کا لشکر لاکھوں پر محیط تھا لہٰذا وہ فوراً مسلمانوں

کے ساتھ صحرائی جنگ پر آمادہ ہو گئے اور اپنی صفیں درست کرنے لگے۔

حسان اور احمد نے اپنے لشکر کو ایسے انداز میں صف آرا کیا کہ ان کی پشت پر کوہستان اور اس کے طویل سلسلے کے ایسے بلند اور سیاہ پہاڑ تھے جنہیں پشت کی طرف سے عبور کر کے ان پر کوئی حملہ آور نہ ہو سکتا تھا۔

رومنوں نے جب اپنی صفیں درست کر لیں تو انہوں نے مسلمانوں پر دہشت طاری کرنے کی خاطر پہلے انفرادی جنگ کی ابتدا کی اور جزیرہ مالٹا[1] کا ایک قوی ہیکل اور عظیم الجثہ نائٹ اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کرنے کے بعد میدان میں اترا اور مقابلے کے لیے للکارا۔ اپنے ہراول دستوں کے سامنے کھڑا احمد فوراً حرکت میں آیا۔ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا وہ حسان کے پاس آیا اور منت کرنے کے انداز میں کہا "میرے آقا! میں جانتا ہوں میدان میں اترنے والا یہ جوان مالٹا کا نائٹ ہے جو اپنی جنگی مہارت اور مذہبی جنون کی وجہ سے عیسائی دنیا کے نامور اور لاجواب تیغ زن سمجھے جاتے ہیں۔ اگر یہ جیت کر لوٹ گیا تو ہمارے لشکر پر برا اثر پڑے گا۔ اس وقت ہمارے لشکر کے حوصلے بلند ہیں کہ ہم جزائر کے مسکن پر مکمل طور پر قابو پا چکے ہیں۔

میرے آقا! مجھے میدان میں اترنے کی اجازت دیجیے کہ میں اس رومن کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں پھینکوں اور اپنے لشکر کے لیے اچھے شگون کی ابتدا کروں۔ آپ مطمئن رہیے، میں ان رومنوں کے ہر طریقۂ جنگ سے واقف ہوں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

حسان نے مسکراتے ہوئے کہا "گو میں تمہیں اجتماعی جنگ کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا پھر بھی میں تمہیں میدان میں اترنے کی اجازت دیتا ہوں کہ ماضی میں تمہارا ہر

---

[1] جزیرہ مالٹا اور جزیرہ روڈس شروع ہی سے مذہبی اور جنونی نائٹوں کے مرکز رہے ہیں اور ہمیشہ صلیبی جنگوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ عثمانی ترکوں نے ان کے غرور کو توڑا اور انہیں اپنے سامنے بے بس کر کے رکھ دیا۔

فیصلہ میرے لیے سود مند اور منفعت بخش رہا ہے۔"

احمد نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور میدان میں اترا۔ ہراول دستوں کے اندر خصیب اور خالد کھڑے پُر شوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان سیدار تھی جو مردانہ لباس پہن کر جنگ میں حصہ لے رہی تھی۔ احمد کو ایک وقار کے ساتھ میدان میں اترتے دیکھ کر اس کے لبوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ اور گلابی چہرے پر گہرا سکون اور بے پایاں خوشی نہاں تھی۔

مالٹا کے اس رومن نائٹ کے قریب آ کر احمد اپنے گھوڑے سے اترا اور اپنی تلوار اور ڈھال سنبھال کر وہ اس کی طرف بڑھا جب وہ اس سے نزدیک ہوا تو رومن نے کہا "کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ جنگ کی ابتدا کرنے سے قبل ہم ایک دوسرے سے اپنا حسب ونسب کہیں۔ تاکہ اگر تمہارا حسب نسب اچھا ہو تو میں تمہاری موت پر فخر کر سکوں۔ اے اجنبی! اپنے نام اور اپنے لشکر میں اپنا مقام کہو۔"

احمد نے اپنی تلوار سونتتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں تو مالٹا کا نائٹ ہے لیکن یاد رکھ اچھا نام اور مقام تو میرے اس رب کا ہے جس کے ہاتھ میں موت ہے اور هُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (اور جو اوروں کو کھلاتا ہے اور خود نہیں کھا) میرا حسب ونسب تم خود ہی اس وقت جان جاؤ گے جب میری خمدار بھاری تلوار تیری سیدھی تلوار کے حملوں کو ناکام کرتی ہوئی تجھ پر اولوں اور بارش کی طرح برسے گی۔ اپنی طاقت، قابلیت اور قوتِ ارادی پر اس قدر گھمنڈ نہ کر۔ میرا رب جو میرا قبلۂ شوق اور وجدانِ ذوق ہے میری ہمت کو بڑھائے گا۔

میرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو اخلاق و پاکیزگی کے معدن تھے ان کی پیروی کرتے ہوئے میرا رب مجھے ایسی استطاعت دے گا کہ میں اس صحرا کے اندر تجھے پچھاڑ دوں اور اس ریت کو تیرے خون سے قوس و قزح جیسا کر دوں۔ حسب ونسب کو چھوڑو اور آگے بڑھ کر مجھ پر حملہ کرو پھر دیکھو میں کیسے اپنی تلوار کی ضرب سے تمہارے افعال شنیعہ کی قطع و برید اور تمہارے جسم اور روح کے علائق و بکھیڑوں کا انقطاع کرتا ہوں۔

آگے بڑھ کر مجھ پر حملہ کرو ۔ مَیں تمہیں پہلے وار کرنے کا موقع دیتا ہوں ۔ بعد میں شاید ایسا موقع تم حاصل نہ کرسکو ۔

اس رومن نے طنزاً کہا ۔ تو ایک سادہ، بے ریا اور بھولا سا بدو ہے کیا تو میرا مقابلہ کرلے گا ۔ احمد نے اس بار سخت لہجے میں کہا ۔ ایسی باتیں کر کے میری بردباری پر نفرت کا لبادہ اور میرے نرم جذبات پر تلخی کا خول نہ چڑھاؤ ۔ مَیں تیرا مقابلہ بھی کروں گا اور تیرے لاغ ولابھ، گمان بے پرواہ اور ذہنی ارتفاع کو زیر کرکے تجھے اس ریت پر چت بھی کروں گا ۔

رومن جو اپنے آپ کو جرزانہ سمجھتا تھا اور اپنی پھرتی اور قوت کو چیتے کی کمر اور شیر کی ران سے تشبیہہ دیتا تھا احمد کی باتوں پر کھول اُٹھا اور آگے بڑھ کر اس نے زخمی اور احمق ریچھ کی طرح احمد پر لگاتار اور تابڑ توڑ حملے کرنے شروع کر دیئے تھے ۔

احمد بڑی مہارت، تیز دستی اور ہنرمندی سے اس کے وار روک رہا تھا ۔ کسی بھی موقع پر رومن اسے اپنے حملوں سے پریشان اور خوفزدہ نہ کر سکا تھا ۔ یہاں تک کہ احمد نے زور سے چلّاتے ہوئے کہا ۔ "اِسْتَعِدْ یَا سَیْفِیْ لِلْفَتْحِ الْجَدِیْد (اے میری تلوار میرے لیے ایک نئی فتح کے لیے مستعد ہو جا) احمد کا چہرہ غصّے میں لعل بدخشاں جیسا ہو گیا تھا ۔ پھر اس نے اپنی زوردار آواز میں اللہ اکبر کی تکبیر بلند کی اور رومن پر اس نے جوابی حملہ کر دیا تھا ۔ ایک انوکھی اور پُراسرار سکر دستی اور اپنی ہستی کے اسرار رموز کھول دینے والی خود فراموشی میں ڈوب کر احمد اس رومن کو اپنے تیز اور طوفانی حملوں سے دھکیلتا ہُوا دُور تک لے گیا تھا ۔ اس کے حملوں میں گھوڑوں کی ٹاپوں جیسی خوفناک دھمک اور عقابوں کی پھڑپھڑاہٹ جیسی وحشت ناکی تھی ۔

رومن پر حملہ کرتے ہوئے وہ بار بار اس دھاڑتے شیر کی طرح تکبیریں بلند کر رہا تھا جس نے جنگل کے اندر اپنے شکار کو اپنی گرفت میں کر لینے کا عہد کر لیا ہو ۔ تھوڑی دیر قبل تک فخر و گھمنڈ اور غرور گمان میں بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے اور رومن احمد کے آگے بھاگتے ہوئے اس شاعر کی طرح اُداس اور نا اُمید ہو گیا تھا ۔

جس کا قصیدہ بادلوں میں کھو گیا ہو ۔ اچانک احمد نے زوردار تکبیر بلند کی اور اس کی تلوار غیر مرئی پروں کی سرسراہٹ پیدا کرتی ہوئی رومن کے شانے پر گری تھی ۔

صحرا کے اندر فضاؤں میں رومن کی ایک ہولناک چیخ بلند ہوئی تھی ۔ اس کا بایاں شانہ پسلیوں تک احمد کی تلوار نے چیر کر رکھ دیا تھا ۔ اس کے ہاتھ سے تلوار اور ڈھال چھوٹ گئی تھی اور وہ ریت پر گر گیا تھا ۔

احمد اس کے پاس آیا اور اسے پاؤں کی ٹھوکر مارتے ہوئے پوچھا ۔ کیا میں نے اس رزم گاہ میں تیرے حسب و نسب کو خون آلود اور تیرے عز و شرف کو محدود نہیں کر دیا ۔ تو نے میری یگانہ آفاق تلوار کی کاٹ اور میرے حملہ آور ہونے کا نقطہ عروج دیکھا کیسا ہولناک اور مہیب تھا"۔

رومن نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی اور وہ ختم ہو گیا تھا ۔ احمد نے اس کی لاش اُٹھائی اپنے گھوڑے پر سوار ہُوا اور اپنے لشکر کی طرف روانہ ہو گیا تھا ۔

احمد سیدھا حسان بن نعمان کے پاس آیا اور انفرادی جنگ کی ابتدا کرنے والے اس رومن کی لاش اس کے پاؤں میں پھینکتے ہوئے کہا ۔ "سیّدی! مَیں نے اسے آپ کے قدموں میں لا پھینکنے کا آپ سے کیا ہُوا عہد پورا کر دیا ہے ۔ دشمن کے لشکر سے اب کوئی اور ایسا جوان نہ نکلے گا جو ہمیں انفرادی جنگ کی دعوت دے ۔ اس کا قتل دشمن کے لیے عبرت خیز اور سبق آموز ثابت ہو گا"۔

حسان نے تشکرانہ انداز میں احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ "احمد! احمد! تم واقعی صحرا کی آگ ہو جو بھی تم سے نبرد آزما ہو گا تنکے کی طرح خاکستر اور راکھ ہو جائے گا اس لیے کہ ————

حسان کہتے کہتے رُک گیا کیونکہ رومن اور فرانسیسی ایک ساتھ حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھنا شروع ہو گئے تھے ۔ حسان کا اشارہ پا کر احمد بھی اپنے ہراول دستوں کے سامنے جا کھڑا ہُوا تھا ۔ لشکر کا وسطی حصّہ حسان کے پاس تھا ۔ اس کے دائیں

طرف احمد اور بائیں طرف صالح تھا۔

فرانسیسی اور رومن اپنے سپہ سالار سامرہ کی سرکردگی میں مسلمانوں پر اپنی پوری قوت اور تہر مانیت سے حملہ آور ہوئے تھے لیکن حسان، احمد اور صالح نے بھی ایسا سخت جوابی حملہ کیا کہ انھوں نے نہ صرف دشمن کے حملے کو روک دیا تھا بلکہ انہیں ایک حد تک پیچھے ہٹنے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ مسلمان اپنے لڑنے کا انداز بدلنے لگے تھے۔ سامنے کی طرف سے حسان بن نعمان دشمن پر جان لیوا حملے کرتا رہا جبکہ احمد اور صالح اپنے اپنے پہلو میں ذرا آگے بڑھتے ہوئے دشمن کے لشکر کے ایک مناسب حصے کو اپنے پُر عذاب گھیراؤ میں لینے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

اچانک اسلامی لشکر میں ایک ساتھ تکبیریں بلند ہوئیں۔ پھر احمد نے دائیں طرف سے صالح نے بائیں طرف سے اور حسان نے سامنے سے اپنی پوری طاقت اور ممارست کے ساتھ جان لیوا اور رست خیز حملے شروع کر دیئے تھے۔ اگلی بیش تیس صفوں کو مجاہدین نے حسان، احمد اور صالح کی سرکردگی میں روند ڈالا تھا اور وہاں جنگ کرنے والے دشمن کی اکثر سپاہ کو انھوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

اگلی صفوں سے دشمن کے سپاہی جب بھاگ کر اور اپنی جان بچانے کی خاطر پچھلی صفوں کے اندر دیوانہ وار گھسنے لگے تو پچھلی صفوں کی ترتیب اور ضبط جاتا رہا تھا۔ اگلی صفوں سے بھاگنے والے ان سپاہیوں کی حالت بالکل ان ہاتھیوں جیسی تھی جو ہزیمت اٹھا کر اپنی ہی سپاہ کو روندنے لگے ہوں۔ اسی لمحے مسلمانوں نے پھر تکبیریں بلند کرتے ہوئے ایک ساتھ حملہ کیا اور اگلی صفوں کی اکھاڑ پچھاڑ کے علاوہ انہوں نے پچھلی صفوں کو بھی بے ترتیب اور منتشر کر دیا تھا۔

اب رومنوں اور فرانسیسیوں کو یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے سامنے وہ یہ جنگ ہار چکے ہیں لہذا وہ اپنے سالار سامرہ کو پیچھے ہی چھوڑ کر میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ حسان، احمد اور صالح اپنی پوری قوت اور برق رفتاری کے ساتھ دشمن کا تعاقب کرنے لگے۔

اسلامی لشکر کے طبیب اور ان کے ساتھ کام کرنے والے سپاہی میدان جنگ میں رک کر لڑائی میں شہید ہونے والوں کی لاشوں کو ایک جگہ جمع کرنے کے علاوہ وہ اپنے زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال بھی کرنے لگے تھے۔

صحرا کے اندر دور تک مسلمانوں نے رومنوں اور فرانسیسیوں کا تعاقب کیا تھا اور ان کی قوت کو پوری طرح کچل کر ان کے لشکر کے بڑے حصے کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ باقی بچنے والے گنتی کے سپاہی اپنی جانیں بچانے کی خاطر باجہ اور بونہ شہروں کی طرف بھاگ گئے تھے۔ ایک گمنام بدو نے دشمن کے سپہ سالار سامرہ کو بھی زندہ گرفتار کر لیا تھا۔

مسلم مجاہدین ابھی تک دشمن کا تعاقب جاری رکھے ہوئے تھے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ دشمن اب ان کے لیے بے ضرر ہو گیا ہے تو انھوں نے تعاقب بند کر دیا۔

تعاقب ترک کر کے حسان، احمد اور صالح نے جب اپنے لشکر کو ایک جگہ جمع کیا تو وہی بدو جس نے دشمن کے سپہ سالار کو زندہ گرفتار کیا تھا حسان کی خدمت میں حاضر ہوا اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "میرے آقا! یہ دشمن کے لشکر کا سپہ سالار سامرہ ہے"۔ اس بدو نے سامرہ کے گلے میں رسی ڈال رکھی تھی اور اس رسی کا ایک سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور کسی سرکش اونٹ کی طرح اسے ہانکتا ہوا لایا تھا۔

حسان نے شائستہ اور نرم لہجے میں اس سپاہی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی گردن میں بندھی ہوئی رسی کھول دو اور اسے آزاد کر دو"۔

اس بدو نے فوراً اپنے سالار کا کہنا مانتے ہوئے سامرہ کے گلے میں بندھی ہوئی رسی کھول کر علیحدہ کر لی اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ حسان اور احمد سامرہ کے قریب آئے جو ان دونوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر برف کے طوفانوں میں پھنسے ہوئے مسافر کی طرح کپکپانے اور تیز آندھی میں صحرا کے اندر تنہا کھڑے درخت کی طرح لرزنے لگا تھا۔ حسان نے گہری نگاہوں سے سامرہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اے سامرہ! تم نے اس جنگ کو کیسا پایا؟"

سامرہ نے لرزتی بکھرتی آواز میں پوچھا۔ "کیا میں جان سکوں گا کہ آپ کون

ہیں اور مسلمانوں کے لشکر میں آپ کی حیثیت کیا ہے۔"

حسان نے کہا۔ "میرا نام حسان بن نعمان ہے۔ میں لشکر کا امیر ہوں پھر اس نے احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور یہ لشکر کے نائب امیر احمد بن حشم ہیں"۔

سامرہ نے ڈری ڈری۔ سہمی سہمی اور خوفزدہ آواز میں کہا۔ مجھے یقین تھا کہ اس صحرائی جنگ میں چند لمحوں کے اندر ہی میں مسلمانوں کے لشکر کی صفیں اُلٹ کر انہیں عبرتناک شکست دوں گا لیکن مجھے مایوسی ہوئی یقیناً تلوار کے استعمال میں عرب دوسری قوموں سے بہت آگے ہیں۔ اس صحرائی جنگ میں مسلمانوں کی کارکردگی اور مناسب تنظیم ہی ان کی فتح کا باعث ہے۔ ورنہ تعداد میں میرا لشکر آپ سے کہیں زیادہ تھا"۔

حسان نے پھر پوچھا۔ "تم ہم سے کیسے سلوک کی توقع رکھتے ہوئے؟"

سامرہ نے جھٹ کہا۔ میں آپ سے بہتر اور عمدہ سلوک کی توقع رکھتا ہوں۔ میں آپ سے امان طلب کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی زندگی عزلت نشینی اور گوشہ گیری میں گزار دوں گا۔ میں مسلمانوں کے خلاف اب کسی جنگ میں حصّہ نہ لوں گا۔ یہ میرا آپ سے پختہ عہد ہے اور آپ دیکھیں گے میں اپنے عہد کو استوار اور وعدے کو قائم رکھونگا"۔

حسان نے بے پروائی سے کہا۔ "تم اگر آئندہ بھی ہمارے خلاف کسی جنگ میں حصّہ لوگے تو ہم مسلمانوں پر کوئی اثر نہ ڈال سکوگے۔ سنو! سامرہ! ہم ان کے لیے حریر و ابریشم ہیں جو ہماری طرف دوستی، یگانگت، اتحاد اور اپنائیت کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور وہ لوگ جو ہم سے دشمنی، عداوت، عناد اور سرکشی رکھیں اور ہمارے خلاف ہتھیار اُٹھائیں گے ان کے لیے ہم رست خیز صحرا کی آگ اور اپنے رب کا عذاب اور علت ہیں اے سامرہ! دِلوں کے بھید خدا ہی جانتا ہے۔ مجھے علم نہیں کہ تمہاری امان طلبی نیک نیتی پر مبنی ہے یا تم موقع شناس بن کر ان پُرعذاب لمحوں سے چھٹکارہ پانا چاہتے ہو۔ کچھ بھی ہو۔ چونکہ تم پُرامن رہنے کے علاوہ امان طلب کر رہے ہو لہٰذا میں تمہیں معاف کرتا ہوں او جانے کی اجازت دیتا ہوں"۔

حسان نے قریب ہی کھڑے اپنے ایک سالار کو گھوڑا لانے کے لیے کہا اور اس

قریب ہی سے ایک گھوڑا پکڑ کر حسان کے سامنے لا کھڑا کیا۔ حسان نے اس گھوڑے کی سامرہ کو تھماتے ہوئے کہا۔ "سامرہ! سامرہ! یہ گھوڑا سواری کے لیے میں تمہیں اپنے سے دیتا ہوں۔ جاؤ یہاں سے چلے جاؤ اور سنو! جب تم واپس جاؤ تو اپنی قوم جا کر کہنا کہ ان صحراؤں کے اندر اگر ہمارے خلاف پھر کوئی جنگ برپا کی گئی تو واللہ ہم باجہ ہونہ ہی نہیں بحرہ محیط تک دشمن کے ہر اس شہر کو زمین بوس کر دیں گے جس سے ہمیں اپنے اف نفرت اور عناد کی بو آئی"۔

سامرہ کے چہرے پر اطمینان اور سکون کے گہرے نقوش بکھر گئے تھے۔ آگے بڑھ کر پہلے اس نے حسان اور احمد سے مصافحہ کیا پھر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور حسان طرف دیکھتے ہوئے کہا "قسم ہے مجھے مسیح و مریم کی آپ لوگ اخلاق و کردار میں ہم سے ہیں اعلیٰ و ارفع ہیں اور ہمارا لشکر اگر کسی مسلمان سالار کو گرفتار کرتا تو کبھی بھی اس سے ایسی مہربانی اور شفقت کا سلوک نہ کرتا۔ میں آپ کے اس احسان کا شکر مند اور اپنے رویّے پر نادم ہوں۔ اس کے ساتھ ہی سامرہ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر شمال مغرب کے رخ پر سرپٹ دوڑا دیا تھا۔

سامرہ کے چلے جانے پر احمد نے حسان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب جبکہ ہم ملکہ جرارہ پر قابو پانے کے علاوہ تمام صحرائی قوتوں کو مغلوب کر چکے ہیں آپ کا آئندہ لائحہ عمل کیا ہوگا"۔

حسان نے اپنے قریب کھڑے صالح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں دو ایک روز تک لشکر کی کمان صالح کے سپرد کرنے کے بعد دمشق کی طرف روانہ ہو جاؤں گا، خلیفہ عبدالملک بن مروان کا میرے متعلق یہی حکم ہے"۔

احمد نے اُداس لہجے اور پریشان آواز میں کہا تو پھر میں آپ سے پہلے ہی یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔ آپ جانتے ہیں میرے ذمے کس قدر کام ہیں۔ میں نے اپنے ماں باپ کے پاس جانے کے علاوہ ابھی امین کو بھی تلاش کرنا ہے"۔

حسان نے خوش طبعی سے کہا۔ "میں بخوشی تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں۔

احمد! احمد! ان صحراؤں کے اندر دشمن کو زیر کرنے اور اپنا حوصلہ بلند رکھنے میں تم نے میرے ساتھ جو تعاون اور اتحاد کیا ہے۔ بخدا میں اسے زندگی بھر نہ بھلا سکوں گا۔ شاید ایسے حالات پیدا ہوں کہ زندگی کے کسی موڑ پر ہم پھر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے پُرجوش مصافحہ کر رہے ہوں۔ اب جب کہ ہمارے سامنے کوئی مہم درپیش نہیں ہے تمہیں اپنے ذاتی کام نمٹا لینے چاہئیں لیکن سنو! احمد! تم لشکر کے نائب امیر ہو اس لیے فراغت پا کر تمہیں لشکر میں واپس آنا چاہیے۔"

احمد نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "میں ضرور واپس آؤں گا اور پہلے کی طرح اپنی قوم کی خدمت کرتا رہوں گا۔"

حسان نے ہلکے ہلکے مسکراتے ہوئے کہا "اے عزیزِ جاں! مجھے تم سے ایسی ہی توقع تھی۔"

احمد نے اس بار صالح کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس دوران میں آپ کا لائحہ عمل کیا ہوگا۔"

صالح آگے بڑھا اور بڑی چاہت سے احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے ذمے دو کام رہ جائیں گے۔ ایک تو میں بڑی بے تابی سے آپ کی واپسی کا انتظار کروں گا۔ دوسرے میں قیران کے تباہ حال شہر کو جس کی بنیاد ہمارے عظیم جرنیل عقبہ بن نافع نے رکھی تھی دوبارہ آباد کر کے اسے پُر رونق بناؤں گا۔"

صالح دیر رکا پھر وہ بڑی رقت میں کہہ رہا تھا "احمد! احمد! تم اپنے کام نمٹا کر جلدی لوٹ آنا۔ بخدا اس صحرا کے اندر ہر روز ریت کے ٹیلوں پر کھڑے ہو کر میں تمہاری واپسی کا انتظار کرتا رہوں گا۔"

احمد نے صالح کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت اور پُرجوش عقیدت میں دباتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو مایوس اور آپ کے انتظار کو طویل نہ کروں گا۔ میں بہت جلد لوٹنے کی کوشش کروں گا۔"

احمد جب اپنی بات مکمل کر چکا تو حسان بن نعمان نے کوچ کا حکم دیا اور

لشکر صحرا کے اندر اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا واپس اس میدان کی طرف جا رہا تھا جہاں ساسرہ کے لشکر سے جنگ ہوئی تھی۔



لشکر جب اس جگہ واپس آیا جہاں دشمن سے ہاتھ آنے والے مالِ غنیمت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور ایک طرف لشکر کا ایک حصہ جنگ میں کام آنے والوں کی تجہیز و تکفین کے بعد زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ خالد بن یزید بھاگتا ہوا احمد کے پاس آیا اور بوکھلائی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔ "اے امیر! جلدی کیجیے میرے ساتھ آئیے۔ سیدار جنگ میں زخمی ہو چکی ہے اور آپ کو یاد کر رہی ہے۔ میں اس کی خاطر یہیں رہ گیا تھا اور دشمن کے تعاقب میں حصہ نہ لیا تھا۔"

احمد اپنے گھوڑے سے اترا اور بھاگتا ہوا خالد بن یزید کے ساتھ ہو لیا تھا۔ دونوں ریت کے اس ٹیلے کے پاس آئے جہاں سیدار خون میں نہائی پڑی تھی اور ایک طبیب اس کے پاس بیٹھا اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ سیدار کی حالت قابلِ رحم تھی اس کا حسین چہرہ، سنہری بال اور لباس سب خون سے تر تھے۔ احمد اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا سر اپنی گود میں لیتے ہوئے اس نے پکارا "سیدار! سیدار! میں احمد ہوں"۔

سیدار نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں۔ احمد کو دیکھ کر اس کے لبوں پر ہلکی اور خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اس نے نقاہت سے بھرپور باریک اور درماندہ سی آواز میں کہا "احمد! احمد! میری زندگی کا تار و پود بکھر چکا ہے اور قریب ہے سانس کی یہ ڈوری بھی ٹوٹ جائے گی۔ احمد! احمد! میں نہیں جانتی تھی کہ میں کون تھی۔ میں اپنی ابتدا اور انتہا سے بھی واقف نہ تھی۔ میری حالت اس مسافر جیسی تھی جسے تشنہ لب اور برہنہ پا ویرانوں اور دیولاخوں میں چھوڑ دیا گیا ہو لیکن آپ کو حاصل کرنے کے بعد میں اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کرنے لگی تھی۔ یہ مرنا میرے لیے اب تکلیف دہ نہیں ہے۔ یہ احساس ہی میرے لیے اطمینان اور سکون کا باعث ہے کہ میں آپ جیسے شیر دل اور پُرخلوص مجاہد کی منسوبہ کی حیثیت سے جان

دے رہی ہوں۔ گو میں اس مذہب میں تازہ وارد ہوئی تھی پھر بھی بخدا میں اس مذہب کہ میں اپنے مذہب اور اپنی ملت کے لیے دشمن کے خلاف جنگ کرتے ہوئے جان دے رہی ہوں۔ میرا رب میرے ماضی کے گناہوں اور عصیانوں کو معاف کرے اور مجھے ——

سیدار کہتے کہتے رُک گئی۔ طبیب نے گھبرا کر اس کی نبض پہ ہاتھ رکھا۔ پھر اس نے اپنی گردن جھکاتے ہوئے پریشان اور دکھ بھری آواز میں احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یا امیر! مجھے افسوس ہے' خاتون دم توڑ چکی ہے۔ ضبط کرنے کے باوجود احمد کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر سیدار کے چہرے پر گرنے لگے تھے۔ قریب ہی بیٹھا خالد بن یزید بچوں کی طرح ہچکیاں اور سسکیاں لے لے کر رونے لگا تھا۔ جلد ہی احمد نے اپنے آپ کو سنبھالا اور خالد کا شانہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

"خالد! خالد! آؤ دونوں مل کر اس سامنے والے پہاڑ کے اوپر اسے دفن کر کے اس کی قبر بنا دیں تاکہ جب بھی میں ادھر سے گزروں اس کی قبر پہ فاتحہ کہوں اور اس کی یادوں کو تازہ رکھوں۔ خدا کی قسم یہ سرابوں کے پیچھے بھاگنے والی ایک تشنہ لب لڑکی تھی جس نے کنوئیں کے قریب آ کر پیاس کی حالت میں دم توڑ دیا ہے۔"

احمد نے سیدار کو اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا اور خالد کے ساتھ وہ ایک کوہستانی ٹیلے کی طرف چند قدم ہی بڑھا تھا کہ ایک سپاہی بھاگتا ہوا احمد کے پاس آیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔ "اے امیر! آپ کے ہراول دستوں کا ایک سپاہی جس کا نام خصیب بن حشم ہے جنگ میں بُری طرح زخمی ہوا ہے۔ وہ آپ کو یاد کر رہا ہے۔"

احمد کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ قبل اس کے وہ کچھ کہتا۔ خالد نے سیدار کی لاش کو اس سے لیتے ہوئے کہا۔ "یا امیر! میں سیدار کو سنبھالنے میں ایسا محو رہا کہ مجھے خصیب کے متعلق سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ میں سیدار کی لاش کو لے کر اس سامنے والے ٹیلے کی طرف جاتا ہوں آپ خصیب کی خبر گیری کر آئیں۔"

احمد بھاگتا ہوا اس سپاہی کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں اس طرف آئے جہاں لشکر

کے طبیب اپنے زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ احمد نے دیکھا اس کا چھوٹا بھائی خصیب خون آلود ریت پر بے سُدھ سی حالت میں چت پڑا تھا۔ احمد وہاں بیٹھ گیا اور خصیب کو اُٹھا کر اپنی گود میں لیتے ہوئے اس نے جب اسے پکارنا چاہا تو خصیب نے خود ہی آنکھیں کھولتے ہوئے حیرت و استعجاب میں کہا۔ "یا امیر! آپ؟ کاش جو کچھ آپ نے کہا تھا سچ ہو جاتا۔ کاش وہ یہاں ہوتا اس جنگ میں حصہ لیتا اور مرنے سے قبل میں ایک بار اسے دیکھ لیتا۔ آہ کیسی بدنصیبی ہے میں مر رہا ہوں اور میرا بھائی یہاں نہیں کون اسے خبر کرے گا کہ اس کا چھوٹا بھائی جسے وہ بچپن میں خوب عزیز رکھتا تھا اور اپنے شانوں پر بٹھاتا تھا اس کی آمد کے انتظار میں ایک بے بس اور مجبور مسافر کی طرح موت کا سامنا کر رہا ہے۔ اے امیر! وہ کہاں ہے، ہائے حیف کس قدر جان لیوا اس کا انتظار تھا۔ خدا کی قسم کی جدائی اور مفارقت کا گھاؤ موت کے اس گہرے اور بھیانک زخم سے زیادہ تکلیف دہ اور ہولناک ہے۔ نہ جانے کون سا امر ہے جو ہمارے بھائی کو ہماری طرف سے مانع ہے۔ خبر نہیں وہ کون سی ماورائی دیوار ہے جو ہمارے درمیان حائل ہے۔ کاش میرے پاس کوئی نامہ بر ہوتا جو اس تک میرا پیغام پہنچاتا کہ اس کا بھائی شفق خون شہیداں میں غروب ہو رہا ہے ——

خصیب کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ کیونکہ اس نے دیکھا احمد کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیوں کو اپنے گلے میں دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

خصیب نے پریشان اور کراہتی آواز میں پوچھا۔ "یا امیر! آپ کی آنکھوں میں اس قدر آنسو؟"

احمد نے اور زور سے خصیب کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے روتی اور کپکپاتی آواز میں کہا۔ "خصیب! خصیب! میرے عزیز بھائی! میں تیرا امیر نہیں تیرا بھائی ہوں میں ہی احمد ہوں۔ ہاں میں ہی احمد بن حشم ہوں۔ میں وہی احمد ہوں جو وادیٔ شعیب میں تم لوگوں سے جدا کر دیا گیا تھا۔ میں ہی احمد ہوں جو بچپن میں تمہارے اور شیبان کے

ساتھ مَا اَجْمَلُ الضِّيَاءُ (روشنی کیسی خوب صورت ہے) مَا اَحْسَنُ الحَيَاءُ (حیا کیسی نفیس ہے) کا گیت گایا کرتا تھا۔ خصیب! خصیب! میرے بھائی میں وہی احمد ہوں جس نے وادئ شعیب سے اپنے اغوا کے روز شام کے وقت تمہارے لیے جبلِ موسیٰ پر وادئ طوی کو جاتے ہوئے پرندے شکار کیے تھے۔

خصیب نے اپنی لحظہ بہ لحظہ ختم ہوتی قوت کو جمع کیا اور احمد سے لپٹتے ہوئے اس نے سسک سسک کر کہا۔ "اخی! اخی! آپ کیوں مجھ سے اپنا آپ چھپاتے رہے آپ گھر ماں باپ کے پاس بھی گئے اور کیسے سنگدلوں اور اجنبیوں کی طرح شیبان اور طروب کی شادی میں شرکت کے بعد وہاں سے کوچ کر گئے۔ اے میرے بھائی کیوں آپ اپنا آپ ہم پر ظاہر کرنے سے گریز کرتے رہے۔"

احمد نے خصیب کے چہرے پر نمودار ہونے والے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس وقت خبر ہوئی تھی تم میرے بھائی خصیب ہو جس وقت قرطاجنہ سے باہر کوہستانی غار میں میری تم سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں اسی وقت تم پر اپنا آپ ظاہر کر دیتا لیکن تم نے گھر کے حالات بتاتے ہوئے جب یہ انکشاف کیا کہ شیبان اور طروب ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو میں نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا۔ میں نے اپنے سارے ارادوں پر مہر لگا دی۔ میں نے اپنے ماضی کی صداؤں کے سامنے اپنے کانوں کو بند کر لیا تھا۔"

احمد ذرا رکا اور دوبارہ وہ کہہ رہا تھا۔ "خصیب! خصیب! گو طروب بچپن سے میری منسوبہ تھی اور میں اس پر حق رکھتا تھا لیکن میں اپنے بھائی کے خاطر اس حق سے دست بردار ہو گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو گمنام رکھ کر ہی شیبان اور طروب کی خوشی کا باعث بننا چاہتا تھا۔ میں جب ان دونوں کی شادی پر تمہارے ساتھ گھر گیا تھا تو اپنے ماں باپ کی حالت دیکھ کر میرا جی چاہتا تھا زندہ زمین میں دفن ہو جاؤں یا دھوئیں کی طرح فضاؤں میں تحلیل ہو جاؤں لیکن میں نے سب کچھ برداشت کیا۔ خدا کی قسم اپنے گھر میں قیام کے دوران میں بستر میں منہ دبا کر ساری رات روتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ

بردہ فروشوں نے اور انھوں نے جن کے پاس میں بحیثیت غلام کے فروخت کر دیا گیا تھا میرا چہرہ جلا کر ایسا مایوس کن بنا دیا تھا کہ میں اس خیال سے بھی اپنا آپ چھپاتا رہا کہ میرے گھر والوں کو مجھے دیکھ کر مایوسی ہو گی۔"

انتہائی تکلیف دہ حالت میں اور بڑی بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے خصیب نے کہا۔ "اے میرے بھائی! خدا کی قسم آپ ہمت و شجاعت میں ہی یگانۂ آفاق نہیں کردار و عظمت میں کوہساروں سے بھی بلند تر ہیں۔ آپ گھر جائیں ماں اور بابا بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ واللہ! میں خوش بخت اور نیک قسمت ہوں کہ میں اپنے بھائی کی گود میں اپنے آخری سانس لے رہا ہوں۔ اے اخی! خدا آپ کو فکر و فاقہ سے دور اور آپ کی ہمت کو ارتفاع اور آپ کی شجاعت و جوانمردی کو ارتفاع پذیر رکھے۔ مجھے آپ جیسے بھائی پر فخر و ناز ہے۔ آج جس وقت آپ انفرادی جنگ میں ایک قہر آلود طوفان اور ہر شے کو جڑوں سے اکھیڑ دینے والی آندھی کی طرح اپنے مقابل پر غالب آ رہے تھے تو میں نے اپنے رب کے حضور رو رو کر اور گڑ گڑا کر یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ کاش آج میرا بھائی بھی اس لشکر میں شامل ہوتا اور وہ بھی ایسی ہی ممارست اور جواں ہمتی کا مظاہرہ کرتا۔ خدا نے میری آنسوؤں اور آہوں میں ڈوبی ہوئی یہ دعا قبول کر لی اور میرے بھائی کو مجھ سے ملا دیا۔ میرے بھائی! تم زندہ اور خوش رہو صدیوں تک۔"

خصیب خاموش ہو گیا اور اس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ احمد نے گھبرا کر اس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔

خصیب زلیست کی جنگ اور مصافِ زندگی ہار چکا تھا۔ احمد نے شفقت اور چاہت میں اپنا گال خصیب کے گال پر رگڑتے ہوئے کہا۔ "ہائے بدنصیبی کیا سیدار اور میرے عزیز بھائی نے میری ہی گود میں دم توڑنا تھا کاش میں ——"

احمد کہتے کہتے رک گیا کیونکہ اس کی گردن پر کسی کے آنسو گر رہے تھے۔ احمد نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ حسان بن نعمان اس کے پیچھے کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو احمد کی گردن پر گر رہے تھے۔ اس کے پہلو میں صالح کھڑا اپنی آنکھیں خشک کر

رہا تھا۔ احمد ان دونوں کو دیکھتا رہ گیا۔

حسان نے احمد کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے مجروح آواز اور دُکھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "احمد! احمد! میرے بھائی! میں سب کچھ سُن چکا ہوں۔ صبر کرو۔ قدرت کے گماشتے تمہاری لوحِ تقدیر پر ایسی ہی نوشت ثبت کر چکے تھے۔

حسان اور صالح نے احمد کو سہارا دے کر اٹھایا پھر خصیب کی لاش کو اس ٹیلے پر لے جایا گیا۔ جہاں خالد سیدار کی لاش لیے بیٹھا تھا۔ دونوں کو اس ٹیلے پر دفن کر دیا گیا تھا۔ احمد نے کوہستانوں کے اندر جنگلی پھول چُن کر دونوں کی قبروں پر پھیلا کر فاتحہ کہی پھر حسان اور صالح اسے واپس لشکر گاہ کی طرف لے جا رہے تھے۔





شام کے وقت زیوس، ارتمیس، ہرمس اور طبرق کی بہن ثمار یوڑ کی بکریوں کو باڑے میں بند کرنے کے بعد ان کا دودھ دوھ رہے تھے کہ ثمار نے خوشی اور مسرت میں چلاتے ہوئے کہا "ارتمیس! ارتمیس! دروازے کی طرف دیکھو کون آیا ہے اور اپنے باپ اور بھائی کے قریب ہی کھڑی ارتمیس جب مڑی تو اس نے دیکھا احمد اپنے گھوڑے کی باگ تھامے گھر میں داخل ہوا تھا اور اب وہ باڑے کی طرف ہی آ رہا تھا۔

ارتمیس فوراً باڑے سے نکلی اور کسی ہرنی کی طرح پھلانگتی ہوئی وہ احمد کی طرف بڑھی اور اس سے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے اس نے پورے ترنم اور رس سے پوچھا "آپ کیسے ہیں؟"

احمد نے زخمی سی آواز میں کہا "ٹھیک ہوں"۔

احمد کو اداس اور افسردہ دیکھ کر ارتمیس بیچاری اس شمع کی طرح بجھ کر اداس اور ملول ہو گئی تھی جیسے جلا کر ویرانوں اور طوفانوں میں رکھ دیا جائے۔ وہ کچھ پوچھنا

چاہتی تھی کہ زیوس اور ہرمس باڑے سے نکلے اور احمد سے مصافحہ کرنے لگے تھے۔ اس دوران ارتمیس نے گھوڑے کو باڑے میں باندھ کر اس کے آگے چارہ ڈال دیا تھا اور دوبارہ وہ احمد کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔ قریب آکر وہ احمد سے اس کے رنجیدہ اور غمگین ہونے کی وجہ پوچھنا چاہتی تھی کہ زیوس اس کا ہاتھ تھام کر کمرے کی طرف لے گیا تھا۔ ارتمیس، ہرمس اور ثما ان تینوں کے پیچھے پیچھے تھے۔

کمرے میں آکر نشست پر بیٹھتے ہوئے احمد نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اس نے زیوس سے پوچھا۔ "طرق کہاں ہے، وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا"

زیوس نے دکھ سے کہا "مجھے افسوس ہے۔ اب تم طرق سے کبھی نہ مل سکو گے"۔

احمد نے پریشانی میں پوچھا "کہاں گیا وہ؟"

پیار اور شفقت سے احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے زیوس نے کہا۔ تمہارے یہاں سے رخصت ہونے سے چند ہی روز بعد وہ بیمار ہو گیا۔ میں نے اس کا بڑا علاج کرایا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ ایک روز شام کے وقت وہ دم توڑ گیا اور میں نے اس کی تدفین کا انتظام کر دیا۔ اس کا علاج کرنے والے طبیب کا کہنا تھا کہ اس نے کوئی آہستہ آہستہ عمل کرنے والا زہر کھا لیا تھا جو اس کی جان لے گیا"۔

زیوس جب خاموش ہوا تو ارتمیس نے اپنے شوہر کو مخاطب کر کے اس کے رنجیدہ خاطر ہونے کی وجہ پوچھنا چاہی۔ لیکن اس سے قبل ہی ثما نے احمد کو مخاطب کر کے پوچھا۔ "اے میرے بھائی! کیا میں آپ کو ایک وعدہ یاد دلا سکتی ہوں"۔

احمد نے نرم اور بردبار سے لہجے میں کہا "بلا جھجک کہو، اگر وہ میرے بس میں ہوا تو میں اسے ضرور پورا کروں گا"۔

ثما بے چاری ذرا سا ٹھٹکی پھر اس نے بلا تامل کہہ دیا "آپ نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہارا بیاہ اپنے چھوٹے بھائی خصیب سے کر دوں گا اور یہاں سے رخصت ہوتے وقت آپ نے اسے اپنے ساتھ لانے کا وعدہ کیا تھا لیکن آپ اکیلے آگئے ہیں اسے ساتھ کیوں

نہیں لائے۔ آپ جانتے ہیں میں آپ کی یہاں سے روانگی سے قبل ہی مسلمان ہو چکی تھی گو میں نے آج تک خصیب کو نہیں دیکھا پھر بھی میں اسے اپنی اُمیدوں کا مرکز اور اپنی زندگی کا محور بنا چکی تھی۔ احمد بھائی! بتائیے وہ کہاں ہے اور آپ اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے"؟

خصیب کی یاد آنے پر احمد کی حالت بری ہو گئی تھی۔ اس کی گردن جھک گئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کے دامن پر گرنے لگے تھے اور اپنی ہچکیوں کو گلے میں ہی دبا لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

احمد کی یہ حالت دیکھ کر ارتمیس پر ایک جنون ساطاری ہو گیا تھا اس نے فوراً احمد کا بازو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے۔ آپ روتے کیوں ہیں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی آپ گم گم اور برداشتہ خاطر تھے۔ میں پوچھنا چاہتی تھی لیکن بابا آپ کو پکڑ کر اندر لے آئے۔ بتائیے کیا بات ہے۔ آپ کیوں روتے ہیں؟ خصیب بھائی کہاں ہے؟"

احمد نے اپنے آنسو پونچھتے اور گہری سسکی لیتے ہوئے کہا۔ "آہ میرا بھائی! اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔ وہ رومنوں اور فرانسیسیوں کے ساتھ ایک جنگ میں کام آچکا ہے۔ ہائے حیف! میں نے اسے اس وقت بتایا کہ میں اس کا بڑا بھائی احمد ہوں جب وہ خون میں ڈوبا ہوا کوہستان اور اس کے پاس میری گود میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا تھا۔ کاش میں اس کی حفاظت کر سکتا۔ کاش میں اسے پہلے ہی بتا دیتا کہ میں ہی اس کا وہ بدنصیب بھائی ہوں جو جبل سینا سے اغوا ہو کر کوہستانِ اطلس کے قزاقوں میں ایک غلام کی سی زندگی بسر کرتا رہا۔ ہائے میری بدنصیبی! میرا چہرہ داغا ہونے کی وجہ سے میرے ماں باپ اور بھائی مجھے پہچان بھی نہ سکے۔ حالانکہ میں اُن سے ملتا رہا۔

ارتمیس یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکی اور اپنے باپ زیوس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ زیوس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری

تھے اور وہ ارتمیس کی پیٹھ پر بار بار شفقت سے ہاتھ پھیر پھیر کر اسے تسلّی دینے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ ثما بھی سسکیوں میں رو رہی تھی۔ ہرمس نے گردن جھکا رکھی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

کافی دیر تک وہ پانچوں اسی حالت میں پڑے رہے۔ آخر زیوس نے سب کو تسلّی دے کر پرسکون کیا۔ پھر اس کے کہنے پر احمد انہیں ملکہ جرارہ کے قتل، بربروں کی شکست اور صحرائے اور اس کے اندر رومنوں اور فرانسیسیوں کی عبرت خیز ہزیمت کے حالات سنا رہا تھا۔

جب وہ خاموش ہوا تو زیوس نے پوچھا "اب تمہارا کیا ارادہ ہے بیٹے! یہاں سے واپس لشکر میں جاؤ گے یا ——"

احمد نے فوراً زیوس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "گو حسان بن نعمان لشکر کا نظم و نسق ایک جرنیل صالح کے حوالے کر کے واپس دمشق چلا جائے گا کیونکہ خلیفہ نے ایسے ہی احکام جاری کیے ہیں لیکن میری حیثیت لشکر میں ایک نائب امیر کے طور پر بحال رکھی ہے اس لیے لشکر میں واپس جانا میرا فرض ہے۔"

ارتمیس نے بیتاب ہو کر کہا۔ "آپ کب یہاں سے واپس جائیں گے"

احمد نے پہلی بار ارتمیس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "لشکر میں واپس جانے سے قبل میں مصر کی طرف اپنے گھر جاؤں گا۔ اپنے ماں باپ اور بھائی سے ملوں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ میں ہی ان کا وہ بیٹا ہوں جو بچپن میں ان سے جدا کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں لشکر میں واپس آؤں گا لیکن یہاں روانگی سے قبل میں ثما کے متعلق بھی ایک فیصلہ کرنا چاہتا ہوں"۔

زیوس نے پوچھا "کیسا فیصلہ؟"

احمد نے کہا "میں چاہتا ہوں ثما اسی گھر میں رہے اور اسے ہرمس کی زوجیت میں دے دیا جائے۔ آپ کو اس معاملے میں کوئی اعتراض ہے"؟

زیوس نے بلا تامل کہا "ہرگز نہیں، میں ہرمس کے لیے ثما کو دل و جان سے قبول کرتا ہوں"۔ اس موقع پر ہرمس اور ثما دونوں کی گردنیں جھک گئی تھیں۔

احمد نے ثما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ثما! ثما! کیا تم اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتی ہو؟" ثما خاموش رہی اور اس کی سانسیں تیز ہو گئی تھیں۔

احمد نے کسی قدر مسکراتے ہوئے کہا "کیا میں یہ سمجھ لوں کہ السکوت کالاقرار (خاموشی کا نام رضامندی ہے)" ثما کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور احمد نے کہا "آج اور ابھی تم دونوں کا نکاح ہوگا"۔ ثما اٹھی اور بھاگتی ہوئی باہر نکلنے لگی تھی کہ ارتمیس نے اسے پکڑ کر پھر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

زیوس نے اپنے پہلو میں بیٹھے احمد کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "احمد! احمد! بیٹے! میرے ذہن میں ایک تجویز ہے شاید وہ تمہارے لیے بہتر ہی ثابت ہو۔ اگر تم مناسب سمجھو تو میں کہوں"

احمد نے بڑی انکساری سے کہا "آپ میرا عندیہ کیوں لیتے ہیں، بلا تامل کہیے"

زیوس نے کہا "بیٹے! جیسا کہ تم نے کہا تھا کہ تمہارا خاندان یمن سے ہجرت کر کے مصر میں آ کر آباد ہو گیا ہے۔ اس لیے اس سرزمین میں ان کی ذہنی وابستگی کی کوئی شے نہیں۔ میرا مطلب ہے نہ وہاں تمہارے آباؤ اجداد کی قبریں ہیں اور نہ ماضی کی یادوں کی کوئی تڑپ۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم گھر جاؤ اور اپنے اہل خاندان کو لے کر یہاں آ جاؤ اور مستقل یہیں آباد ہو جاؤ۔ یہاں زراعتی زمین کی کمی نہیں۔ ہمارے بائیں بازو میں جو جگہ خالی پڑی ہے اس میں تم لوگوں کے لیے ایک مکان بھی تعمیر کر لیں گے اور پھر تم نے کہا تھا تمہارا چھوٹا بھائی شیبان اور باپ دونوں مل کر کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔ میں ان کے لیے جس قدر وہ چاہیں مزروعہ زمین اور پانی کا بندوبست کر دوں گا اور مصر کی نسبت وہ یہاں خوشحال زندگی بسر کر سکیں گے۔

اگر تم لشکر کو چھوڑ چکے ہوتے تو شاید میں یہ تجویز پیش نہ کرتا۔ اب جب کہ تم اپنے لشکر میں نائب امیر کی حیثیت سے شامل رہنا چاہتے ہو تو بجائے اس کے تم ماں باپ سے مل کر پھر ان دور دراز سرزمینوں کی طرف آؤ بہتر ہے تم انہیں بھی اپنے ساتھ لے آؤ۔ وہ یہاں رہیں جبکہ تمہارے لشکر کا قیام قیروان میں ہوگا۔

جو یہاں سے دُور نہیں ہے اور تم اندھیرے سویرے جب چاہو یہاں آکر اپنے ماں باپ سے مل سکتے ہو اور پھر ابھی ہم نے ایمن کی تلاش اور اسے ڈھونڈ نکالنے کی مہم شروع کرنی ہے۔ تمہارے خاندان کے یہاں ہوتے ہوئے تم اس مہم کو بہتر طور پر اور سکون کے ساتھ جاری رکھ سکتے ہو۔ میں گو ارتمیس کا باپ ہوں پھر بھی چاہوں گا کہ ایمن کو فوراً تلاش کیا جائے کہ وہ ارتمیس کی نسبت تمہاری زیادہ حق دار ہے۔

احمد نے رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ آپ کی تجویز نہایت عمدہ اور مناسب ہے۔ اگر میرے ماں باپ مان گئے تو میں انہیں ضرور اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔ ویسے ہمیں آج تک زمین کے کسی خاص ٹکڑے سے ذہنی وابستگی نہیں رہی اس لیے کہ ہم خانہ بدوش ہیں اور میرا قبیلہ رزق کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ خیمے نصب کرنے کا عادی تھا۔

احمد جب خاموش ہوا تو ارتمیس نے جھٹ پوچھ لیا۔" مصر کی طرف میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی نا؟"

احمد نے کہا" تمہاری مرضی ہے، چاہو تو یہیں رکو، چاہو تو میرے ساتھ چلی چلو"۔ ارتمیس نے فوراً کہا، میں آپ کے ساتھ جاؤں گی"۔

زیوس نے پیار سے ارتمیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" تم کیا کرو گی جا کر بیٹی! احمد نے لوٹ تو آنا ہی ہے پھر تمہارے جانے سے کیا فائدہ"۔

ارتمیس نے بچوں کی سی ضد کرتے ہوئے کہا۔" کیوں؛ میں ضرور ساتھ جاؤں گی۔ اگر ان کے ماں باپ یہاں آنے پر رضا مند ہو گئے تو بہتر ورنہ میں وہیں ان کے پاس رہوں گی۔ ان کی خدمت کروں گی ان کی دیکھ بھال کروں گی"۔

زیوس نے مسکراتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔" ارتمیس! ارتمیس! اب تم بہت دانشمند ہو گئی ہو۔ تم ضرور ساتھ جاؤ گی بیٹی! تمہارا اصل گھر تو وہی ہے۔ یہ گھر تو اب ثما کا ہے۔ سنو بیٹی! اب جب کہ سارے معاملات طے ہو گئے ہیں تم اور ثما اُٹھو اور دونوں بہنیں کھانے کا بندوبست کرو۔ ارتمیس اور ثما اُٹھ کر باہر نکل گئی تھیں۔

احمد زیوس اور ہرمس وہیں بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے تھے۔



احمد نے آٹھ روز وہاں ارتمیس کے ساتھ قیام کیا۔ اس دوران ہرمس اور ثما کی شادی کر دی گئی تھی اور نویں روز احمد اور ارتمیس صبح ہی صبح وہاں سے کوچ کر گئے تھے دونوں میاں بیوی جلد سے جلد مصر پہنچنے کے لیے اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے جا رہے تھے۔ لبنس اور باغیر کے راستے منزل پر منزل مارتے ہوئے وہ برقہ شہر میں داخل ہوئے۔ یہاں انہوں نے دو روز ایک سرائے میں قیام کیا اور دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ جب وہ برقہ شہر سے بیس پچیس میل مشرق کی طرف گئے تو صحرا کے اندر ایک مہیب اور خوفناک طوفان اُٹھا۔ یوں لگتا تھا کہ قدرت کے طاقتور عناصر نے سارے صحرا کی ریت کو اُٹھا کر فضاؤں میں اُچھال دیا ہو۔ چاروں طرف ہوا میں اُڑتے ریت کے ذرّوں کی چادر تن گئی تھی۔

طوفان کے باعث وہ دونوں اپنی اصل راہ سے بھٹک گئے تھے۔ طوفان زیادہ تندی اختیار کر گیا تو احمد نے چلاتے ہوئے کہا۔" ارتمیس! ارتمیس! اپنے گھوڑے سے نیچے اُتر جاؤ لیکن گھوڑے کی باگ مضبوطی سے پکڑے رکھو"۔

ارتمیس فوراً چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اُتر گئی اور اس کی باگ پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ احمد بھی اپنے گھوڑے سے چھلانگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ تیز طوفان اور ریت کے ٹوٹتے ٹیلوں کی وجہ سے صحرا کے اندر بھیانک اور ہولناک آواز سے گھوڑے بے چین ہونے لگے تھے۔

احمد نے پہلے جلدی جلدی دونوں گھوڑوں کی باگیں آپس میں باندھ دی تھیں۔ پھر وہ زین سے بندھا ہوا اپنا بستر کھولنے لگا تھا۔ ارتمیس نے آگے بڑھ کر احمد کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پیار سے کہا۔" آپ مجھے بتائیں نا کیا کرنا ہے"۔

احمد نے کہا" ٹھہرو! ٹھہرو! ارتمیس! یہ طوفان انتہائی خطرناک اور تند ہے تم نے سُنا نہیں ریت کے ٹیلے کیسی بھیانک آوازوں کے ساتھ ٹوٹ رہے ہیں

گھوڑے سہمے جا رہے ہیں۔ اگر یہ بدک کر بھاگ گئے تو ہم دونوں میاں بیوی اس صحرا کے اندر بھٹک کر ختم ہو جائیں گے۔"

احمد نے جلدی جلدی بستر کھول کر چار چادریں نکالیں۔ ایک اس نے پھیلا کر ارتمیس پر ڈالتے ہوئے کہا۔" اس سے اپنا سر، چہرہ اور آنکھیں ڈھانپ لو ورنہ ایسے طوفان آنکھوں کی بینائی زائل کر دیتے ہیں۔ دوسری چادر ارتمیس نے احمد سے لے کر اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔" آپ میرا ہی اس قدر خیال رکھ رہے ہیں اپنا آپ بھی تو چادر سے ڈھانپیں"۔

احمد نے چادر اپنے اوپر اچھی طرح لپیٹ لی اور پھر اس نے بچنے والی دو چادروں سے دونوں گھوڑوں کی آنکھیں کس کر باندھ دی تھیں۔ ارتمیس نے پریشان اور استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔" آپ نے گھوڑوں کی آنکھیں بالکل ہی کس کر باندھ دی ہیں۔ اب یہ آگے کیسے بڑھیں گے۔"

احمد نے دونوں گھوڑوں کی پیشانیوں پر پیار سے اپنے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" ارتمیس! ارتمیس! گھوڑوں کی آنکھیں اس طرح باندھ دینے سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو طوفان میں اڑتے ریت کے ذرّوں سے ان کی آنکھیں محفوظ رہیں گی دوسرے اب یہ بدک کر بھاگنے کی بھی کوشش نہ کریں گے۔"

ارتمیس نے پیار سے احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" گو میں بھی ان صحراؤں کی بیٹی ہوں۔ میں نے پہلے بھی صحرا کے اندر ریت کے ٹیلے ٹوٹنے کی ہولناک آوازیں سن رکھی ہیں لیکن کسی نے مجھے ریت کے طوفان کے سامنے اس قدر اہتمام کرنے کے گُر نہ سکھائے تھے۔"

احمد نے اسی طرح دونوں گھوڑوں کی پیشانیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" ارتمیس! ارتمیس! میرا قبیلہ جو خانہ بدوش تھا وہ ہر وقت صحرا میں عازم سفر رہتا تھا اکثر ہم یمن سے ایلم کی طرف بحیرہ قلزم کے کنارے کنارے صحرا میں سفر کرتے تھے ایسے طوفانوں اور ان کی پیش بندی سے اکثر ہمیں پالا پڑتا تھا۔"

ارتمیس خاموش رہی۔ احمد کے ہاتھ پھیرنے پر گھوڑے اب پُرسکون ہو گئے تھے۔ لہٰذا اس نے دونوں گھوڑوں کی باگیں جو آپس میں بندھی ہوئی تھیں پکڑتے ہوئے کہا۔ ارتمیس! ارتمیس! تم اب اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ میں دونوں گھوڑوں کی باگیں پکڑ کر چلتا ہوں۔ حسین ارتمیس نے پیار سے کہا۔" اگر آپ پیدل چلیں گے تو میں کیوں سوار ہوں میں بھی آپ کے ساتھ پیدل چلوں گی۔"

احمد نے گھوڑے کی باگیں چھوڑیں اور ارتمیس کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اس کے گھوڑے کی زین پر بٹھاتے ہوئے کہا۔" تم تھک جاؤ گی ارتمیس! میں ایسے صحراؤں کا عادی ہوں"۔ ارتمیس احمد کی بات جانتے ہوئے خاموشی سے اپنے گھوڑے پر بیٹھ گئی اور احمد دونوں گھوڑوں کی باگیں پکڑ کر آگے آگے چلنے لگا تھا۔

احمد ارتمیس کے ساتھ دونوں گھوڑوں کو لیے آگے بڑھتا رہا۔ دن ختم ہو گیا حتیٰ کہ چاروں طرف گہری تاریکی پھیل گئی پر طوفان کے رکنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ لگتا تھا آسمان کے دریچے [illegible] بادل اور مہیب طوفان زنجیریں توڑ کر شیروں کی طرح دھاڑتے ہوئے زمین پر [illegible] ہوں۔

طوفان میں احمد راستہ بھٹک چکا تھا اور اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس لامتناہی صحرا اور طوفان میں اس کا رُخ کس طرف ہے۔ بہر حال وہ لگاتار سفر کرتا رہا حتیٰ کہ رات کے پچھلے حصے میں طوفان تھم گیا اور آسمان پر مسکراتے ہوئے ستارے دکھائی دینے لگے تھے۔

احمد نے اپنے اوپر لی ہوئی چادر اتار کر ارتمیس کو تھما دی۔ پہلے اس نے دونوں گھوڑوں کی بندھی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کپڑے سے تھوڑی دیر تک وہ دونوں گھوڑوں کی آنکھیں سہلاتا رہا۔ پھر اس نے اپنے بائیں ہاتھ اپنے کندھے کی سیدھ میں آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" ارتمیس! ارتمیس! گو ہمارا رُخ تبدیل ہو چکا ہے پھر بھی صحرا میں ہم زیادہ نہیں بھٹکنے پائے۔"

ارتمیس نے پیار سے پوچھا۔" آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا۔"

احمد نے ارتمیس کے قریب آ کر شمال کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا

”ارتمیس! ارتمیس! وہ چھوٹا سا جو روشن ستارہ ہے۔ یہ قطب تارہ ہے اور ہمیشہ ساکن رہتا ہے۔ اس کے قریب جو چند ستارے مِلا کر ریچھ کی سی صورتیں بنتی ہیں، دُبِ اکبر اور دُبِ اصغر ہیں۔ اگر ہم اپنا بایاں کندھا قطب تارے کے متوازی رکھ کر آگے بڑھتے رہتے تو ہمارے بھٹکنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا لیکن ہم ذرا بائیں طرف جھک کر سفر کرتے رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے ہم اب سمندر سے قریب ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ہم فرعون کے تباہ حال شہر منعف کی بجائے اسکندریہ شہر کے رُخ پر سفر کرتے رہے ہیں۔“

ارتمیس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔” آپ تو ستاروں کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔“ احمد نے اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔” ایک مجاہد اور خانہ بدوش کے لیے ستاروں کا علم نہایت اہم اور ضروری ہے۔ ان ستاروں ہی کی مدد سے میں تمہیں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ رات کتنی جا چکی ہے اور سحر ہونے میں کتنی دیر ہے۔“

ارتمیس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔” اچھا بتائیے رات کتنی گذر چکی ہے اور صبح ہونے میں کیا وقت لگے گا؟“

احمد آسمان کے وسط میں اُوپر دیکھتا رہا پھر کوئی اندازہ لگانے کے بعد اس نے کہا” چھ حصّوں میں سے پانچ حصّے رات گذر چکی ہے اور سحر ہونے میں اب صرف ایک حصّہ باقی رہ گیا ہے۔“

ارتمیس نے خوشی اور اطمینان کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔” یہ اندازہ آپ نے کیسے لگایا۔ مجھے بھی بتائیں۔“

احمد نے آسمان کے وسط میں تین ستاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔” یہ تینوں ستارے آسمان کے وسط میں سُورج کی طرح سفر کرتے ہیں۔ جس طرح ہم سُورج دیکھ کر وقت کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ ایسے ہی ان ستاروں کی مدد سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رات کس قدر باقی ہے۔“

ارتمیس نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔” میں بھی ان ستاروں کی

پہچان اور ان کا مطالعہ آپ سے سیکھوں گی۔“ احمد نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر ہانک دیا تھا۔ اس کے پیچھے ارتمیس بھی اپنے گھوڑے کو مہمیز لگا چکی تھی۔ دونوں صحرا کے اندر مشرق کی طرف اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑانے لگے تھے۔

رات کی تاریکی میں دونوں اپنے گھوڑوں کو مشرق کی طرف دوڑاتے رہے صحرا کے اندر ہی اُنہیں صبح ہو گئی لیکن سامنے کسی بستی یا آبادی کا کوئی نشان تک نہ تھا۔ چاروں طرف ریت کے ٹیلے تانک جھانک کر رہے تھے۔ جب روشنی خوب پھیل گئی اور صحرا کی ہر چیز صاف اور واضح دکھائی دینے لگی تو ارتمیس نے فکر مندی سے کہا۔” کہیں ایسا تو نہیں ہم کسی اور سمت بھٹک گئے ہوں اور مشرق کے بجائے جنوب کی طرف صحرا کے وسطی حصّے کی طرف جا رہے ہوں۔“

احمد نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا” نہیں ارتمیس! ایسا نہیں ہو سکتا۔ رات کے وقت جب طوفان تھما تھا اور ستارے نمودار ہوئے تھے میں نے اپنا رُخ ٹھیک کر لیا تھا۔ ہم یقیناً مشرق کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ راستے میں کوئی بستی آئے نہ آئے اگر ہم اسی طرح آگے بڑھتے رہے تو ہم دریائے نیل کے کنارے جا پہنچیں گے اور وہاں سے اپنی منزل کا رُخ کرنا ہمارے لیے سہل ہو جائے گا۔“

دونوں اسی طرح اپنے گھوڑوں کو اندر صحرا کے اندر سرپٹ دوڑاتے رہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کے وقت اُنہیں اپنے سامنے صحرا کے اندر ایک بستی دکھائی دی۔ وہ جب ذرا اور آگے بڑھے تو اُنہیں ایک بوڑھا آدمی بستی سے باہر دکھائی دیا۔ احمد اپنے گھوڑے کو اس سے قریب لے گیا اور اس سے پُوچھا۔

” میرے بزرگ! ہم دونوں میاں بیوی مسافر ہیں۔ قرطاجنہ سے آرہے ہیں۔ راستے میں صحرا کے اندر طوفان اُٹھنے کی وجہ سے ہم بھٹک گئے تھے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ہم کہاں ہیں اور یہاں سے نزدیک کون سا بڑا شہر ہے“۔

اس بوڑھے نے خوش طبعی سے کہا۔” تم دونوں اس وقت اسکندریہ شہر سے نزدیک ہو۔ اگر تم اسکندریہ ہی جانا چاہتے ہو تو اس بستی کے دوسری طرف چلے جاؤ وہاں

ایک چوراہا ہے جہاں آ کر چند شاہراہیں ملتی ہیں۔ صحرا میں مغرب کی طرف یہ بستی ایک لحاظ سے آخری آبادی ہے۔ اس چوک سے ایک سڑک تم دیکھو گے وہ دائیں ہاتھ کو جا رہی ہو گی۔ یہ سڑک جنوب کی طرف اس سمت جاتی ہے جہاں سفید نیل اور نیلا نیل حبشہ کی پہاڑیوں سے نکل کر دونوں آپس میں ملتے ہیں اور ایک سڑک سیدھی مشرق کی طرف جا رہی ہو گی۔ وہ اسکندریہ کی طرف جاتی ہے۔ اگر تم اچھی رفتار سے سفر کرتے رہو تو شام تک اسکندریہ پہنچ سکتے ہو۔"

احمد نے اس بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور ارتمیس کو لے کر وہ آگے بڑھ گیا تھا بستی کے دوسری جانب جا کر انہوں نے دیکھا وہاں واقعی ایک سڑک جنوب اور ایک مشرق کی طرف جا رہی تھی۔ احمد نے ارتمیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارتمیس! میرا مشورہ ہے پہلے اسکندریہ شہر جائیں۔ وہ یہاں سے نزدیک ہے۔ وہاں ایک دو روز قیام کر کے آرام کریں گے پھر وہاں سے اپنے گھر جانا ہمارے لیے آسان ہو گا۔"

ارتمیس نے اپنے سر پر بندھے ہوئے رومال کی گانٹھ اور سخت کرتے ہوئے کہا "مجھے آپ سے اتفاق ہے۔" دونوں ایک بار پھر اپنے گھوڑوں کو اس شاہراہ پر سرپٹ دوڑانے لگے تھے جو مشرق کی طرف اسکندریہ شہر کی جانب جاتی تھی۔



شام کے وقت جب کہ بستیوں سے اٹھنے والے دھوئیں کی وجہ سے فضائیں گرد آلود سی ہو گئی تھیں احمد اور ارتمیس اسکندریہ شہر میں داخل ہوئے تھے۔ ایک چوک سے گزرتے ہوئے احمد نے ارتمیس سے کہا۔ "ارتمیس! طوفان نے پہلے ہی ہم دونوں میاں بیوی کی حالت خراب کر رکھی ہے۔ میرا ارادہ ہے یہاں کسی سرائے میں دو دن قیام کرتے ہیں پھر شمال مشرق کی طرف اپنے گھر کو روانہ ہوں گے۔"

ارتمیس نے فوراً تائید کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا کہنا ٹھیک ہے۔ چلیں ہم کسی سرائے میں چلتے ہیں۔" اس چوک سے احمد دائیں ہاتھ شہر کے بڑے بازار کی طرف مڑ گیا تھا۔ ارتمیس اپنے گھوڑے کو اس کے پہلو بہ پہلو ہانک رہی تھی۔

جب وہ دونوں میاں بیوی ایک سرائے میں داخل ہونے لگے تو کسی نے زور زور سے پکارتے ہوئے کہا۔ "احمد! احمد! رک جاؤ بیٹے!"

احمد چونک کر رکا اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ ارتمیس بھی اپنے گھوڑے کو روک چکی تھی۔ احمد پریشان تھا۔ اسکندریہ میں کوئی اس کا جاننے والا نہ تھا۔ اس کے باوجود پکارنے والے کی آواز اس کے لیے خوب شناسا اور جانی پہچانی تھی۔

وہ ابھی اپنے گھوڑے پر پریشانی کی حالت میں ہی بیٹھا ہوا تھا کہ ایک طرف سے بوڑھا قدیما تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں سامان سے بھرے چمڑے کے تھیلے اٹھا رکھے تھے اور احمد کو دیکھ کر وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔

احمد فوراً گھوڑے سے کود گیا اور آگے بڑھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے ارتمیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میری بیوی ارتمیس ہے۔ میں تو تمہیں قرطاجنہ میں چھوڑ کر آیا تھا تم یہاں اسکندریہ میں کس سلسلے میں آ گئے۔"

قدیما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کریٹ سے لوٹنے کے چند ہی روز بعد میں امین کی تلاش میں یہاں آ گیا تھا۔" احمد نے پریشانی میں پوچھا۔ "لیکن امین کا یہاں کیا کام۔" قدیما نے بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں، شاید امین نے تمہیں کبھی بتایا ہو کہ اس کا ایک ماموں یہاں اسکندریہ میں رہتا ہے۔"

احمد نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "امین نے مجھے بتایا تھا لیکن اس کے متعلق تو مجھے کبھی خیال ہی نہ گزرا تھا۔"

قدیما نے کہا۔ "تو پھر سنو! امین مجھے مل گئی ہے اور وہ وہیں اپنے ماموں کے ہاں رہ رہی ہے۔ میں تو اب دو ایک روز تک تمہاری تلاش میں نکلنے والا تھا۔ احمد نے خوشی کے اظہار میں ایک بار پھر قدیما کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "کہاں ہے امین!" قدیما نے کہا۔ "میں بتا تو چکا ہوں وہ اپنے ماموں کے ہاں ہے۔"

ارتمیس نے بھی اپنے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا۔ "ہمیں امین کے پاس لے چلیے۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنے گھر جا رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے آپ یہیں

یہاں مل گئے ہیں۔ اب ہم ایمن کو بھی اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ ایمن یہاں سے احمد کی بیوی اور میری بہن کی حیثیت میں روانہ ہوگی۔"

قدیما نے دُکھ اور تاسف میں کہا۔ "احمد! احمد! کوئی جذباتی اور سطحی فیصلہ کرنے سے قبل یہ سوچ لینا کہ ایمن اندھی ہے اور اس قابل نہیں کہ اپنے شوہر کی خدمت اور دیکھ بھال کر سکے بلکہ وہ خود اس حالت میں ہے کہ کوئی اس کی کفالت اور نگرانی کرے۔"

احمد کے بولنے سے قبل ہی ارتمیس نے کہا۔ "وہ اگر اندھی ہے تو کیا ہُوا میں اس کی خدمت اور نگرانی کروں گی۔ میں اسے یہ احساس نہ ہونے دوں گی کہ وہ اندھی ہے اور دوسروں پر بوجھ ہے۔"

ارتمیس کے خاموش ہونے پر احمد نے کہا۔ "قدیما! قدیما! ایمن کے ساتھ بچپن ہی سے میرا ایک رشتہ ہے۔ جب مجھے خبر نہ تھی اور وہ چوری چوری ضرورت کی ہر شے میرے کمرے میں رکھنے کے علاوہ ہر طرح سے میری خبر گیری رکھا کرتی تھی اِس کے لیے میں کوئی سطحی اور جذباتی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ سنو! قدیما! ایمن میری روح ہے جسے جسم پر فوقیت ہے۔ تم ہمیں اس کے پاس لے چلو۔" قدیما نے مطمئن انداز میں کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔" احمد اور ارتمیس دونوں اپنے گھوڑوں کی باگیں پکڑے اس کے ساتھ ہو لیے تھے۔

چند کوچوں اور گلیوں میں سے گزرنے کے بعد قدیما ایک مکان کے سامنے رُک گیا اور دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھے نے دروازہ کھولا۔ قدیما نے اس بوڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایمن کے ماموں قطام ہیں۔"

احمد آگے بڑھا اور مصافحہ کے لیے اپنے ہاتھ اس نے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں احمد بن حشم ہوں اور میرے ساتھ میری بیوی ارتمیس ہے۔ شاید ایمن کے حوالے سے آپ نے میرا نام سُن رکھا ہو۔"

بوڑھے قطام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور مصافحہ کے لیے بڑھے ہوئے احمد کے ہاتھ اس نے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ صرف مصافحہ پر اکتفا کیوں

کر سکتا ہوں بیٹے! تم ہمارے وہ عزیز ہو جس کا ہمیں شدت سے انتظار تھا۔" قطام آگے بڑھا اور احمد کو اس نے گلے لگا لیا تھا۔ اتنے میں گھر کے دروازے کے پیچھے کچھ سرگوشیاں سنائی دیں۔ قطام نے احمد سے علیحدہ ہو کر پیار اور شفقت سے ارتمیس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دروازے کی طرف مُنہ کر کے کہا۔

"باہر آجاؤ میری بچیو! ہچکچا کیوں رہی ہو۔ یہ تمہارے بھائی احمد بن حشم آئے ہیں اور ان کے ساتھ ان کی بیوی اور تمہاری بہن ارتمیس ہی ہے۔ باہر آؤ میری بچیو! اپنے بھائی سے ملو اور اپنی بہن کو اپنے ساتھ گھر کے اندر لے چلو۔"

تین جوان لڑکیاں ہچکچاتی اور لجاتی ہوئی باہر نکلیں۔ پہلے انھوں نے احمد کو سلام کیا پھر وہ باری باری ارتمیس سے بغلگیر ہوئیں اور اسے اپنے ساتھ اندر لے گئیں۔ قدیما نے پیچھے سے فوراً لڑکیوں کو پکارتے ہوئے کہا۔ "میری بچیو! تم سب دیوان خانے میں بیٹھو، ایمن کے کمرے میں نہ جانا۔ وہاں میں احمد کو لے کر جاؤں گا اور سنو یہ سامان بھی لے جاؤ۔" ایک لڑکی بھاگتی ہوئی واپس آئی اور قدیما نے سامان سے بھرے چمڑے کے جو تھیلے اُٹھا رکھے تھے انہیں لے کر وہ دوبارہ اندر چلی گئی تھی۔

قطام نے قدیما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "قدیما! قدیما! تم احمد کو ایمن کے پاس لے جاؤ۔ میں دونوں گھوڑوں کو اندر باندھتا ہوں۔" قدیما نے گہری خوشی میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "صرف گھوڑے ہی اندر نہیں باندھنے۔ بازار جا کر کچھ لے بھی آئیں۔ آج اور ابھی احمد اور ایمن کا نکاح ہوگا۔"

قطام نے کھُل کر ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ نکاح میں خود پڑھاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی بازار جاتا ہوں۔ آج شام پورے محلے کا کھانا میرے ہاں ہوگا۔ میرے رب نے مجھے آج ایسی خوشی دی ہے جس کی مجھے اُمید تک نہ تھی۔ خدا کی قسم احمد اور ارتمیس کا اس گھر میں آنا میرے لیے باعثِ فخر اور بے پایاں خوشی اور سکوں کی علامت ہے۔"

قطام دونوں گھوڑوں کی باگیں پکڑ کر اندر لے گیا تھا۔ قدیما نے احمد کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "آؤ بیٹے میرے ساتھ۔ میں ایمن کو ارتمیس سے تمہاری شادی اور

کریٹ کی مہم سے متعلق تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ وہ سُن کر بہت خوش ہوئی تھی۔ بخدا اسے تمہاری ذات پر فخر ہے اور اب جب اسے یہ خبر ہوگی کہ تم اس سے شادی کرنے اور اسے لینے آئے ہو تو اندھی ہونے کے باوجود وہ اپنی قسمت پر نازاں اور اپنے مقدر پر خوش ہوگی۔

احمد کا ہاتھ پکڑے قدیا گھر میں داخل ہُوا اور ایک کمرے کے سامنے رکتے ہوئے اس نے سرگوشی میں کہا ”ٹھہرو! اس کمرے میں امین ہے۔ ذرا دیکھنا تمہاری ذات سے اسے کیسی وابستگی ہے۔ وہ فارغ نہیں بیٹھتی۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ایسا کام کرتی رہتی ہے جسے وہ آسانی سے کر سکے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے تمہارے اور ارتمیس کے لیے کئی اُونی کپڑے بنا رکھے ہیں“۔

قدیا نے جب اس کمرے کا دروازہ کھولا تو احمد نے دیکھا حسین اور دلکش امین ایک پلنگ کے قریب بیٹھی گہرے قرمزی رنگ میں ایک اُونی شال بُن رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے چونکتے ہوئے پوچھا ”کون ہے؟“ قدیا نے اپنی خوشی کو دباتے ہوئے کہا ”بیٹی! میں تمہارا عم قدیا ہوں اور تمہارے لیے ایک خوش خبری لے کر آیا ہوں“۔

جواب میں امین نے اداس اور غمگین آواز میں کہا ”اے عم! تم یہ تو کہو گے نہیں کہ احمد آئے ہیں اور پھر اس کے علاوہ میرے لیے اور کیا خوش خبری ہو سکتی ہے۔“

قدیا نے اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے کہا ”اگر اس بار میں یہ کہہ دوں کہ احمد اور ارتمیس دونوں اس گھر میں آچکے ہیں تو تمہارے کیا تاثرات ہوں گے“۔

امین نے پھیکے پن میں کہا ”میری ایسی خوش نصیبی کہاں کہ احمد اور ارتمیس میری خاطر اس گھر میں آئیں“۔ قدیا نے فیصلہ کن انداز میں کہا ”خُدا کی قسم! وہ دونوں اس گھر میں داخل ہوچکے ہیں۔ احمد تمہیں لینے آیا ہے اور آج ہی احمد سے تمہارا نکاح ہوگا تمہارا ماموں قطام کہہ رہا تھا کہ یہ نکاح میں پڑھاؤں گا اور وہ احمد اور ارتمیس کے گھوڑے باندھ کر تمہارے نکاح کی خریداری کے سلسلے میں بازار بھی جاچکا ہے“۔

امین چونک پڑی پلنگ کا سہارا لے کر اُٹھتے ہوئے اس نے کہا ”اے عم! تو نے قسم اُٹھا دی ہے کہ احمد اور ارتمیس اس گھر میں داخل ہوچکے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو وہ دونوں مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے“۔

اس بار قدیا کے بجائے احمد نے کہا ”امین! امین! میں سب سے پہلے تمہیں ہی ملنے آیا ہوں“۔

قدیا نے کھُل کر ہنستے ہوئے کہا ”امین! میری بیٹی! کیا یہ آواز تیری سماعت کے لیے شناسا نہیں ہے“۔

امین کے سُرخ گلاب ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور اس نے اپنی گردن جھکاتے ہوئے رسیلی آواز میں کہا ”اے عم! یہ آواز میری سماعت ہی نہیں میری رُوح کی بھی شناسا ہے۔ قدیا نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ”اچھا میں جاتا ہوں۔ تم دونوں ملو اور اکٹھے بیٹھ کر اپنے ماضی اور مستقبل کی باتیں کرو“۔

احمد اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے وہ امین کی طرف بڑھا۔ امین اپنی طرف بڑھتے اس کے قدموں کی چاپ سُن رہی تھی اور اس کا نازک لیکن پکے ہوئے لسوڑھے کی طرح جوانی میں بھرپور جسم لرز کانپ رہا تھا۔ احمد نے دیکھا امین پہلے کی طرح ہی غنچہِ شاداب کی طرح پُرکشش، لالہ شیراب کی طرح دلکش اور پھولوں کی طراوتِ شبنم کی طرح جاذبِ نظر تھی۔ نزاکت میں پھولوں کی پنکھڑیوں جیسی امین حیا میں کسی کلی کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔

احمد اسے دیکھ کر خوش اور مطمئن تھا جیسے پیاسے مسافر کو کسی نے نہر لبن کے کنارے لا کھڑا کیا ہو۔ امین اسی طرح چپ اور خاموش کھڑی تھی۔

قریب جا کر احمد نے امین کو اس کے دونوں شانوں سے پکڑ کر پیار سے پکارتے ہوئے کہا ”امین! امین! مجھے تمہاری ماں کی موت اور تمہاری آنکھوں کے کھو جانے کا سخت صدمہ ہے۔ کاش میں بروقت پہنچ کر تمہاری مدد کر سکتا۔“

کسی لچکیلی شاخ کی طرح امین نے اپنا سر احمد کے شانے پر رکھ دیا اور وہ بیچاری پھوٹ پھوٹ کر ہچکیوں اور سسکیوں میں رونے لگی تھی۔

احمد نے ایمن کو تسلی دے کر چُپ کرایا اور اسے اپنے ساتھ پلنگ پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "ایمن ! ایمن! مَیں اس بوڑھے یہودی کا مشکور ہوں جو تمہیں کریٹ سے نکال کر لایا تھا۔ وہ کہاں ہے۔ کاش مَیں اس کی خدمت کر سکتا۔"

ایمن نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "وہ بوڑھا بہت مہربان تھا۔ اس کی وجہ سے ہی طبرق کے ہاتھوں میں بے آبرو ہونے سے بچ گئی۔ میرے کہنے پر وہ مجھے یہاں چھوڑ کر واپس جا چکا ہے۔ میرے ماموں قطام نے اسے اس قدر نقدی دے دی ہے کہ اگر وہ ساری عمر اپنی بیوی کے ساتھ گھر بیٹھ کر کھاتا رہے تو بھی وہ اس سے نہ ختم ہو۔ قدیا مجھے پوری کہانی سنا چکا ہے۔ مَیں آپ کی بے حد مشکور ہوں کہ آپ میری خاطر کریٹ کی دور دراز کی سرزمین میں گئے اور طبرق کے سارے ساتھیوں کو قتل کر کے اسے بھی آنکھوں سے محروم کر دیا۔ اب وہ ظالم کہاں ہے ؟"

احمد نے ایمن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔ "مَیں اس بھیڑیے کو ارتمیس کے باپ اور بھائی کے پاس چھوڑ کر لشکر میں واپس گیا تھا کہ میری غیر موجودگی میں وہ بیمار پڑ کر مر گیا ورنہ مَیں اُسے اپنے ساتھ لاتا اور تمہیں موقع فراہم کرتا کہ تم خود اس سے اپنا انتقام لے لو۔ پر افسوس وہ خود ہی مر گیا۔"

ایمن سر جھکائے گہری سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ احمد نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کہاں کھو گئی ہو ؟"

دکھتے لہجے میں ایمن نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے میں آپ کی زندگی میں روشنی نہ بکھیر سکوں گی۔ اندھا ہونے سے قبل آپ کے ساتھ پُرسکون زندگی گزارنے کا خیال اکثر میرے لیے اطمینان اور خوشی کا باعث ہوا کرتا تھا لیکن اب جب کہ مَیں اندھی ہوں آپ سے میری شادی ایسے ہی ہو گی جیسے کسی نے میرے سر پہ تاج اور پاؤں میں بیڑیاں پہنا دی ہوں۔ مَیں کیسے آپ کی دیکھ بھال کر سکوں گی۔ مَیں کیونکر زندگی کے اس سفر میں آپ کی ہمرکاب ہونے کا دعویٰ کر سکوں گی۔ کاش میری آنکھیں ٹھیک ہوتیں۔ مَیں دیکھ سکتی اور آپ کی خدمت کر سکتی۔ آخر مَیں نے طبرق کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے مجھے اتنی بڑی سزا دی

میرا خوب صورت ہونا کیا میرے جرائم میں شامل ہے۔"

غم اور مایوسی میں ایمن کی بے نور آنکھیں محرومیوں کے انبار میں ڈوب گئی تھیں اور اس کے چہرے پر زندگی کی محرومیوں کی گہری پرچھائیاں بکھر گئی تھیں۔ وہ کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی لیکن کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

احمد نے پیار سے ایمن کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "ایمن ! ایمن ! تم میری زندگی کا چاند ہو۔" ایمن نے دُکھ سے کہا۔ "اندھا چاند جو کسی کو کچھ نہ دے سکے۔"

احمد نے آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "یوں نہ کہو ایمن ! اصل چاند میں بھی تو داغ ہیں لیکن رات کے وقت کیسا بھلا لگتا ہے۔ ایمن ! ایمن ! پہلے مَیں نے ارتمیس کے باپ زیوس کے کہنے پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ مَیں اپنے ماں باپ اور بھائی کو ارتمیس کے ہاں چھوڑ کر تمہاری تلاش میں نکلوں گا لیکن اب جبکہ تم مجھے مل ہی گئی ہو میری ساری الجھنیں ختم ہو گئی ہیں۔ سنو ! آج ہی میری اور تمہاری شادی ہو گی اور پھر دو روز بعد ہم یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ پہلے اپنے گھر جائیں گے وہاں سے ماں باپ اور بھائی بھاوج کو لے کر ہم قرطاجنہ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں زیوس نے ہمیں مکان کے لیے جگہ اور کاشتکاری کے لیے زمین مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ وہاں مَیں تمہاری خدمت کروں گا بالکل اسی طرح جیسے تم اردیہ شہر میں میری خدمت کیا کرتی تھی جب کہ میں غلام تھا اور جب مَیں اپنے لشکر میں جایا کروں گا تو ارتمیس تمہاری خدمت کیا کرے گی۔ ایمن ! ایمن ! تم تنہا نہیں ہو۔ تم میری زندگی کا ایک ایسا حصّہ ہو جس کے بغیر مَیں نامکمل اور ادھورا ہوں۔ تم فکر نہ کرو ایمن ! ارتمیس بہت اچھی ہے۔ وہ ایک بہن کی طرح تمہاری خدمت کرے گی۔ تمہیں اپنی محرومیوں اور مجبوریوں کا احساس نہ ہونے دے گی۔

ایمن کے چہرے پر اب سکون تھا۔ اس نے کسی قدر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کی باتوں نے مجھے تقویت اور حوصلہ بخشا ہے۔ مَیں خوش ہوں کہ مَیں تنہا نہیں ہوں۔ میرا ایک مضبوط سہارا بھی ہے۔ اب مجھے کسی بات کا غم نہیں ہے۔ احمد ! احمد ! قدیا

نے مجھے بتایا تھا کہ آپ نے طبرق کی بہن کو اُٹھا لیا تھا اور آپ اپنے بھائی خصیب سے اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔"

احمد نے دُکھ سے کہا۔" کاش ایسا ہو سکتا لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ملکہ جرارہ کے بعد رومنوں اور فرانسیسیوں کے ساتھ جنگ کے دوران خصیب شہید ہو گیا تھا لہٰذا طبرق کی بہن ثما کی شادی ارتمیس کے بھائی ہرمس سے کر دی ہے۔

خصیب کے جنگ میں کام آجانے کی خبر سُن کر تھوڑی دیر کے لیے ایمن پر سکتہ طاری رہا پھر اس نے پگھلی پگھلی اور دُکھی سی آواز میں پوچھا۔" کیا آپ کے ماں باپ کو خصیب کے شہید ہونے کی اطلاع ہے ؟"

احمد نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔" اُنہیں تو ابھی تک یہ بھی خبر نہیں کہ میں ہی اُن کا بچپن کا بچھڑا ہوا بدنصیب بیٹا ہوں۔"

ایمن کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اُنہیں گھر میں شور سُنائی دیا۔ ایمن نے احمد کا پکڑا ہُوا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔" شاید سب گھر والے اِدھر ہی آ رہے ہیں۔"

احمد نے ہمدردی سے پوچھا۔" کیا تمہارے ماموں کا کوئی بیٹا نہیں ہے ؟"

ایمن نے کہا۔" ان کے دو بیٹے ہیں۔ دونوں شادی شدہ ہیں اور ان کی بیویاں بھی یہیں ہیں۔ وہ دونوں بازار میں چوب کاری کا کام کرتے ہیں۔ اب وہ بھی کام سے لوٹنے والے ہوں گے۔"

احمد نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ اس نے دیکھا۔" ارتمیس، قطام کی بیٹیاں، اس کی دونوں بہوئیں، خود قطام اور قدیا ادھر ہی آرہے تھے۔ احمد نے واپس ایمن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔" ایمن! ایمن! تمہارا اندازہ درست ہے سب لوگ اِدھر ہی آرہے ہیں۔

ایمن شاید احمد کی بات کا کوئی جواب دیتی لیکن سب لوگ ہنستے مسکراتے کمرے میں داخل ہوئے۔ ارتمیس سیدھی ایمن کے پاس آئی اور اُسے گلے لگاتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔" ایمن! ایمن! میں تمہاری بہن ارتمیس

ہوں۔ تم فکر مند نہ ہونا۔ میں تمہاری دیکھ بھال کروں گی۔ تمہاری خدمت کروں گی اور تمہیں اپنی بے نور آنکھوں کا احساس نہ ہونے دوں گی۔ خدا کی قسم مُجھ سے تم احمد کی زیادہ حقدار ہو۔ سنو! ایمن! سب گھر والے اس کمرے میں جمع ہیں۔ ابھی تمہارا اور احمد کا نکاح ہوگا۔ پھر دو روز بعد ہم یہاں سے اپنے گھر کی طرف کُوچ کر جائیں گے۔"

ایمن نے بھی ارتمیس کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔" ارتمیس! ارتمیس! خُدا کی قسم تمہاری باتوں میں خلوص اور تمہارے رویئے سے چاہت اور محبت کی خوشبو آتی ہے۔ میں تمہاری مشکور ہوں۔ تم مجھے اس قدر اہمیت دے رہی ہو۔"

ارتمیس جب ایمن سے علیحدہ ہوئی تو قطام کی بیٹیوں نے کمرے میں صاف دھلی ہوئی چادریں بچھا دی تھیں۔ اتنی دیر تک قطام کے دونوں بیٹے بھی آگئے تھے۔ سب لوگ کمرے میں بچھی ان چادروں پر بیٹھ گئے تھے اور قطام نے احمد سے ایمن کا نکاح پڑھا دیا تھا۔

احمد نے دو یوم ایمن کے ساتھ وہاں گزارے تیسرے روز وہ ایمن اور ارتمیس کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔





ایک روز جب کہ شام ہونے والی تھی ۔ احمد اپنی بستی میں داخل ہو رہا تھا ۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار آگے آگے تھا اور اس سے پیچھے ایمن اور ارتمیس دونوں ایک ہی گھوڑے پر سوار تھیں ۔ ارتمیس نے ایمن کو اپنے آگے بٹھا کر سہارا دے رکھا تھا ۔ اپنے گھر کے سامنے آکر احمد گھوڑے سے اترا اور دروازے پر دستک دی ۔

ارتمیس بھی نیچے اتر گئی تھی ۔ ایمن کو بھی اس نے اُتار لیا تھا اور ایک ہاتھ میں وہ اپنے گھوڑے کی باگ اور دوسرے ہاتھ میں ایمن کا بازو پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی ۔

تھوڑی دیر بعد مکان کا دروازہ کھلا ۔ دروازہ کھولنے والا احمد کا چھوٹا بھائی شیبان تھا ۔ دروازہ کھولتے ہی شیبان نے احمد سے مصافحہ کیا پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا ۔" اے امیر! کیا آپ اپنے ساتھ میرے بھائی کو نہیں لائے ۔ آہ اخی احمد کے انتظار میں تو ہماری آنکھیں نمدار اور ہونٹ خشک رہتے ہیں ۔"

احمد نے مدھم سی آواز میں کہا ۔" میں تمہیں تمہارے بھائی احمد کے متعلق ہی کچھ

کہنے آیا ہوں ۔" پھر احمد نے ایمن اور ارتمیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔" یہ دونوں میری بیویاں ہیں کیا تم دیوان خانے کا دروازہ نہ کھولو گے کہ یہ دونوں اندر جا کر آرام سے بیٹھ سکیں ۔"

شیبان نے بھاگ کر دیوان خانے کا دروازہ کھولا اور دوبارہ احمد کے پاس آکر اس نے کہا ۔" آپ تینوں دیوان خانے میں بیٹھیں ۔ میں آپ کے گھوڑے باندھنے کے علاوہ گھر والوں کو بھی آپ کے آنے کی اطلاع کرتا ہوں ۔" احمد، ایمن اور ارتمیس کو لے کر دیوان خانے میں داخل ہو گیا تھا ۔ شیبان ان دونوں گھوڑوں کو پکڑ کر گھر کے اندر لے گیا ۔

احمد، ایمن اور ارتمیس کو دیوان خانے میں بیٹھے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ احمد کا باپ حشم بن بکر، ماں امیصا، بھائی شیبان اور اس کی بیوی اور احمد کے بچپن کی منسوبہ طروب دیوان خانے میں داخل ہوئے ۔

امیصا اور طروب ایمن اور ارتمیس کے پاس بیٹھ گئی تھیں جب کہ حشم اور شیبان احمد کے بائیں طرف ایک دوسری نشست پر بیٹھ گئے تھے ۔ حشم نے غصیلی اور تیز نگاہوں سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔" گو تم نے ہم سے ہمدردی جتاتے ہوئے اپنا نام سمرون سے احمد بدل لیا تھا لیکن اس موقع پر میں تمہیں سمرون ہی مخاطب کر کے یہ پوچھوں گا کہ آخر تم میرے بیٹے احمد کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے ۔ تم یہ کیوں نہیں بتاتے وہ کہاں ہے ۔ اور کس نگر میں کس شہر میں رہتا ہے ۔ کاش تو ہمیں اس کا مستقل پتہ بتاتا تو میں بینائی کمزور ہو جانے کے باوجود خود اسے جا کر لے آتا ۔ وہ مجھ سے ناراض اور خفا نہیں ہو سکتا وہ میرا بڑا پُر خلوص اور جاں نثار بیٹا ہے ۔ آہ حالات نے اسے کہاں سے کہاں دھکے کھانے پر مجبور کر دیا ۔"

حشم نے ایک بار غور سے احمد کی طرف دیکھا پھر اور زیادہ غضبناک ہو کر اس نے کہا ۔" اب تم ہمیں احمد کے متعلق کیا کہنے آئے ہو ۔ کیا یہ بتانے آئے ہو کہ وہ پھر صحراؤں کے اندر کہیں کھو گیا ہے ۔ اگر تم سچے اور مخلص ہوتے تو میرے بیٹے احمد کو ساتھ لے کر آتے جبکہ تم جانتے تھے اس کے بغیر ہماری زندگی کیسی اجیرن اور تکلیف دہ ہو کر بسر ہو رہی ہے ۔"

احمد جب خاموش رہا اور کوئی جواب نہ دیا تو حشم نے اس کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا "کیا تم یہ تو بتانے نہیں آئے ہو کہ میرا چھوٹا بیٹا خصیب جنگ میں مارا جا چکا ہے۔ اگر ایسا ہے تو تمہیں مایوسی ہوگی اس لیے کہ تمہارے لشکر سے اس بستی میں لوٹنے والے چند جوان یہ خبر مجھے پہلے ہی سنا چکے ہیں۔ کیسی بدنصیبی ہے کہ میں اکثر جبل موسیٰ پر کیتھرین کی خانقاہ میں جاتا رہا کیونکہ وہیں میرا بیٹا مجھ سے بچھڑا تھا لیکن ہائے حیف مجھے اس کا کوئی نشان نہ ملا۔ میرا بیٹا خصیب ہر وقت تم سے اپنے بڑے بھائی کے متعلق پوچھتا رہا لیکن تم اسے ٹالتے رہے۔ یہ کیسی ستم ظریفی، کیسی سیاہ بختی ہے کہ وہ اپنے بھائی سے ملے بغیر اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر گیا۔ مجھے اس کی یہ بے بسی کی موت کبھی نہ بھولے گی۔ وہ احمد سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتا تھا۔ وہ ہر وقت آہیں بھرتا رہتا تھا۔ میں نے اور اس کی ماں نے اس کی شادی کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے قسم کھالی تھی کہ جب تک مجھے میرا بچھڑا ہوا بھائی نہیں مل جاتا میں شادی نہیں کروں گا۔ اگر تم ہمیں احمد سے متعلق بتا دیتے تو تمہارا کیا جاتا۔ کیا تم جان بوجھ کر اس گھر کو تباہی اور بربادی کے اندھے کنوئیں میں پھینک دینے کا فیصلہ کر چکے ہو۔"

احمد نے پہلی بار زبان کھولتے ہوئے کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کے بیٹے احمد نے ہمارے ساتھ ملکہ جرارہ کے ساتھ جنگ میں حصّہ لیا تھا۔ خصیب جب جنگ کے دوران زخمی ہوا تھا تو احمد نے ہی اسے سنبھالا تھا۔ شاید یہ بات آپ کے سکون کا باعث ہو کہ خصیب نے احمد کی گود میں ہی دم توڑا تھا اور احمد نے ہی جبل اوراس کے اوپر اس کی قبر بنائی تھی اور لشکر کے امیر حسان بن نعمان بھی اسکے ساتھ تھے۔ آپ فکرمند نہ ہوں میں جھوٹ نہ کہوں گا۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کا بیٹا آپ کے گھر آچکا ہے۔"

ایمن اور ارتمیس جو سارے حالات سے واقف تھیں احمد اور حشم کے درمیان گفتگو پر رونے لگی تھیں۔ ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور آنسو فرش پر گر رہے تھے۔ خصیب کے ذکر پر امیصا اور طروب بھی رو رہی تھیں۔

حشم نے احمد کی گفتگو پر اور زیادہ غضبناک ہوتے ہوئے کہا "تم جھوٹے فریبی

مکار اور دھوکہ باز ہو۔ تم نے ہمیشہ احمد کے معاملے میں ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ اب تم ہمیں یہ تاثر دے کر ایک اور فریب دینا چاہتے ہو کہ احمد نے ملکہ جرارہ کے خلاف جنگ میں حصّہ لیا اور خصیب نے اس کی گود میں جان دی تھی۔ اگر ایسا ہے تو وہ تمہارے ساتھ گھر کیوں نہیں آیا۔

اے فریب کار انسان! اب میں تیرے کسی چکمے میں نہ آؤں گا۔ تو ہمیشہ ہمیں جھوٹی تسلیاں دیتا رہا۔ بخدا اگر اس گھر میں تو مہمان بن کر نہ آیا ہوتا تو میں تمہیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دیتا اس لیے کہ ———

حشم کہتے کہتے رک گیا کیوں کہ بستی میں مغرب کی اذان ہونے لگی تھی۔ ارتمیس اور ایمن دونوں سسک سسک کر رو رہی تھیں۔ حشم اٹھ کر باہر آیا اور نماز کے لیے وضو کرنے کی خاطر وہ پانی کا کوزہ بھرنے لگا تھا۔

احمد بھی تڑپ کر باہر آیا اور جب حشم وضو کرنے لگا تو اس نے اس کے ہاتھ سے کوزہ لے لیا۔

شیبان، طروب اور امیصا بھی اٹھ کر باہر آگئے تھے۔ ارتمیس نے بھی اپنے آپ کو سنبھالا اور وہ بھی ایمن کو سہارا دیتی ہوئی باہر آئی۔ ایمن دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی تھی جب کہ ارتمیس امیصا کے قریب گئی وہ اس سے کچھ کہنے والی تھی کہ رک گئی۔ کیونکہ احمد نے جب کوزہ لے کر خود حشم کا وضو کرانا چاہا تو حشم نے غضب ناک ہو کر کہا "چھوڑ دو۔ کوزہ مجھے دے دو۔ تمہارے یہ آدابِ فرزندی بھی مجھے پسند نہیں ہیں۔"

احمد نے رقت آمیز آواز میں کہا "احمد بھی تو بچپن میں یوں ہی آپ کا وضو کرایا کرتا تھا۔ اس کے سامنے تو آپ کبھی نہ بولتے تھے۔"

حشم نے نرم ہو کر پوچھا "تمہیں ان باتوں کا علم کیسے اور کیونکر ہوا۔"

احمد نے اداس لہجے اور بجھی آواز میں کہا "احمد کی زندگی کا کوئی پہلو بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ میں نے آپ سے کوئی دھوکہ اور فریب نہیں کیا۔"

حشم نے اور نرم ہوتے ہوئے کہا "اچھا تم پانی ڈالو میں وضو کرتا ہوں۔ خدا کی

قسم تمہارا کوزہ پکڑنے اور پانی ڈالنے کا انداز ایسا ہی ہے جیسا میرے احمد کا تھا"۔

احمد پانی ڈالنے لگا اور حشم وضو کرنے لگا تھا۔ سر کا مسح کرنے کے بعد حشم جب پاؤں دھونے لگا تو احمد فوراً نیچے بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھوں کی انگلیاں حشم کے پاؤں کی انگلیوں میں پھیرتے ہوئے دھونے لگا۔ بالکل اسی انداز میں جس طرح بچپن میں وہ انگلیاں پھیرا کرتا تھا۔ ایک دم حشم نے کوزہ پکڑ لیا اور چونکتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"کون ہو تم؟ خدا کے لیے بتاؤ تم کون ہو۔ کیا تم اپنے آپ کو مجھ سے چھپا رہے ہو۔ خدا کے لیے مجھے احمد کے متعلق بتاؤ مجھے اور زیادہ عذاب میں نہ ڈالو۔ میں پہلے ہی بکھرا ہوا ہوں"۔

احمد کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے اور اس نے کوزہ زمین پر رکھتے ہوئے کہا "اے میرے باپ! میں ہی احمد ہوں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میں وہی احمد ہوں جس نے آپ، شیبان اور حصیب کے ساتھ جبلِ موسیٰ پر وادی شعیب سے وادیٔ طویٰ کو جاتے پرندے شکار کیے تھے۔

میں وہی احمد ہوں جو بچپن میں اسی طرح آپ کو وضو کرایا کرتا تھا۔ اے میرے باپ میں وہی احمد ہوں جو وادی شعیب سے اغوا ہو گیا تھا۔ آہ میرے باپ! بردہ فروشوں اور مجھے غلام بنانے والوں نے میرا چہرہ ایسا مسخ کیا کہ کوئی مجھے پہچان نہ سکا۔ آہ کیسی بدقسمتی ہے میری کہ میں اپنے ماں باپ سے دُور رہا اور اُن کی کوئی خدمت نہ کر سکا"۔

حشم دیوانوں کی طرح آگے بڑھ کر احمد سے لپٹ گیا تھا اور عجیب سے والہانہ انداز میں وہ احمد کا منہ گال، آنکھیں اور بال چومنے لگا تھا۔ اسی لمحہ امیصا بھاگ کر آگے بڑھی اور وہ بھی احمد کو لپٹا کر چومنے لگی تھی۔ شیبان بھی آگے بڑھا اور اپنی ماں کے ساتھ وہ بھی احمد سے لپٹ گیا تھا۔

ارتمیس اور طروب روتی آنکھوں کے ساتھ مسکرا بھی رہی تھیں جبکہ امین دیوار کے ساتھ لگی ہچکیاں اور سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔

بوڑھا حشم خدا کا شکر ادا کرنے کی خاطر وہیں ننگی زمین پہ سجدے میں گر گیا تھا پھر وہ کھڑا ہوا اور احمد کو دوبارہ اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا "اے میرے شیر دل فرزند! تُو اس گھر میں اجنبیوں کی طرح آیا۔ شیبان کی شادی میں حصّہ لیا اور ایک انجان پردیسی کی طرح یہاں سے کُوچ کر گیا۔ تُو نے اس وقت کیوں نہ بتایا کہ تم ہی احمد ہو"۔

امیصا نے بھی احمد کے جلتے ہوئے گال چومتے ہوئے کہا "میرے بچے! تجھے ہماری بے چارگی اور ہماری تکلیف دہ حالت پر بھی رحم نہ آیا۔ تو اپنے باپ کو غمزدہ حالت میں چھوڑ گیا۔ اپنی ماں کو روتی اور بین کرتی حالت میں چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ تم نے کیوں اپنے آپ کو ہم پر ظاہر نہ کیا۔

احمد نے اپنی ماں سے لپٹے ہی لپٹے کہا۔ اے میری ماں جس وقت میں نے حصیب کو قید سے رہائی دلائی تھی اور مجھے خبر ہوئی کہ وہ میرا بھائی ہے۔ میں نے اسی وقت حصیب کو اپنے متعلق بتا دینا تھا لیکن باتوں باتوں میں حصیب نے مجھے بتایا کہ شیبان اور طروب ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور عنقریب ان کی شادی ہونے والی ہے تو میں اپنے آپ کو چھپا گیا۔ میں اپنے بھائی اور طروب کے درمیان حائل نہ ہونا چاہتا تھا اور پھر اس وقت تک میں ایک لڑکی کو پسند بھی کر چکا تھا"۔

حشم نے احمد کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ جو کچھ ہوا اس پر مٹی ڈال دو۔ چلو اندر بیٹھو میرے بچے! تم طویل سفر کے باعث تھک چکے ہو گے"۔

سب دوبارہ دیوان خانے میں آکر بیٹھ گئے اور امیصا کے کہنے پر احمد انہیں اپنے حالات اور ارتمیس و امین سے شادی کے واقعات سنا رہا تھا۔

احمد جب خاموش ہوا تو حشم نے اٹھ کر امین اور ارتمیس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور امیصا نے آگے بڑھ کر دونوں کی پیشانیاں چوم لی تھیں۔

احمد نے پھر حشم سے کہا "اے میرے باپ! میں ارتمیس کے باپ سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ میں آپ سب کو اپنے ساتھ لے کر آؤں گا۔ کیا آپ لوگ میرے ساتھ قرطاجنہ چلیں گے۔ وہاں ہمیں اپنا ایک علیحدہ گھر بھی میسر ہو گا اور کاشتکاری کے لیے

پانی سے سیراب ہونے والی زمین بھی ملے گی اور یہاں کی نسبت وہاں ہم زیادہ خوشحال زندگی بسر کر سکیں گے۔"

حشم نے پھر احمد کو لپٹاتے ہوئے کہا۔" اے فرزندِ ارجمند! تیرے آنے سے میری توانائی لوٹ آئی ہے۔ اب تو جہاں بھی کہے گا ہم سب تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہیں۔ نماز کا وقت نکل جائے گا آؤ پہلے نماز ادا کر لیں پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

سب جلدی جلدی وضو کرنے لگے تھے۔ حشم کی امامت میں احمد اور شیبان با نماز پڑھنے لگے تھے جب کہ امیصا ایمن، ارتمیس اور طروب دیوان خانے میں ہی مغرب کی نماز ادا کر رہی تھیں۔

سات یوم تک احمد نے ایمن اور ارتمیس کے ساتھ وہاں قیام کیا۔ پھر انہوں نے وہاں سے کوچ کی تیاری کر لی تھی۔

گھر کا سارا اثاثہ دو اونٹوں پر لاد دیا گیا تھا۔ تیسرے اونٹ پر محمل ڈال دیا گیا تھا اور اس پر امیصا، ایمن اور ارتمیس بیٹھ گئی تھیں۔ چوتھے اونٹ پر شیبان اور طروب تھے اور پانچویں اونٹ پر احمد اور حشم دونوں باپ بیٹا سوار ہو گئے تھے۔ گھوڑوں کو اونٹوں کے کجاووں کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ اس طرح پانچ اونٹوں اور چار گھوڑوں پر مشتمل یہ قافلہ اپنی بستی سے کوچ کر گیا تھا۔

بستی سے نکل کر اور فرعون کے شہر منف کے کھنڈرات سے گزرتے ہوئے احمد نے اپنا وہی پرانا گیت گانا شروع کر دیا تھا۔

مَا اَجْمَلُ الضِّیَا
روشنی کیسی خوب صورت ہے
مَا اَحْسَنُ الْحَیَا
حیا کیسی نفیس ہے

احمد کا گیت سنتے ہوئے حشم کے چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔ شیبان اور طروب کھلکھلا کر ہنس رہے تھے اور محمل میں امیصا، ایمن اور ارتمیس کو اپنے ساتھ لپٹائے

اپنے بیٹے پر فخر کر رہی تھی۔ احمد اور حشم کا اونٹ سب سے آگے آگے جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مزروعہ زمین سے نکل کر وہ اس صحرائی راستے پر چڑھ گئے تھے جو برقہ، باغیر اور بلنس شہر سے ہوتا ہوا قرطاجنہ کی طرف جاتا تھا۔



اسلم راہی ایم اے
معرفت ماسٹر عبدالحق (مرحوم)
محلہ غریب پورہ
گجرات





تمت بالخیر

تاریخ تکمیل کتابت ۱۷ / اپریل ۱۹۸۳ء، ۲۲ جمادی الثانی ۱۴۰۳ھ بروز جمعرات